تیسرا آدمی

شوکت صدیقی

شوکت صدیقی کے افسانوں کا یہ پہلا
مجموعہ ہے جو پہلی بار ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا
تھا۔ اب اسے نظرِ ثانی کے بعد نئی ترتیب و
تزئین کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔ اس
مجموعے میں شوکت صدیقی کے وہ افسانے
شامل ہیں جن کا شمار اعلیٰ افسانوی ادب میں
ہوتا ہے۔ ان میں سے بیشتر افسانے دُنیا کی
مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو کر مقبول ہو چکے
ہیں اور کئی افسانوی انتخابات میں بھی شامل ہیں۔
شوکت صدیقی کے فکر و فن کو سمجھنے کے
لیے اِن افسانوں کا مطالعہ ضروری ہے۔

ناشر

خیال سرورق: رفیق احمد
فوٹو: سہیل عاصم

تیسرا آدمی

شوکت صدیقی کے افسانے

تیسرا آدمی

رِکتاب
پوسٹ بکس ۳۴۱۳ کراچی

جُملہ حقوق بحقِ مصنّف محفوظ ہیں

چوتھا ایڈیشن ـــــ فروری ۱۹۸۶ء
تعداد ـــــ ایک ہزار
مطبع ـــــ احباب پرنٹرز، لیاقت آباد
قیمت ـــــ ۴۰ روپے
ناشر ـــــ رِکتابؔ، پوسٹ بکس ۳۴۱۳
کراچی

ترتیب

الاؤ کے پاس	۱۱
مسیتا تانگے والا	۱۳
مہکتی وادیوں میں	۲۵
ایک تھا سوداگر	۳۹
تانتیا	۶۵
یہ بیمار	۹۳

جھیلوں کی سرزمین پر ۱۰۷

غمِ دل اگر نہ ہوتا ۱۳۵

تیسرا آدمی ۱۶۳

اجنبی ۲۰۱

پتھر میں آگ ۲۲۵

جملۂ معترضہ

عام تاثر یہ ہے کہ اب اردو ادب کا چلن نہیں رہا۔ اس کی تائید میں یہ استدلال پیش کیا جاتا ہے کہ ادبی جرائد ایک ایک کر کے اپنی دوکان بڑھاتے جا رہے ہیں اور جو شائع ہو رہے ہیں، وہ پابندی سے نہیں نکلتے۔ حالات ان کے بھی حوصلہ افزا نہیں۔ یہی بات ادبی کتب کے باب میں بھی کہی جاتی ہے۔ علمی اور ادبی کتابیں اول تو بہت کم شائع ہوتی ہیں اور جو شائع ہوتی ہیں، وہ فروخت نہیں ہوتیں۔ حالانکہ دیکھنے میں یہ آ رہا ہے کہ علم و ادب کا چرچا کم ہونے کی بجائے کچھ سوا ہوا ہے۔ آئے دن ادبی تقریبات منعقد ہوتی ہیں۔ اہل ذوق ان میں نہ صرف شریک ہوتے ہیں بلکہ دلچسپی اور سرگرمی سے حصہ لیتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ پچھلے چند برسوں میں لوگوں کی قوت خرید میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ بازاروں کی رونق اس قدر دوبالا ہو گئی ہے کہ ہر طرف چہل پہل اور گہما گہمی نظر آتی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ علمی اور ادبی کتب سے عدم دلچسپی کا یہ رجحان کیوں اور کیسے پیدا ہوا، اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ صورت احوال بہرحال تشویشناک ہے اور اسے زیادہ عرصے برقرار نہیں رہنا چاہیئے۔

رکتاب، ایک نیا اشاعتی ادارہ ہے اور اس عزم کے ساتھ قائم کیا گیا ہے کہ معیاری اور کم قیمت کتابیں شائع کر کے علم و ادب کے فروغ میں اپنی بساط کے مطابق جدوجہد کی جائے۔ ہم نے اپنے سفر کا آغاز اردو کے ممتاز ادیب شوکت صدیقی کی تصنیف "کیمیا گر" سے کیا تھا۔ اس کتاب میں ان کے پانچ طویل افسانے شامل تھے۔ ہمارا یہ اولین تجربہ حوصلہ شکن اور ناخوشگوار ثابت نہ ہوا۔ سال بھر کے اندر، اندر پہلا ایڈیشن فروخت ہو گیا۔ اب اس کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کی منصوبہ بندی کی جا رہی ہے۔ "کیمیا گر" کے سلسلہ میں قارئین اور کتب فروشوں کے جو خطوط موصول ہوئے، اس میں مسلسل یہ اصرار کیا گیا کہ شوکت صدیقی صاحب کی نئی تصانیف کے ساتھ، ساتھ ایسی تصانیف بھی مہیا کی جائیں۔ جو پہلے شائع ہو چکی ہیں اور اب بازار میں ڈھونڈنے سے بھی

نہیں ملتیں، حقیقت بھی یہی ہے کہ شوکت صدیقی صاحب کی پچھلی تصانیف میں سے بجز "خدا کی بستی" کے کوئی بھی دستیاب نہیں، حتیٰ کہ خود مصنف کے پاس کوئی نسخہ موجود نہ تھا، بہرحال کسی نہ کسی طور پر یہ تصانیف حاصل کی گئیں، مصنف کو پہنچائی گئیں اور نظرِ ثانی کے بعد اب پیش کی جا رہی ہیں۔

"تیسرا آدمی"۔ شوکت صدیقی صاحب کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے، جو پہلی بار اگست ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے میں جو افسانے شامل ہیں، وہ مصنف کے بیان کے مطابق، ۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۱ء تک کے عرصے میں لکھے گئے۔ اس ایڈیشن میں افسانوں کی ترتیب تبدیل کر دی گئی ہے۔ ان کو اسی طرح از سرِ نو مرتب کر کے پیش کیا جا رہا ہے جس تسلسل سے وہ لکھے گئے تاکہ افسانہ نگار کے فنّی ارتقا کو سمجھنے میں مدد ملے۔ مگر سات سال کے عرصے میں لکھے جانے والے شوکت صدیقی صاحب کے یہ تمام افسانے نہیں ہیں۔ ان میں سے کچھ افسانے ان کے دوسرے مجموعے "اندھیرا، اور اندھیرا" میں شامل ہیں۔ یہ مجموعہ بھی کتابت کے مراحل میں ہے اور جلد ہی شائع کر کے پیش کیا جائے گا۔ علاوہ ازیں، مصنف کی پچھلی تصانیف کے ساتھ، ساتھ نئی تصانیف، خصوصیت کے ساتھ ناول، بھی زیرِ طبع ہیں۔ ہماری کوشش ہے کہ رکتاب نے حسنِ طباعت کا جو معیار قائم کیا ہے۔ اُسے نہ صرف برقرار رکھا جائے بلکہ خوب سے خوب تر بنایا جائے۔ ہمارے اشاعتی پروگرام میں دوسرے معروف اہلِ قلم کی تصانیف بھی شامل ہیں جن کو قارئین پڑھنا چاہتے ہیں اور جو ان کے علمی اور ادبی ذوق کی تسکین کر سکیں۔

ناشر

الاؤ کے پاس

سب ملاکر کل بائیس آدمی تھے۔

سمور کے دیو قامت درختوں تلے الاؤ دہک رہا تھا۔ کبھی کبھی کوئلے چٹختے تو چنگاریاں دور تک بکھر جاتیں اور ان بھڑکتے ہوئے شعلوں میں بائیس انسانی سائے جھومنے لگتے۔ جھکی ہوئی سیاہ چٹانوں کے درمیان یہ تنگ وادی، شب کے سناٹے میں اس قدر سحر زدہ معلوم ہو رہی تھی جیسے کوئی کاپالک کاسئہ سر لے کر یہاں اپنے بیروں کو جگانے آئے گا۔

ملی جلی انسانی آوازیں وادی میں گونجتی رہیں۔ دھندلی چاندنی پتلی کی شاخوں میں پر جھولتے ہوئے زرد زرد پھولوں پر پھیلتی رہی۔ اندھیرا آہستہ آہستہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اچانک وادی میں گونجتی ہوئی انسانی آوازیں خاموش ہو گئیں، درختوں کے اُلجھے ہوئے سایوں کے نیچے قدموں کی آہٹ اُبھر رہی تھی۔ کوئی پہاڑی کی بلندی سے نیچے اتر رہا تھا۔ اس کے بھاری جوتے پتھروں پر کھڑ کھڑا رہے تھے۔ آٹھ بندوقوں کی نالیں درختوں کی سمت اٹھ گئیں۔ تنے ہوئے بھالوں کی جھلملاہٹ الاؤ کی تیز آنچ میں اور بڑھ گئی۔

راگھو نے چیخ کر پوچھا "کون آ رہا ہے؟"

درختوں کے نیچے سے کسی نے جواب دیا "ساتھی"۔ آواز کچھ مانوس معلوم ہو رہی تھی۔ لیکن بندوقیں اسی طرح تنی رہیں اور بھالوں کی جھلملاہٹ ابھرتی رہی۔ درختوں کے الجھے ہوئے سایوں میں سے گزرتا ہوا بالے آہستہ آہستہ الاؤ کے پاس آکر خاموش کھڑا ہو گیا۔ چھوٹی چھوٹی مڑی ہوئی مونچھیں، سوچتا ہوا معصوم چہرہ اور آنکھوں

میں ہلکی سُرخی، جیسے دہکتی ہوئی آگ نے اور گہرا کر دیا تھا۔

راگھو نے آواز پر ذرا زور دیکر دریافت کیا۔ "اتنی دیر سے تم کہاں تھے؟"

بالے نے کوئی جواب نہ دیا۔

راگھو نے ڈپٹ کر کہا۔ "بولتے کیوں نہیں؟ یہ اگنی تمھارے سامنے ہے۔ سچ سچ بتاؤ کہ تم اب تک کہاں تھے؟"

بالے نے بھیڑ کی نئی اون سے بنے ہوئے کمبل کے اندر سے خون میں لتھڑی ہوئی کٹار نکال کر سامنے کر دی، جو شعلوں کی چمک میں اور بھی لال ہو گئی تھی۔ بائیس چہروں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔ فضا پر پُراسرار خاموشی طاری ہو گئی۔

راگھو نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "یہ کیا؟"

بالے نے خون میں بھرا ہوا ہاتھ سامنے کر دیا۔ "یہ میری ماں کا خون ہے۔"

"تم نے اسے مار ڈالا؟" راگھو اور بھی حیرت زدہ ہو گیا۔ لیکن بالے چپ چاپ کھڑا دیکھتا رہا کہ الاؤ دہک رہا ہے۔ کوئلے چیخ رہے ہیں۔ چنگاریاں دور تک بکھرتی جا رہی ہیں۔ حیرت زدہ چہرے خواب میں چلتی پھرتی پرچھائیوں کی طرح بے جان ہو گئے ہیں اور اس کے وجود میں سما کر کوئی پھیلتا جا رہا ہے۔ اس نے گہری سانس بھر کر گردن جھکا دی۔ "ہاں!" مگر یہ اعتراف کرتے ہی وہ دل گرفتہ ہو گیا۔ اور بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا، اور جب گہری خاموشی دبی دبی سرگوشیوں سے شکست کھا گئی۔ چہروں کا استعجاب زائل ہونے لگا تو وہ چپ چاپ جا کر الاؤ کے قریب بیٹھ گیا اور راکھ لے کر کٹار کو صاف کرنے لگا۔ اسکی آنکھوں میں امڈتے ہوئے آنسو خشک پڑ چکے تھے۔ مگر جیتا جیتا لہو انگلیوں سے چھوتے ہوئے وہ اس طرح کانپ اٹھا جیسے اس کے گرد منڈلاتی ہوئی سرگوشیاں ایک تیز چیخ میں سمٹ کر وادی کی گہرائیوں میں دہاڑنے ہی والی تھی۔ اس کے وجود میں کوئی یوں پھڑ پھڑایا کہ اس نے گھبرا کر کٹار راکھ میں دبا دی۔ اور راگھو کے پاس جا کر کہنے لگا۔

"اب ہمیں چلنا چاہیئے۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ کہیں مجھے دیر نہ ہو گئی ہو۔"

راگھو کہنے لگا۔ "نہیں! ابھی اندھیرا اور بڑھ جانے دو۔"

جب شروع تاریخوں کا چاند سیاہ چٹانوں کی پشت پر گہرے غاروں میں ڈھلک گیا اور پُتلی کے درختوں

کے بسنتی پھولوں کا حسن اُجڑ گیا تو انھوں نے اپنی بندوقیں سنبھالیں۔ برچھے اور بھالے سنبھالے۔ ڈھولکیں اور جھانجیں گردنوں میں لٹکالیں۔ آگے بڑھے اور چٹانوں کی بلندی پر چڑھنے لگے۔ اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ کہر کے دھندلکوں کا نیلگوں جال چٹانوں پر پھیلا ہوا تھا۔ ہمالیہ کی برف پوش چوٹیوں کی سمت سے آنے والی تیز ہوائیں درختوں میں سسکیاں بھر رہی تھیں۔ وہ اوپر چڑھتے گئے۔ ان کے جوتوں کی آوازیں چٹانوں سے ٹکراتی رہیں۔ نیچے وادی میں سناٹا پھیلنے اور بڑھنے لگا۔

سرمئی چٹانوں کے گرد گھومتی ہوئی ناہموار اور پُر پیچ راہوں سے گزرتے ہوئے انھوں نے کوہستانی بلندی کو عبور کیا اور ڈھلان پر اترنے لگے۔ برفانی ہواؤں کی سسکیاں تاریک کھڈوں میں تیرتی رہیں۔ ان کے بھاری بھرکم جوتے پتھروں پر ٹکراتے رہے اور دھندلکوں میں لپٹی ہوئی وہ سڑک سامنے آگئی جو جھکی ہوئی پہاڑیوں کے دامن میں بل کھاتی ہوئی ایک موڑ پر اوجھل ہو گئی تھی۔

سڑک پر پہنچ کر انھوں نے مشعلیں روشن کر لیں۔ جھانجیں جھنجھنا اٹھیں اور ڈھولک ٹھنکنے لگے۔ دور اُدھر اسٹیشن پر دھیمی دھیمی روشنیاں آنکھیں جھپکا رہی تھیں۔ شنٹنگ کرتا ہوا ایک انجن، کھڑکھڑاتا ہوا آہنی پٹریوں پر گزر رہا تھا۔ سڑک کے نکڑ پر شیشم کے درختوں تلے بھٹی پر ابھی تک چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ وہ اسی طرف چل دیئے۔ بوڑھا کلوار سونے کے لئے جا رہا تھا۔ اس نے خوابیدہ نگاہوں سے ان کو دیکھا۔ اور کچھ بوکھلا سا گیا۔ جلدی سے اس نے دیسی شراب کا پیپا نکالا اور ان کے سامنے رکھ دیا۔ سب نے مہوے کی تیز شراب غٹا غٹ چڑھانا شروع کر دی۔ برفانی ہواؤں سے کپکپاتے ہوئے یخ بستہ جسموں میں ایک نئی حرارت، ایک نئی ترنگ اور ایک نئی توانائی عود کر آئی۔

لیکن وہ بھٹی پر زیادہ دیر نہ ٹھہرے۔ جلد ہی اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد سڑک کے نشیب میں اتر گئے۔ ان کی جھانجیں ایک بار پھر ڈھولکوں کی تھاپ پر جھنکارنے لگی تھیں۔ شعلوں کی لہراتی ہوئی روشنی میں انھوں نے اپنا وہ قدیم گیت چھیڑ دیا تھا جس میں ان سپاہیوں کی سرفروشی اور جانثاری کی داستانیں تھیں، جنھوں نے ۱۸۵۱ء میں انھی وادیوں میں لارڈ ہسٹینگز کی فوجوں کے چھکے چھڑا دیئے تھے۔

بالے کی آواز اُلجھی ہوئی تھی۔ وہ پتھروں کے گول گول ٹکڑوں پر سنبھل سنبھل کر قدم رکھ رہا تھا۔ اس

کے برابر ہی ہاڑا چل رہا تھا۔ اس کی آواز بالے سے بھی زیادہ بے سُری تھی۔ ہاڑا ایکایک چپ ہو گیا۔ بالے کے بالکل قریب سمٹ کر اس نے سرگوشی کی، "بالے! بھٹی والا ٹھیکیدار مجھے جانتا ہے۔ دیکھ بھی رہا تھا، گھور گھور کر۔"

مگر بالے نے زیادہ توجہ نہ دی۔ لاپرواہی سے بولا۔ "پرواہ نہ کر۔ وہ کچھ نہیں کر سکتا۔"

"تو یہ بھی ایک ہی کہی۔" ہاڑا نے جھنجھلا کر کہا۔ "اور جو اس نے مخبری کر دی تو بیکار میں گھر والے ستائے جائیں گے۔ اپنا کوئی کیا بگاڑ لے گا۔"

"جب ایسی بات تھی تو وہاں گئے کیوں تھے؟"

"یہی تو سوچ رہا ہوں۔"

ہاڑا سوچتا رہا اور آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ اس نے بالے کو دیکھا جو مشعل کو مضبوطی سے تھامے ہوئے اونچی آواز میں گا رہا تھا۔ ہاڑا چلتے چلتے ٹھٹھکا۔ ذرا دیر گم صم کھڑا رہا پھر وہ پلٹا اور جدھر سے آیا تھا، اسی سمت چلنے لگا۔ بالے نے ہاڑا کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ وہ جھومتا جھامتا آگے بڑھتا رہا۔ نشہ تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ اس کی آواز اونچی ہوتی جا رہی تھی۔ ڈھولکوں کی تھاپ اب تیز ہو گئی تھی۔ جھانجھوں کا شور بڑھ گیا تھا۔ مشعلوں کے لہراتے ہوئے شعلوں میں انسانی سایوں کی گردش شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ کوئیری پر کام کرنے والے مزدور، جو پہاڑی ندی کی تہہ سے دن بھر پتھر کھود کھود کر نکالتے تھے، ٹین کے سائبانوں کے نیچے سے مچان کران کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ بالے کو ہاڑا کا خیال آ گیا۔ وہ ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ اس احساس نے اسے چونکا دیا۔ گھبرا دیا۔ دفعتاً وہ پلٹا اور اسی طرف چلنے لگا جدھر ہاڑا گیا تھا۔

بھٹی کے پاس پہنچ کر اس نے دیکھا، بوڑھا کلوار فرش پر پڑا تھا۔ ہاڑا اس پر جھکا ہوا تھا۔ اس کا بے ہنگم سایہ چراغ کی دھندلی روشنی میں دیوار پر بڑا ہیبت ناک نظر آ رہا تھا۔ بالے گھبرا گیا۔ ہاڑا اس کے سامنے تھا۔ اس کا بھالا بوڑھے کلوار کی کوکھ میں اترا ہوا تھا۔ خون ابھی تک اُبل رہا تھا۔ بوڑھے نے ایک بار تڑپ کر گردن گھمائی۔ بھالا دونوں ہاتھوں سے تھاما اور ہاڑا کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھورنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں اذیت سے زیادہ خوف تھا۔ بے بسی تھی۔ اور کچھ کہنے کی تمنا۔ مگر وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کا بدن ذرا دیر تک پھڑکتا رہا اور پھر گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

بالے آگے بڑھا اور ہاڑا کے کوٹ کا کالر پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔

"ہاڑا یہ کیا کیا؟ اسے مار ڈالا۔ تو نے اچھا نہیں کیا۔"

ہاڑا اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر خشونت تھی۔ آنکھوں میں گہری سُرخی تھی، جو اُبلتے ہوئے لہو سے پوری لذت نہ اٹھا سکی تھی۔

ہاڑا بے نیازی سے بولا۔ "میں سمجھتا ہوں میں نے ٹھیک ہی کیا۔" اس نے سامنے چبوترے پر رکھی ہوئی شراب کی کُپّی اٹھا کر کھولی اور منہ سے لگا لی۔ بالے اس کی اس بے نیازی پر اور جھنجھلا گیا۔

"ہاڑا تو نے یہ ٹھیک نہیں کیا۔ یہ بندوقیں یہ بھالے ہتیا کرنے کے لئے نہیں ہیں۔ ہم نے انھیں اپنے کاندھوں پر اس لئے لٹکایا ہے کہ ہم بھوکوں مرنا نہیں چاہتے۔ ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں۔"

ہاڑا کی گھنی مونچھیں پھڑکیں۔ آنکھوں کا انداز ایک دم بدل گیا۔ اس کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔

"تو نے جو اپنی ماں کو مار ڈالا وہ ہتیا نہیں تھی؟"

ہاڑا یہ کہہ کر ہنسنے لگا۔ اس نے جھک کر بوڑھے کے جسم میں اترے ہوئے بھالے کو جھٹکا دیکر کھینچ لیا اور اس پر لگے ہوئے خون کو ہاتھ سے صاف کرنے لگا۔ بوڑھے کا جسم ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ بالے نے اس کی طرف دیکھا۔ بوڑھے کلوار کا خون سے لتھڑا ہوا چہرہ بڑا بھیانک معلوم ہو رہا تھا۔ بالے نے سہمی ہوئی نظروں سے ہاڑا کو دیکھا۔ ہاڑا نے بالے کی آنکھوں کی اداسی بھانپ لی۔ وہ ذرا اور کھل کر مسکرایا۔

"بالے میں تو مانتا نہیں کہ تو نے اپنی ماں کو مار ڈالا۔ کون جانے وہ اس وقت بھی اپنے یار پولیس والے کے ساتھ عیش کر رہی ہو۔"

بالے تڑپ کر ہاڑا پر جھپٹا اور اس کا گریبان پکڑ لیا۔ اس نے ہاڑا کے منہ پر تابڑ توڑ کئی ہاتھ رسید کئے پھر دیوار سے اڑا کر خونخوار نظروں سے اسے گھورنے لگا۔ مگر ہاڑا کے چہرے پر مطلق جھنجھلاہٹ نہ تھی۔ وہ حیرت زدہ نظر آ رہا تھا۔ بالے کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے۔ وہ زبان سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ کتنے ہی خیالات گرم لوہے کی طرح اس کے ذہن میں دہکنے لگے۔ دونوں خاموش کھڑے رہے۔ ہاڑا حیرت زدہ تھا۔ اور بالے جھنجھلایا ہوا۔ ناگاہ کہیں نزدیک ہی لاری کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔ بالے نے اسے چھوڑ کر سڑک کی طرف دیکھا۔ ایک لاری سڑک کے نکڑ

پر تیزی سے مڑ رہی تھی، مگر جب وہ پلٹا تو ہاڑا اسے اپنے بھالے کی زد میں لے کر پوری طرح چھا چکا تھا۔ اس کی گھنی مونچھیں پھڑپھڑانے لگی تھیں۔ چہرے کے مسخ نقوش میں جھلکتی ہوئی مسکراہٹ بڑی گھناؤنی معلوم ہو رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ بڑھتی گئی اور مسخ نقوش اور گھناؤنے ہوتے گئے۔ پھر وہ کھل کر مسکرا دیا۔ "تجھے بھی بوڑھے کے برابر اڑا دوں!" وہ ذرا بائیں سے ہنسا۔ بالے کی ٹھوڑی ہاتھ سے جھٹکا دے کر اوپر اٹھائی۔ "یہ تجھے ہو کیا گیا تھا؟" وہ ہنستا ہوا علیحدہ ہو گیا۔

بالے خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ مگر ہاڑا اس کی خاموشی سے مطلق متاثر نہ ہوا۔ کڑی نظروں سے اس کی طرف گھورتے ہوئے نفرت سے بولا "میں جو کچھ کرتا ہوں ٹھیک ہی کرتا ہوں۔"

لیکن بالے اسی طرح گم صم کھڑا رہا۔ اس دفعہ ہاڑا نے چیخ کر کرخت لہجہ میں کہا "ہٹ جا میری نظروں کے سامنے سے!" اس کی بھیانک آواز شیشم کے درختوں تلے گونج اٹھی۔

بالے احساس ہزیمت کے بوجھ سے دبا ہوا آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ اس کے پیچھے پیچھے مدھم قدم کے فاصلے پر ہاڑا کے بھاری قدموں کی آہٹ ابھر رہی تھی۔ بالے سوچنے لگا کہ یہ ہاڑا ہے جس کی گھنی مونچھیں پھڑپھڑاتی ہیں۔ جس کی مسکراہٹ زہریلی ہے۔ جس کی آنکھیں اُبلتے خون کو بھوکی نظروں سے دیکھتی ہیں۔ لیکن وہ ان گھنی مونچھوں کی پھڑپھڑاہٹ مٹا دے گا۔ یہ زہریلی مسکراہٹ بجھ جائے گی۔ ان آنکھوں کی بھوک مر جائے گی۔

دونوں نشیب میں اتر کر پتھروں کے چھوٹے بڑے گول، گول ٹکڑوں پر چلنے لگے۔ دور پہاڑی ندی کے پاس ڈھولکوں کی تھاپ تیز ہو گئی تھی۔ جھانجھوں کا شور گونج رہا تھا۔ گانے کی آوازیں پہاڑیوں سے ٹکرا کر جھنکار رہی تھیں۔ دونوں آگے بڑھتے گئے۔ مشعلوں کی روشنی قریب آتی جا رہی تھی۔ ان کے لہراتے ہوئے مشعلوں میں ریت پر بکھرے ہوئے قدموں کے نشان صاف نظر آ رہے تھے۔ دونوں تیز، تیز قدموں سے آگے بڑھے اور سب کے ساتھ جا کر مل گئے۔ ہاڑا کی آواز گاتے وقت تیز ہو جاتی تھی۔ اور بالے کی تانیں بیٹھی ہوئی تھیں۔

پہاڑی ندی کی تیز بہتی ہوئی لہروں کی گنگناہٹ اب سنائی دینے لگی تھی۔ دھند میں لپٹی ہوئی کشتیاں کچھ، کچھ نظر آنے لگی تھیں۔ ان کشتیوں پر اناج کی بوریاں لدی ہوئی تھیں۔ ان کے نزدیک ہی انسانی سائے

رینگتے نظر آرہے تھے۔ کسی نے چیخ کر پوچھا۔

"ادھر کون آرہا ہے؟"

راگھو نے مشعلوں کو پیچھے ہٹا دیا۔ آگے بڑھ کر اونچی آواز سے جواب دیا "کوئی نہیں سرکار! ہم لوگ تو نندا پور کے بازار جا رہے ہیں۔" راگھو نے جلدی سے مانجھو کو آگے ڈھکیل دیا۔ وہ اندھیرے میں چھپتا چھپاتا آگے بڑھا اور کئی آدمیوں کے ساتھ پیچھے سے نکل کر آناً فاناً پہریداروں کے سر پر پہنچ گیا۔ پہریداروں نے اپنی سنگینوں کو سنبھالنا چاہا۔ مگر وہ چاروں طرف سے گھر چکے تھے۔

راگھو نے ان کے قریب پہنچ کر قہقہہ بلند کیا۔ "ہم نندا پور کے بازار نہیں جائیں گے۔ یہ اناج لے جائیں گے یہ اناج ہمارا ہے۔"

پہریداروں میں سے کسی نے کہا۔ "لیکن یہ سرکاری غلہ ہے۔"

ہاڑا سب کے بیچ میں سے نکل کر سامنے آگیا۔ "ہے سرکار کے بچے۔ ہمیں بھی معلوم ہے یہ سرکاری غلہ ہے پر یہ کون جانتا ہے کہ ہم بھوکوں مر رہے ہیں۔" ہاڑا نے جھپٹ کر پہریدار کی گردن میں اپنا بھالا اتار دیا۔ اس کا جسم ریت پر گر کر پھڑکنے لگا۔ مگر ہاڑا نے صرف اپنا بھالا نکالا، اس کے ہاتھ سے بندوق چھینی اور راگھو کی طرف اچھال کر بولا۔

"لو میری مانو تو مرنی کو دیدو۔ وہ فوج میں رہ چکا ہے۔ اس کا نشانہ بھی بہت اچھا ہے۔"

بالے چپ چاپ کھڑا بے چین نظروں سے دیکھتا رہا۔ ہاڑا کے خون میں لتھڑے ہوئے بھالے کو، اس کے چہرے کو اور ان پہریداروں کو جن کے چہرے مشعلوں کی جھلملاہٹ میں مرغی کے پوزوں کی طرح سہمے ہوئے نظر آرہے تھے۔ اس نے بڑھ کر سب پہریداروں کی بندوقیں لے لیں اور راگھو کے سامنے لا کر ڈھیر کر دیں۔

ہاڑا ہنس کر بولا۔ "لیکن ان میں سے کوئی تم کو نہیں ملے گی۔ تمھاری بندوق بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔" بالے نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے راگھو سے کہا۔

"دادو! ان بے چاروں کو جانے دو۔ انھوں نے اپنا کیا بگاڑا ہے۔"

ہاڑا تیزی سے بولا۔ "اب یہ کہاں جائیں گے۔ ان کو بھی یہیں لٹا دو۔"

مگر راگھو کی سمجھ میں ہاڑا کی بات نہ آئی۔ "ارے یہ اپنا کیا کریں گے۔ اچھا بوریاں اٹھاؤ۔"

پہریدار اندھیرے میں ایک طرف چلے گئے۔ کشتیوں پر سے بوریاں تیزی سے اٹھائی جانے لگیں۔

ابھی سب کشتیاں بوریوں سے خالی بھی نہ ہوئی تھیں کہ ندی کی لہروں پر پانی کے چھینٹوں کی دھیمی دھیمی سرسراہٹ سنائی دی۔ راگھو نے گھبرا کر دیکھا۔ ایک کشتی کہر کے دھندلکے میں جاتی ہوئی نظر آئی۔

ہاڑا نے جھٹ اپنی بندوق اٹھائی۔ نشانہ باندھا اور گولی چلا دی۔ بندوق چلنے کی آواز وادی میں زور سے چیخی۔ پھر کئی گولیاں ایک ساتھ وادی میں گونج اٹھیں۔ لیکن کشتی دھندلکے میں غائب ہو چکی تھی۔

راگھو نے بجھی ہوئی آواز میں کہا۔ "پہریداروں کو چھوڑنا نہیں چاہیئے تھا۔ غلطی ہو گئی۔" اس غلطی کو مانجھو نے بھی بُری طرح محسوس کیا۔ گھبرائے ہوئے سے لہجے میں بولا۔

"سرکاری چوکی یہی میل بھر تو ہو گی۔ یہ تو بہت بُرا ہوا۔"

راگھو خاموش کھڑا ندی پر منڈلاتے ہوئے نیلگوں دھندلکے دیکھتا رہا۔

بالے آہستہ سے بولا۔ "یہ مجھے کب معلوم تھا۔"

ہاڑا تلملا اٹھا۔ "ارے تو جانتا ہی کیا ہے۔ سالا ہر جگہ اپنی ٹانگ بیکار میں اڑا دیتا ہے۔"

بالے نے راگھو کی طرف دیکھا اور فریاد کرنے لگا۔ "سن رہے ہو داد۔"

مگر راگھو نے ہاڑا سے تو کوئی باز پرس نہ کی۔ الٹا بالے پر برسنے لگا۔ "مجھے غصہ آ رہا ہے۔ تو میری نظروں کے سامنے سے ہٹ جا۔"

بالے ہٹ کر پیچھے چلا گیا۔ اس نے مڑ کر ہاڑا کی طرف دیکھا وہی زہریلی مسکراہٹ، وہی پھڑپھڑاتی ہوئی گھنی مونچھیں۔ بالے غصے سے اپنے ہونٹ چبانے لگا۔

بوریاں، جلدی جلدی اٹھائی جاتی رہیں۔ کشتیاں خالی ہوتی گئیں۔ اناج سے بھری ہوئی بوریاں پیٹھ پر اٹھائے ہوئے راگھو کے ساتھی اونچی، اونچی چٹانوں پر چڑھ کر دوسری طرف وادی میں اترتے جا رہے تھے۔ یکایک ندی کے اس پار سے گولیاں چلنے لگیں۔ راگھو نے سب کو چٹانوں کی اوٹ میں جانے کا اشارہ کیا۔ مگر بوریاں کشتیوں پر سے اٹھانے کا سلسلہ بند نہ ہوا۔ فائرنگ برابر ہوتی رہی۔ گولیاں رات کے سناٹے میں چیختی چلاتی رہیں۔ وادی کے نشیب میں اترنے والوں نے اپنی رفتار اور تیز کر دی۔

کہر کا دھندلکا گہرے خواب کی طرح ہر سمت چھایا تھا۔ اس دھندلکے سے نکل نکل کر، ندی کے بہاؤ پر چند کشتیوں کے دھندلے، دھندلے ہیولے ابھرنے لگے۔ راگھو اور اس کے ساتھی چٹانوں کی اوٹ میں دبے، دبے پیچھے ہٹتے رہے۔ اب وہ پھلچی کے اونچے، اونچے پودوں کے قریب پہنچ چکے تھے، جن کی لمبی، لمبی اوپر اٹھی ہوئی شاخوں کی نوکوں پر روئی کے گالوں کے سے سفید، سفید پھول تیز ہوا سے جھوم رہے تھے۔ راگھو کی ہدایت پر مشعلیں پھلچی کے جھنڈ میں پھینک دی گئیں۔ سفید، سفید پھولوں نے دیکھتے ہی دیکھتے آگ پکڑ لی۔ ہر طرف شعلے بھڑکنے لگے۔ شعلوں کی روشنی دور تک پھیل گئی۔ اس روشنی میں وہ ندی کے پار سے آنے والی کشتیوں کو اور ان میں بیٹھے ہوئے مسلح پولیس والوں کو دیکھ سکتے تھے۔ انھوں نے خود کو پوری طرح چٹانوں کی آڑ میں چھپا لیا تھا۔

بپھری ہوئی ہوا کی سرسراہٹ اور بڑھ گئی تھی۔ گولیاں چیختی ہوئی چلتی رہیں۔ پھلچی کی اونچی اونچی شاخوں سے ابھرتے ہوئے شعلے الاؤ کی آنچ کی طرح سرخ، سرخ زبانیں نکال کر بھڑک رہے تھے۔

ندی کی دوسری جانب سے آنے والی کشتیاں کنارے پہنچ چکی تھیں۔ پولیس والے بندوقیں اور رائفلیں سنبھالے ہوئے پانی میں کودتے، جھکے جھکے آگے بڑھتے اور پھر تی سے ریت پر لیٹ جاتے۔ کچھ دیر دم بخود پڑے رہتے۔ پھر پت پر گھسٹتے ہوئے آہستہ، آہستہ آگے بڑھتے۔ راگھو اور اس کے ساتھی بھی مورچے بنا کر گھات میں بیٹھے تھے اور رک، رک کر بندوقوں کی باڑ مار رہے تھے۔ دونوں طرف سے مسلسل فائرنگ ہو رہی تھی۔ گولیاں سنسناتی ہوئی گزر رہی تھیں۔

بالے ایک چٹان کی اوٹ میں دبکا ہوا بیٹھا تھا۔ اس کے آگے ایک اونچا پتھر تھا جس کی آڑ سے وہ گولی چلا رہا تھا۔ سامنے پھلچی کے جلتے ہوئے پودے تھے اور ان سے شعلے ابھر رہے تھے۔ اس کا ہاتھ بندوق کی لبلبی پر تھا۔ اور تیزی سے چل رہا تھا۔ اسی اثنا میں قریب سے آواز آئی "بالے!" بالے نے آواز کو پہچان لیا۔ مگر دم بخود لیٹا رہا۔

گولیاں چٹانوں سے ٹکرا، ٹکرا کر دھاڑ رہی تھیں۔ بالے نے آہٹ محسوس کی اور کان اسی طرف لگا دئے۔ کوئی آہستہ، آہستہ کھسکتا ہوا قریب ہوتا جا رہا تھا۔ پھر اس کے پہلو سے آواز ابھری۔ "بالے! میرے پاس کارتوس ختم ہو گئے ہیں۔ تیرے پاس ہوں تو کچھ مجھے بھی دیدے۔" یہ ہاڑا کی آواز تھی اور بالے اسے پہلے ہی پہچان چکا تھا۔ بالے کچھ نہ بولا۔ بالکل خاموش رہا اور سوچتا رہا کہ یہ ہاڑا ہے۔ ہر طرف کہر کا دھندلکا چھایا ہے گولیاں

وادی میں گونج رہی ہیں۔ اور ان کے ساتھ ساتھ انسانی چیخیں ابھر رہی ہیں۔ اس کی طرح اس کے ساتھی بھی چٹانوں کی اوٹ میں دم بخود بیٹھے ہیں۔ گولیاں چلا رہے ہیں اور زخمی ہو کر کراہ رہے ہیں۔ اس لئے کہ وہ بھوک سے مرنا نہیں چاہتے۔ وہ زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ لیکن ہاڑا کو زندہ نہیں رہنا چاہیئے۔ اس کی مسکراہٹ میں زہر گھلا ہوا ہے۔ اس کی آنکھیں ابلتے ہوئے خون کی بھوکی ہیں۔

بالے نے اچانک اپنی کمر سے کٹار نکالی۔ کھسک کر ہاڑا کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ اندھیرے میں تیزی سے جھپٹا۔ وار کیا اور پوری کٹار ہاڑا کے سینے میں اتار دی۔ ہاڑا تکلیف سے چیخا۔ بے قرار ہو کر اٹھا۔ اور تڑپ کر بالے کے قدموں کے پاس گر گیا۔ اس نے کراہتے ہوئے کہا۔

"بالے! تو نے بہت بُرا کیا۔ بالے! تو نے یہ ٹھیک نہیں کیا۔"

لیکن بالے چپ چاپ پڑا رہا اور سوچتا رہا کہ ہاڑا کی کراہ خود بخود ختم ہو جائے گی۔ یہ ابلتے ہوئے لہو کی بھوکی آنکھیں گولیوں کی بوچھاڑ میں جھپک جائینگی۔ ہاڑا کا مضبوط جسم ٹھنڈا ہو جائے گا۔ یہیں چٹانوں کی اوٹ میں پڑا رہے گا۔ گدھ اور چیلیں اس کی لاش کو نوچ نوچ کر کھا جائینگی۔

ہاڑا نے زخم کی کسک سے تڑپ کر پہلو بدلا۔ اور رک رک کر کہنے لگا۔ "سچ کہہ رہا ہوں بالے! تو نے بہت بُرا کیا۔ یہ مت سمجھنا کہ میری لاش یہاں پڑی ہوئی سڑتی رہے گی۔ وہ مجھے مرنے نہ دیں گے۔ میرا علاج کرائیں گے اور جب میں اچھا ہو جاؤں گا تو میرے بدن کو گرم گرم سلاخوں سے داغیں گے۔ میرے زخموں پر مرچیں ڈالیں گے۔ مجھے الٹا لٹکائیں گے۔ مار پیٹ کریں گے۔ مجھ سے سب کچھ اگلوانے کی کوشش کریں گے۔ بتا پھر میں کیا کرونگا۔ بالے! تو نے مجھے بہت بڑی سزا دی ہے۔"

بالے خاموش رہا۔

ہاڑا نے عاجزی سے کہا۔ "یہ کٹار تو میرے سینے سے نکال لے۔ مجھے گولی مار دے۔ یہ سب سے اچھا ہو گا۔"

بالے چپ چاپ اٹھا۔ اس نے اپنی کٹار کھینچ کر ہاڑا کے سینے سے نکالی۔ اسے اپنی کمر میں لگایا۔ جھکا اور ہاڑا کو اٹھا کر اپنی پشت پر لاد لیا۔ اس نے پلٹ کر ندی کی سمت دیکھا اور چٹان کی آڑ میں دبکا ہوا نیچے وادی میں اترنے لگا۔

ہوا کی سیٹیاں، انسانی چیخیں اور گولیوں کی تیز آوازیں، سب مل جل کر ایک طویل کراہ بن گئی تھیں۔ بالے اندھیرے میں ہاڑا کو پیٹھ پر لادے ہوئے ڈھلوان پر اتر رہا تھا۔ گولیاں اس کے قریب سے سنسناتی ہوئی گزرتی رہیں۔ پھر ایک گولی اس کی پنڈلی کو زخمی کرتی ہوئی گزر گئی۔ بالے کے قدم لڑکھڑا گئے۔ ہاڑا ایک طرف جھک کر گرتے، گرتے بچا۔ اس کا جسم بری طرح جھول رہا تھا۔ زخم کی ٹیس بڑھ گئی تھی۔ اس نے اپنے زخمی سینے کو ایک ہاتھ سے دبا لیا۔

بالے ڈگمگاتا ہوا، پتھروں سے ٹھوکریں کھاتا ہوا، جھکا جھکا چلتا رہا۔ اس کے پیر بار بار لڑکھڑا جاتے۔ ہاڑا نے بھانپ لیا کہ بالے بری طرح زخمی ہو چکا تھا۔ اسے چلنے میں سخت دشواری پیش آ رہی تھی۔ ہاڑا نے منہ بڑھا کر سرگوشی کی۔

"بالے! مجھے یہیں چھوڑ دے اور اکیلا نکل جا۔"

لیکن بالے نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ چاپ چلتا رہا۔ گولیوں کی سنسناہٹ اور تیز ہو گئی۔ اب چٹانوں پر بھاری، بھاری بوٹوں کی آوازیں پتھروں سے ٹکرا ٹکرا کر ابھرنے لگی تھیں۔ ہاڑا نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "بالے! مجھے اتار دے۔ یہی ٹھیک ہے۔" بالے پھر بھی نہ رکا۔ اس دفعہ ہاڑا نے ڈپٹ کر تنبیہ کی۔

"جیسا کہہ رہا ہوں۔ ویسا ہی کر۔" اس نے فوراً بالے کی کمر سے کٹار نکال لی۔ "دیکھ یہ کٹار میرے ہاتھ میں ہے۔ تو نے میرا کہا نہ مانا تو ابھی تجھے یہیں نپٹا دوں گا۔ سن رہا ہے میری بات؟"

بالے کے قدم رک گئے۔ اس نے ہاڑا کو نیچے اتار دیا۔ اور ایک پتھر پر بیٹھ کر زور، زور سے ہانپنے لگا۔ ہاڑا اپنے سینے کے زخم کو ہاتھ سے دبائے ہوئے ذرا دیر گم صم کھڑا رہا۔ پھر اس نے اپنی بندوق اور بھالا بالے کو دے دیا اور اس کے شانے تھپتھپا کر بولا۔ "بالے! میں چاہتا تو وہیں چٹان کی اوٹ میں تجھے ختم کر سکتا تھا۔ پر میں نے تجھے چھوڑ دیا۔ سچ مچ تو ابھی بالک ہے۔ تجھے پتہ نہیں، میں جو کچھ کرتا ہوں ٹھیک ہی کرتا ہوں۔ میں تجھ سے بڑا ہوں اور میرا تجربہ بھی تجھ سے بہت زیادہ ہے۔" وہ گہری، گہری سانس بھر کر بولتا رہا۔ بالے بالکل خاموش رہا۔ ہاڑا مڑا۔ ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے آگے بڑھا اور ایک تنگ راستے سے ہوتا ہوا پھلچی کے شعلہ فشاں پودوں کے الاؤ کی سمت چلنے لگا۔

بالے شعلوں کی روشنی میں ہاڑا کے رینگتے ہوئے سائے کو دیکھتا رہا۔ ہاڑا اونچے، اونچے پتھروں کی آڑ میں دبا، دبا آگے بڑھتا جا رہا تھا پھر ایک پتھر سے ٹھوکر کھا کر وہ لڑکھڑایا اور ایک دم شعلوں کی تیز روشنی میں آگیا۔ عین اسی وقت دھڑا، دھڑ کئی گولیاں چیخیں اور ہاڑا کے بدن کو چھلنی کر ڈالا۔ ہاڑا ڈگمگا کر گرا اور لڑھکتا ہوا دور تک چلا گیا۔ ذرا دیر تک وہ نڈھال پڑا رہا۔ پھر وہ گھسٹتا ہوا آگے بڑھا اور پھلیجی کے پودوں کے الاؤ کے پاس پہنچ گیا۔

جلتے ہوئے پودوں کے شعلے بالکل اس کے نزدیک آگئے تھے۔ وہ بڑھتا رہا۔ الاؤ سے قریب ہوتا گیا قریب اور قریب۔ پھر وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ڈگمگاتا ہوا الاؤ میں گھس گیا۔ شعلے اس کے کپڑوں سے لپٹ کر بھڑکنے لگے۔ ہاڑا کا جسم جلنے لگا۔ اس نے تکلیف سے بلبلا کر چیخ ماری اور جلتے ہوئے پودوں کے درمیان گر گیا۔

بالے نے خوف زدہ ہو کر اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔ چند لمحے اسی عالم میں بیٹھا رہا۔ پھر اس نے پھلیجی کے پودوں کی طرف دیکھا۔ وہاں صرف شعلے بھڑک رہے تھے۔ بالے اٹھا اور تیزی سے نشیب میں اترنے لگا۔

مسیتا تانگے والا

دس بجے رات کو جب منیجر دفتر کی بتیاں بجھا کر چلا گیا تو گودام کے پاس والے نیم تاریک کمرے میں بیرے اکٹھا ہونے لگے۔

باہر ابھی تک ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ ہوا اس قدر تیز تھی کہ پچھلی دیوار کے روشندان سے ننھی ننھی بوندیں اندر آ کر بکھر جاتیں۔ سجانی نے آتے ہی الماری کے پیچھے سے تاش کی گڈی نکالی اور سب کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

"بھئی جمتی ہے۔ ہے کوئی مائی کا لال؟"

شبّر نے اپنی جیب کھنکھنا دی "ابے کوئی تجھ سے پتلا موتتے ہیں"۔ اور سلگتی ہوئی بیڑی پھینک کر اس کے پاس پہنچ گیا۔ "مانگ پتا ہی ہوگا نا"

قریب بیٹھے ہوئے دوسرے بیرے بھی ادھر ہی کھسکنے لگے۔ تاش بٹنا شروع ہو گئے۔ اونچے، اونچے قہقہوں کے ساتھ سکوں کی جھنکار بھی گونجنے لگی۔ مگر شبّر چار روپے ہارتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

سجانی نے اسے روکا تو کہنے لگا "اب نہیں کھیلوں گا۔ تجھے اس وقت پتا بہت پیار کر رہا ہے"۔ وہ انور کے ساتھ اسٹیشن چلا گیا۔ سہارن پور سے ۹۷ ڈاؤن پسنجر آنے والی تھی۔

سجانی نے تاش پھینٹتے ہوئے سب کی طرف دیکھا ایک بار پھر سب کو للکارا "ہے کوئی مجیوٹ والا۔ ایک لگاؤ، دو پاؤ۔ ہے کوئی؟" اور جب مسیتا سرک کر اس کے سامنے آ گیا تو بیروں میں حیرت سے کھلبلی پڑ گئی۔

میتا کہنے لگا۔ ”دیکھ بے ذرا ٹھیک سے کھیلنا۔“

سجانی اسے گھور کر دیکھنے لگا۔ ”ابے ٹھیک سے کیا! تو کوئی اندھا ہے۔“

سجانی آنکھیں میچ کر ہنسنے لگا۔ ”اچھا پتے تو بانٹ۔“ اس نے جیب سے ایک چونّی نکال کر سامنے ڈال دی۔ ”پنجا باہر پھینک۔“ اور پنجا گرا بھی اس کی طرف۔

جب کئی بار برابر سینا ہی جیتا تو کسی نے پیچھے سے کہا۔ ”ابے سجانی، اس سے کیا جیتے گا۔ یہ تو روپے پڑھوا کر لایا ہے۔“ سینا کی باچھیں کھل گئیں۔ مگر پھر جو تاش کا رُخ بدلا تو اس کے ہونٹوں پر مچلتی ہوئی مسکراہٹ سمٹتے سمٹتے چہرے پر دھندلا غبار بن کر چھا گئی۔

سجانی کی انگلیوں سے تاش پھسل پھسل کر گرتے اور ہر بار سب کی نظریں جھک جاتیں کہ اب کون سا پتّا گرا۔ میتا کا دل دھڑکنے لگتا، چہرے کا دھندلا غبار اور بڑھ جاتا۔ تاش پھسل پھسل کر گرتے رہے۔ حیرت زدہ نظریں جھکتی رہیں، سکّے کھنکتے رہے۔ میتا کے چہرے پر چھایا ہوا غبار بڑھتا ہی گیا۔

سجانی برابر کہے جا رہا تھا۔ ”بیگی اندر، بیگی اندر۔“ پھر پانسہ پلٹا کر اس کی طرف جا گری۔ وہ اچھل پڑا۔ ”ہے بیگی اندر۔“ اس نے تاش اٹھا کر چوم لیا۔ ”واہ میری جان۔“ میتا کا چہرہ اور غبار آلود ہو گیا۔ اس نے سر کھجاتے ہوئے زبردستی انگڑائی لی۔ جھجکتے ہوئے سجانی سے کہا۔

”ذرا دو روپے تو ادھر پھینکو“

سجانی سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ”بھئی یہ جھول ہے۔“

میتا جھنجلا کر بولا۔ ”تو کیا میں تمھارے روپے لے کر بھاگ جاؤں گا۔“

”یوں تم مجھ سے دو کے بدلے چار روپے لے لو۔ مگر بھئی جوئے کے معاملے میں ادھار نہیں کرتا۔“ سجانی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”پھر کھیل لینا۔“

میتا سے کچھ کہتے نہ بن پڑی۔ شرمندہ ہو کر رہ گیا۔ ”اچھی بات ہے۔“

نوعمر بیروں نے سجانی کو گھیر لیا۔ ”سجانی بھیّا! کچھ ہم کو نہیں دو گے۔“ وہ ان سب کو ہر بھجن تمبولی کی دکان پر پان کھلانے چلا گیا۔

میتا تھوڑی دیر تک تو گُم صُم بیٹھا رہا۔ پھر وہیں دیوار کے پاس کونے میں لیٹ گیا۔ نیم تاریک کمرے میں دھندلی

دھندلی پرچھائیاں سی لرزتی معلوم ہو رہی تھیں۔ اور مستیا کو الجھن ہو رہی تھی۔ کچھ دبا دبا سا کرب، کچھ اعصابی تشنج۔ سردی اتنی تیز تھی کہ اسے کسی پہلو قرار نہ ملتا۔ پیروں کو اوور کوٹ کے اندر دبانا چاہا۔ مگر وہ اس میں سما سکے۔ اس نے جھنجھلا کر ان کو پھر باہر کر دیا۔ دراصل اس کے پاس اوڑھنے کے لئے صرف یہی اوور کوٹ تھا۔ کسی مرے ہوئے حامی کی یہ اترن اس نے پورے سات روپے میں خریدی تھی۔ وہ بھی پیشگی لے کر، جسے ہوٹل کے مالک چودھری عبدالکریم نے تنخواہ دینے سے پہلے ہی مینجر سے دریافت کر لیا تھا۔

"کچھ پیشگی ساب؟" اور مینجر نے جھٹ اس کو یہ رقم بتا دی۔ مستیا نے گڑگڑا کر کہا تھا "ساب! اس دفعہ بڑی ضرورت ہے۔ اگلے مہینے کاٹ لیجئے گا۔"

چودھری نے پان کی پیک تھوک کر غصے سے کہا تھا "اگلے مہینہ؟ سالے کوئی تمہارے باپ نے یہاں کچھ جمع کرا دیا ہے۔ کریں گے بیرہ گیری اور پہنیں گے اوور کوٹ۔"

•

مستیا کہتا بھی کیا۔ بس اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔

چودھری عبدالکریم اپنے مینجر سے پوچھتا رہا۔ "کچھ ٹوٹ پھوٹ؟" مینجر نے رجسٹر کے ورق پلٹے اور فرفر بتانا شروع کر دیا۔ تین پلیٹیں، دو گلاس، ایک ٹی پاٹ۔ کل پانچ روپے گیارہ آنے۔" مستیا گھوم کر بے چارگی سے مینجر کی طرف دیکھنے لگا۔ لیکن چودھری نے نہ جانے کیا سوچ کر صرف چار ہی روپے کاٹے۔ کہنے لگا "ابے! اندھا ہو کر کام کرتا ہے۔ اس دفعہ کمی کئے دیتا ہوں۔ مگر اب دوگنے دام لگیں گے۔" پھر تیرہ روپے میز پر سے اٹھا کر مستیا کو دیدیئے۔ مستیا نے دفتر سے نکل کر روپوں کو گنا، پھر خود بخود مسکرا دیا۔ دل ہی دل میں کہا۔ چودھری ہے ذرا ٹیڑھا۔ مگر طبیعت کا برا نہیں۔ بے چارے نے پورے ایک روپے گیارہ آنے کم کر دیئے، ورنہ مینجر نے تو کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔

کمرے میں دھندلی دھندلی پرچھائیاں لرزتی رہیں۔ روشندان سے بارش کی ننھی ننھی بوندیں اندر آکر بکھرتی رہیں۔ مستیا دیوار کے پاس لیٹا ہوا سوچتا رہا کہ سردی بہت تیز ہے۔ اور اس کے پاس اوڑھنے کو صرف اوور کوٹ ہے، جسے اس نے سات روپے پیشگی لیکر خریدا ہے۔ اور یہ سات روپے چودھری نے کاٹ لئے ہیں۔ اسے کل تیرہ روپے تنخواہ ملی ہے اور وہ تیرہ روپے بھی وہ جوئے میں ہار گیا۔ جنہیں سجانی اپنی جیب میں ڈال کر باہر چلا گیا ہے۔ اور اب اس کے پاس کچھ بھی نہیں۔ نہ معلوم گھر پر کیا ہو رہا ہوگا۔ دو مہینے یونہی گزر گئے۔ وہ کچھ بھی نہ بھیج سکا۔ پہلی تنخواہ

جب ملی تھی تو مینیجر سر پر آ کر یوں کھڑا ہو گیا تھا جیسے وہ اس کا قرض دار تھا۔ مگر یہ تو پہلے ہی طے ہو گیا تھا کہ مینیجر نوکری دلا دے گا اور پہلی تنخواہ خود لے لے گا۔ چاہے کچھ ہی ہو لیکن کسی کو کیا معلوم کہ جب سے ماں لو گٹھیا ہوئی ہے وہ ہر وقت بستر پر پڑی رہتی ہے اور نوری اب سیانی ہو گئی ہے کہیں آ جا بھی نہیں سکتی۔ یوں بھی وہ سالا نہالی اسے دیکھ کر بدمعاشی سے کھنکارتا ہے۔ چھیڑ خانی کرتا ہے۔ یہ خیال کچھ اس قدر وحشت ناک تھا کہ اس نے کروٹ بدل لی۔ اور بیرن کو دیکھنے لگا، جو اس کے برابر ہی کمبل میں سکڑا سکڑایا پڑا تھا۔ لیکن مستیا کی آنکھوں میں غنودگی کے آثار تک نہ تھے۔

مستیا خاموش پڑا ہوا بیرن کو دیکھتا رہا۔ پھر جھنجھلا کر اس نے بیرن کو پیر سے ٹھوکا دیا۔ ہولے، ہولے بڑبڑایا "سالا کس ٹھاٹ سے پڑا سو رہا ہے"۔ بیرن واقعی بے خبر سو رہا تھا۔ مستیا کے ٹھکرانے پر بھی اسی طرح لیٹا رہا۔

مستیا نے سردی سے ٹھٹرتے ہوئے اپنے پیروں کو آہستہ سے بیرن کے کمبل کے اندر کر دیا۔ مگر اس کو خبر تک نہ ہوئی۔ مستیا سوچنے لگا کہ بیرن کو بھی تو شام ہی کو تنخواہ ملی ہے۔ سالا کہیں گیا بھی نہیں۔ بس روپے جیب میں ڈالے مزے سے سو رہا ہے۔ یوں بھی وہ ہر وقت اونگھا کرتا تھا۔ جہاں دیکھو آنکھیں میچے پڑا ہے۔ یونہی سوچتے سوچتے بیرن کی جیب کا خیال مستیا کے ذہن میں کھٹاک سے ٹکرایا اور پھر اس کی متواتر ٹکروں سے وہ گھبرا سا گیا۔

اس نے مڑ کر دروازے کی جانب دیکھا، اور کھسک کر بیرن کے پاس پہنچ گیا۔ ذرا دیر سانس روکے پڑا رہا۔ پھر ایک ہاتھ بڑھا کر ہولے سے بیرن کے سینے پر رکھ دیا۔ اور انگلیوں سے آہستہ آہستہ اس کی جیب ٹٹولنے لگا۔ جیب میں بیڑی کا بنڈل تھا۔ اور کچھ ریزگاری تھی۔ سخت کوفت ہوئی اور اس کوفت کو مٹانے کے لئے مستیا نے بیرن کی جیب سے بیڑی نکال کر پینا چاہی۔ مگر جیسے ہی اس نے بیڑی کا بنڈل انگلیوں سے پکڑ کر جیب سے نکالنے کی کوشش کی، بیرن ایک دم اچھل پڑا۔ اس نے جھٹ مستیا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ مستیا گھبرا کر دم بخود رہ گیا۔ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ چپ چاپ لیٹا رہا۔

بیرن اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے گھور کر مستیا کو دیکھا اور ڈپٹ کر بولا "سالے! یہ کون سی حرکت تھی؟"

اب خاموش رہنے کی گنجائش نہ تھی۔ میتا نے جھٹکا دے کر ہاتھ چھڑایا اور ذرا سنبھل کر عذر پیش کرنے کی کوشش کی۔ "بیڑی پینے کے لئے نکال رہا تھا۔" وہ کھسیانا ہو کر ہنسنے لگا۔ "بے تو اس میں ہو کیا گیا؟"

"سالے! تم ایک نمبر پاجی ہو۔" بیرن اور جھلا گیا۔ "آئندہ جو میری جیب میں ہاتھ ڈالا تو اچھا نہ ہوگا۔"

میتا نے جھینپ کر کہا۔ "اُفو! بڑے تو سالے خان، یہ دولت مند ہی ہیں۔"

مگر بیرن کمبل اوڑھ کر لیٹ چکا تھا۔ میتا گردن موڑے اسے دیکھتا رہا، بالکل اس انداز سے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ لیکن یہ سوچ کر اسے تعجب ضرور ہوا کہ بیرن بڑی ہوشیار نیند سوتا ہے۔ اور اس کی اپنی نیند کتنی خراب ہے۔ حالانکہ ہوٹل میں رات کو بار، بار بستر سے اٹھنے کے باعث اس کی نیند اب گہری نہیں رہی تھی۔ ایک زمانہ تھا جب وہ اس طرح نیند میں مدہوش ہو کر سوتا تھا کہ تن بدن کا ہوش نہ رہتا تھا

پچھلے مارچ کے مہینے کا ذکر ہے۔ جب رات گئے نمبردار نے اس کی جیب سے روپئے نکال لئے تھے۔ اور اسے مطلق خبر نہ ہوئی۔ وہ تو خود نمبردار ہی نے جھنجھوڑ کر اسے جگایا تھا۔ اور جب وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تو حیرت زدہ نظروں سے دیکھا کہ نمبردار اپنی چندھی لالٹین ہاتھ میں لٹکائے اس کے سرہانے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ پھر مسکراتے مسکراتے اچانک خفا ہونے لگا۔ "کیوں بے! مجھے گھسّا دیتا ہے۔ سالے! یہ روپئے کہاں سے آئے؟" اس نے تین روپئے نکال کر میتا کے سامنے کر دئے۔

میتا ان دنوں ماہانہ تنخواہ پر نمبردار کا تانگہ چلاتا تھا۔ اس نے جھٹ بات بنائی۔ "یہ تو نوری نے کپڑا خرید کر لانے کو دئے تھے۔" نمبردار کے چہرے کی خشونت اور بڑھ گئی۔ آنکھیں نکال کر بولا۔

"سالے! کل تو مجھ سے ایک روپیہ مانگ کر لے گیا تھا کہ گھر پہ کھانے کو نہیں ہے۔ اب یہ پورے تین روپئے، نوری کیا اپنے کسی یار سے لائی ہے؟"

میتا نے بے حیائی سے ہنس کر ٹالنا چاہا۔ "اب میں تمھیں کیسے یقین دلاؤں۔" اس نے اس طرح بے نیازی کا مظاہرہ کیا جیسے نمبردار کو یقین دلا رہا ہو کہ یہ روپئے نوری نے ہی دیئے ہیں اور نوری کا کوئی یار نہیں۔ نوری اس طرح کسی سے روپئے نہیں لا سکتی۔ وہ اپنا سر کھجانے لگا اور وہ سر اسی وقت کھجاتا تھا، جب اس سے کچھ

بجنے نہیں پڑتا۔ نمبردار اس کی اس کمزوری سے بخوبی واقف تھا۔ اس نے ڈپٹ کر تنبیہہ کی۔

"دیکھ بے، اب کے چھوڑے دیتا ہوں، پھر جو یہ چار سو بیسی کی تو سیدھا گھر کا راستہ دکھاؤں گا۔ سالے! تو نے مجھے کوئی اناڑی سمجھ رکھا ہے۔ اب سات تانگے رکھتا ہوں، اور ہر ایک کی اِتّی اِتّی خبر رکھتا ہوں۔ اب یہی دیکھ تو آج چھاؤنی کی سواری لے کر گیا تھا۔ میں تو اسی دن سمجھ گیا تھا کہ یہ پانچ روپے کیسے دے رہا ہے۔"

نمبردار کی باتیں سن کر مسیتا خاموش بیٹھا رہا تھا۔ اور برابر اپنا سر کھجاتا رہا۔ نمبردار لالٹین سنبھالے ہوئے باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد مسیتا پھر لیٹ گیا۔ اور غور کرنے لگا کہ نمبردار کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ چھاؤنی گیا تھا۔ اور جب اسے اتنا معلوم ہی ہو گیا تو یہ کیوں نہ پتہ چلا کہ اسے چھاؤنی کی سواری میں ملا کیا۔ بات بھی دراصل یہی تھی۔ سینما کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے سوچا کہ اگر کوئی سواری مل جائے تو اچھا ہے، ورنہ وہ تانگہ کھولنے تو جا ہی رہا تھا۔ چوراہے پر مڑتے ہی اسے ایک گورا مل گیا۔ لیکن وہ اسے تانگے میں بٹھانا نہ چاہتا تھا۔ اور جب وہ لپک کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا تو وہ انکار بھی نہ کر سکا۔ مگر اسے راستے بھر ایک الجھن دامن گیر رہی۔ یوں تو وہ چھاؤنی کی سواریاں اکثر لے جاتا تھا۔ لیکن پچھلے اتوار کو ہوا یہ کہ وہ دو گوروں کو بٹھا کر لے گیا۔ دونوں چھاؤنی کے قریب اترے اور بغیر کرایہ دیے جانے لگے۔ اس نے ٹوکا تو وہ ڈانٹنے لگے۔ "نیئں لے۔ باگ جاؤ۔" اور پھاٹک کے اندر داخل ہو گئے۔ مسیتا ان کے پیچھے لپکا۔ مگر پھاٹک کے باہر ہی رک گیا۔ سامنے سنتری چمکتی ہوئی سنگین سنبھالے کھڑا تھا۔ دونوں گورے اطمینان سے سیٹیاں بجاتے ہوئے جا رہے تھے۔ مسیتا بے بسی سے ان کو دیکھتا رہا۔ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

اس روز جب چھاؤنی میں پہنچ کر گورا تانگے سے اترنے لگا تو مسیتا پوری طرح چوکنا تھا۔ وہ بھی بغیر کرایہ دیے جانے لگا تو مسیتا جھپاک سے آگے بڑھا اور راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ "ساب کرایہ۔" گورے نے رسان سے جواب دیا۔ "کل دینگا۔ آج نیئں اے۔" مسیتا اڑ گیا۔ "نہیں صاب، کرایہ تو ابھی مل جائے۔" گورے نے اپنی خاکی پتلون کی دونوں جیبیں باہر نکال کر مسیتا کی جانب دیکھا۔ "ایک دم ایمپٹی۔" اس کے لہجے میں اتنی نرمی تھی اور کچھ ایسی بے بسی تھی کہ مسیتا خود بھی نرم پڑ گیا۔ اسے حیرت بھی ہوئی اور کچھ تکلیف بھی۔ انھی گوروں سے

وہ اب تک نہ جانے کتنے روپے کرانے کی صورت میں وصول کر چکا تھا۔ کرانے کے علاوہ کبھی کبھی تو دو چار آنے بخشش بھی لے چکا تھا۔ اسے کبھی گمان بھی نہ ہوا تھا کہ انکی جیبیں بھی خالی ہو سکتی ہیں۔ اسے پتلون سے باہر نکلی ہوئی جیبیں فریاد کرتی ہوئی معلوم ہوئیں۔ اس نے چپ چاپ اپنی جیب سے ایک اٹھنی نکالی اور گورے کو دے دی۔ پھر میتا مسکتا نہ رہا۔ احساس برتری نے اسے میتا تانگے والے سے بڑھا کر کچھ اور بنا دیا۔ گورا ذرا دیر تو اٹھنی ہاتھ میں لئے حیرت زدہ کھڑا رہا پھر اسے کچھ خیال آیا۔ منہ بگاڑ کر غصے سے چیخا "یو سن آف اے سوائن" اور اٹھنی میتا کے منہ پر اس طرح ماری کہ کھٹاک سے اس کے ماتھے پر لگی۔ میتا تعجب سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے ماتھے کو سہلانے لگا۔ گورا غصے سے بڑبڑاتا ہوا چلا گیا تو میتا نے ماچس جلائی اور اٹھنی تلاش کرنے لگا۔ اٹھنی سڑک کے کنارے پڑی ہوئی مل گئی۔ اسے اٹھا کر میتا نے جیب میں رکھا اور مسکراتا ہوا جا کر تانگہ میں بیٹھ گیا۔ مسکراتے مسکراتے اس نے سوچا کہ کسی نے سچ کہا ہے، یہ سالے گورے واقعی بندر کی نسل کے ہیں۔ بھلا اس قدر برا ماننے کی کونسی بات تھی۔ اس نے ترس ہی کھا کر تو اٹھنی دی تھی۔ گالی تو نہیں دی تھی جو وہ اتنا بگڑ گیا۔

میتا نے گھوڑے کو چابک لگائی اور سڑک پر تانگہ دوڑانے لگا۔ گورے سے کرایہ نہ ملنے کا اسے مطلق افسوس نہ تھا۔ آٹھ روپے سے زیادہ اس کی جیب میں موجود تھے۔ اب اسے اور کیا چاہئے تھا۔ تین روپے نکال کر اس نے جوتے کے پتاوے کے نیچے چھپا لئے اور تھان پر پہنچ کر پانچ روپے نمبردار کو دیئے۔ نمبردار اس وقت تو صرف ناک بھوں چڑھا کر رہ گیا۔ میتا مطمئن ہو کر اپنی کوٹھری میں چلا گیا۔ مگر اسے یہ خبر ہی نہ تھی کہ نمبردار بھی کم کائیاں نہ تھا۔ اور جب سونے سے پہلے میتا نے روپے نکال کر جیب میں رکھ لئے تو نمبردار نے آکر تلاشی لی۔ روپے جیب سے برآمد کئے۔ ناراض بھی ہوا۔ لیکن ڈانٹ پھٹکار کر چھوڑ دیا۔

مگر میتا باز نہ آیا۔ اس نے قمیض کے کالر میں چھید بنا لیا اور روپے اس میں چھپانے لگا۔ کچھ عرصے تو اس طرح کام چلتا رہا۔ میتا دوسرے تیسرے نمبردار کو غچہ دیکر دو چار روپے صاف پار کر دیتا۔ لیکن نہ جانے کس طرح نمبردار کو یہ بھید بھی معلوم ہو گیا۔ اس روز جب وہ دن بھر کی مزدوری کا حساب دے چکا تو نمبردار نے اس کا کالر پکڑا اور چار روپے نکال کر غصے سے دھاڑا۔

"سالے! تمہاری یہ ترکیب جانی نہیں" اس نے میتا کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا۔ "کل سے تانگے گھوڑے

کو ہاتھ نہ لگانا۔ اور سالے تنخواہ کا بھی ایک پیسہ نہ ملے گا۔"

میتا نے خوشامد کی۔ گڑگڑایا بھی، نمبر دار ذرا نہ پسیجا۔ صرف اٹھارہ دن کی تنخواہ دے کر علیحدہ کر دیا۔

میتا ایک مدت تک بے کار رہا، پھر شاہجہان پور سے مراد آباد آگیا اور نیو کمراؤن ہوٹل میں ملازم ہو گیا۔ اب وہ میتا تانگے والے سے ہوٹل کا بیرا بن چکا تھا۔ پہلے وہ تانگہ دوڑاتا ہوا سڑکوں پر مارا مارا پھرتا تھا، اب اسے ہوٹل کے کمروں کے چکر کاٹنا پڑتے تھے۔ پہلے وہ بہت گہری نیند سوتا تھا۔ اب رات کو بھی اسے اطمینان نصیب نہ تھا۔ مگر رفتہ، رفتہ وہ اس زندگی کا بھی عادی ہو گیا۔

میتا خاموش لیٹا ہوا اپنی چھدری ڈاڑھی کو خود فراموشی کے عالم میں کھجاتا رہا اور بیتے دنوں کو یاد کرتا رہا، اسی اثناء میں سجانی اور شبر پھر کمرے میں آگئے۔ سجانی نے تاش نکالے اور نعرہ بلند کیا۔

"ہے کوئی مائی کالال۔ اماں، جمتی ہے؟"

شبر نے صاف انکار کر دیا۔ "ابے تیرا ارادہ کیا ہے؟ چار روپے تو میرے سُلو تر پی گیا۔ بے چارے میتا کو بھنگی کر دیا۔ اب تجھے اور کیا چاہیئے؟"

"میتا تو خود ہی میرے سر ہو گیا۔" سجانی ہنسنے لگا۔ "مگر استاد، وہ بُرا نہیں کھیلتا۔"

شبر بھی ہنسنے لگا۔ "ابے ہٹ، کیا بات کر رہا ہے۔ اس سالے کو پتا تک پکڑنے کی تمیز نہیں۔ وہ کیا کھیلے گا؟"

سجانی نے ہاتھ بڑھا کر میتا کو جھنجھوڑا۔ "ابے کیا سو گیا؟"

میتا آنکھیں ملتا ہوا اس طرح اٹھ کر بیٹھ گیا جیسے واقعی سو رہا تھا۔ اس نے خفگی کا اظہار کیا۔ "اماں! سونے بھی دو گے یا نہیں؟"

شبر بے تکلفی سے ہنس کر بولا۔ "جیسے سالے خاں، سچ مچ سو ہی تو رہے تھے۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ تیرہ روپٹے کے غم میں نیند نہیں آرہی تھی۔"

میتا آنکھیں نکال کر بولا۔ "دیکھو جی ٹھیک سے بات کرو۔ ورنہ ساری ہینکڑی ابھی نکال کے رکھ دوں گا۔"

وہ اس طرح بگڑا جیسے واقعی شبر کی بات اسے بُری معلوم ہوئی تھی۔ لیکن سجانی نے اس کی ناراضگی کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔

"ابے تو روتا کیوں ہے۔ اپنا روپیہ لے گا۔ یا کچھ اور۔" اس نے دس روپے کا نوٹ نکال کر سامنے کر دیا مگر میتا خاموش بیٹھا رہا۔

سجانی نے اسے پھر چھیڑا۔ "ارے اب تو ہنس دے۔" اور میتا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ بھی گئی۔ جیسے سچ مچ اس کی ناراضگی کا سبب تیرہ روپے ہی تھے۔

سجانی نے جھٹ اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور میتا کی بے چارگی سے لطف اٹھانے لگا۔ "یوں نہیں استاد ایک شرط ہے۔"

میتا مسکراتا رہا۔ سجانی کہنے لگا۔ "بس بات اتنی ہے کہ تم اپنی داڑھی کی قسم کھالو کہ اب جوا نہیں کھیلو گے۔ پھر یہ نوٹ تمھارا ہے پیارے۔"

میتا کھل کر مسکرا دیا۔ "یار کوئی اور قسم کھلوا لے۔"

لیکن سجانی اڑ گیا۔ "بس اتنی ہی شرط ہے۔"

میتا نے جھینپتے ہوئے کہہ بھی دیا۔ "اچھا بھئی داڑھی کی قسم اب کبھی جوا نہیں کھیلوں گا۔"

لیکن شبر نے اڑنگا لگا دیا۔ "ارے یار یہ روپیہ لے کر کیا کرے گا۔ یہ تو خود ہی بڑا پوڑھا ہے۔"

سجانی ہنسنے لگا۔ "تو پھر آج اسی کے مال سے ذرا عیش ہو جائے۔" اس نے نوعمر بیروں میں سے ایک کو آواز دی۔ "ابے شنے ذرا یہاں تو آئیو۔"

شنے سردی سے سکڑتا ہوا اندر آ گیا۔ سجانی نے نوٹ اس کی طرف بڑھایا۔ "ذرا پاری کی دکان سے لپک کر ایک بوتل تو لا۔ شیر مار کہ کہنا۔"

شنے چلا گیا۔ سجانی باورچی کو آواز دینے لگا۔ "اماں چچا آگ جل رہی ہو تو ذرا آلو تل دینا۔ خوب چٹ پٹے سے۔ آج ذرا رنگ جمے گا۔"

میتا چپ بیٹھا سب کچھ دیکھتا رہا۔ پھر منہ پھیر کر وہ مایوسی کے عالم میں۔ دیوار کے پاس لیٹ گیا۔ لیٹے ہی لیٹے اسے معلوم ہوا کہ شنے بوتل لے آیا ہے۔ پھر بوتل کھلی۔ شراب گلاسوں میں انڈیلی گئی۔ پھر شبر دھیمے سروں میں گانے لگا۔ "پی لے پی لے مورے راجہ۔" سجانی ہونٹوں سے طبلہ بجاتا رہا۔ پھر گانڈو نے آ کر کہا۔

"ابے یہ رنگ بازی ہو رہی ہے پسنجر جو آیا اسے کون دیکھے گا۔"

سجانی بے نیازی سے بولا۔ "اماں! تم بھی اس وقت کہاں آ ٹپکے۔ اس وقت تو ذرا رنگ جم رہا ہے۔"

شبر ہنس کر بولا۔ "میتا کو اٹھالو۔ وہ ابھی سویا نہیں۔" اور جب گائڈ نے میتا کو اٹھایا تو اس کا جی چاہا کہ نہ جائے۔ اپنی ہتک کا لمحہ بھر کے لئے اسے کچھ احساس ہوا۔ پھر وہ آمادہ ہو گیا۔

"یہ سالے تو کافر ہیں۔ نمکحرام کہیں کے۔"

وہ دونوں ٹھٹھا مار کر ہنسنے لگے۔

میتا نے اوپر جا کر تین نمبر کمرہ کھولا۔ گسٹ کا بستر کھول کر پلنگ پر لگا دیا۔ پھر وہ اس کی جانب متوجہ ہوا۔ غور سے دیکھا۔ وہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ ابھری ہوئی مخمور سی آنکھیں اور چہرہ بہت بھاری بھرکم تھا۔ وہ پوچھنے لگا۔

"چائے مل جائے گی اس وقت؟"

میتا نے انکار کر دیا۔ "چائے تو اب نہیں مل سکے گی۔"

وہ مسکرانے لگا۔ "کچھ اور ملے گا؟" اس کی مسکراہٹ ذرا بے باک ہو گئی۔ "تمھارے ہوٹل کی تو بہت شہرت سنی ہے۔ یہاں تو سب کچھ مل جاتا ہے۔"

"لیکن صاب اب تو بہت رات ہو گئی۔"

وہ بدمعاشی سے آنکھ مار کر بولا۔ "کہاں بہت رات ہو گئی۔ ابھی تو گیارہ بھی نہیں بجے۔" وہ پھر مسکرا دیا۔ اس کی مسکراہٹ میں بے باکی بھی تھی اور بے حیائی کا چھچھورا پن بھی تھا۔ "کسی کو لے آؤ۔ تم کو بھی خوش کر دونگا۔"

میتا اس سے وعدہ کر کے باہر آ گیا۔ اس نے کونے والے کمروں کی طرف دیکھا۔ جہاں اندھیرا گہرا تھا۔ لیکن ایک کمرے سے ہلکے ہلکے قہقہے ابھر رہے تھے۔ وہ اسی طرف چل دیا۔ قریب پہنچا تو برابر والے کمرے سے کسی نے آواز دی۔

"ابے کون ہے۔ ذرا یہاں تو آنا۔"

میتا نے اندر جا کر دیکھا۔ ڈیری والا قادر، جو ہوٹل میں دودھ اور مکھن سپلائی کرتا تھا، ریلوے کے

دو گارڈوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ سامنے میز پر خالی بوتل تھی اور کچھ پلیٹیں بکھری ہوئی تھیں۔

قادر نے کہا: "ذرا لپک کر دو گلاس تو لانا۔" لیکن مینا آمادہ نہ ہوا۔

"ساب میں گلاس نہیں لاؤں گا۔ آپ توڑ ڈالتے ہیں۔ اور گلاس لگتے میرے نام ہیں۔"

قادر کے منہ سے گلاس لگا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ روک کر مینا کی طرف دیکھا۔ جھنجھلا کر پورا گلاس اس کی طرف اچھال دیا۔ شراب کے قطرے اس کے چہرے پر سے پھسلتے ہوئے کپڑوں پر بکھرنے لگے۔ مینا نے غرا کر قادر کی طرف دیکھا۔ مگر کچھ کہہ نہ سکا۔ قادر مالدار ہونے کے علاوہ چودھری کا ملنے والا بھی تھا۔ وہ صرف خشمگیں نگاہوں سے اسے گھورتا رہا۔ قادر نے اسے دیکھا۔ ہنستا ہوا اٹھا اور اس کے پاس پہنچ گیا۔

"ابے بگڑ گیا کیا؟ جا بے تو بھی یونہی رہا۔ ارے یہ تو پیار کی باتیں ہیں پیار کی۔ کیا سمجھا؟" قادر نے جیب سے ایک روپے کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ "لے، اسے رکھ لے۔"

مینا اس طرح خاموش کھڑا رہا جیسے ابھی تک اس کا غصہ برقرار تھا۔ قادر اس کے اور قریب آ گیا۔ گلے میں باہیں ڈال کر بولا: "واہ میری جان اتنی سی بات پر دل توڑ دیا۔ تو، تو اپنا جگر ہے۔"

مینا کا غصہ دم توڑ کر فنا ہو گیا۔ اس کے ہونٹ پھڑپھڑائے۔ وہ ابھرتی ہوئی مسکراہٹ دبانے کیلئے ہونٹوں کو بھینچنے لگا۔ قادر نے جیب سے دس روپے کا ایک نوٹ اور نکالا۔ "گلاس اور سوڈا تو تم لے ہی آؤ گے۔ ایک بوتل تھری ایکس رم اسٹیشن جا کر کلنر سے لے لینا۔ گارڈ صاحب کا نام لو گے تو بڈھا چپ چاپ دے دیگا۔ سمجھ گئے نا۔ اب لپک کے جاؤ میری جان، دیر نہ ہو ورنہ رنگ پھیکا پڑ جائے گا۔"

مینا نے نوٹ سنبھالے اور کمرے سے باہر آ گیا۔ اس نے شراب سے بھیگا ہوا اپنا چہرہ پونچھا۔ ایک روپے کا نوٹ اندر کی جیب میں رکھا۔ آگے بڑھا۔ زہرہ کے کمرے پر جا کر آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ذرا دیر بعد وہ دروازے پر آ گئی۔

"کیا ہے؟"

مینا حسب معمول آنکھیں پیچ کر ہنسنے لگا۔ "بڑی بھولی ہو۔ جیسے جانتی ہی نہیں کہ اتنی رات گئے میں کیوں آیا ہوں۔"

زہرہ نے صاف انکار کر دیا۔ "میں اس وقت کہیں نہیں جاؤں گی۔"

میتا خوشامد کرنے کے انداز میں بولا۔ "ارے تین نمبر تک تو چلنا ہی ہے۔"

زہرہ کے کندھے کی آڑ سے اچانک سجانی کا سر ابھرا۔ سیتا نے اسے دیکھا تو بہت سٹ پٹایا۔ حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔ "اماں سجانی تم یہاں کیسے؟"

سجانی ہنسنے لگا۔ "تم یہاں کیسے؟ ابے آج ہم زہرہ کے پاس رہیں گے۔"

میتا کھسیانا ہو کر اپنا سر کھجانے لگا۔ سجانی نے اسے گھور کر دیکھا۔ اور آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگا۔ "زہرہ آج کہیں نہیں جائے گی۔" اس کی آواز نشے سے لڑکھڑا رہی تھی۔ "خاما خا پریشان کرنے چلا آیا۔ سالے بھڑوں کو ہر وقت اپنے کمیشن کی ہی پڑی رہتی ہے۔" اس نے زہرہ کو اندر کھینچ کر زور سے دروازہ بند کر دیا۔ میتا کو محسوس ہوا کہ دروازے کا شور اس کے ذہن میں دھماکہ کی طرح پھٹنے ہی والا ہے۔ وہ چند لمحے تک رکی رکی سانس لیتا رہا اور دروازے کو تکتا رہا۔ پھر وہ مڑا۔ آگے بڑھا اور زینے کی سیڑھیاں طے کرتا ہوا نیچے اترنے لگا۔

سڑک پر آکر اس نے دیکھا، بارش بند ہو چکی تھی۔ ہوا بہت تیکھی تھی اور جب کوئی زور کا جھکڑ آتا تو پیپل کے نیچے، پتوں سے موٹی موٹی بوندیں ٹپکنے لگتیں۔ سامنے اسٹیشن کی برساتی کے نیچے تانگے کھڑکھڑاتے ہوئے گزر رہے تھے۔ مگر وہ بالکل خالی الذہن تھا۔ سردی کی ہلکی سی تھرتھراہٹ اور کچھ یونہی سی ہل چل جس میں نہ تو ہوا کے شوریدہ سر جھکڑوں کی تیزی تھی۔ نہ چیختے ہوئے تانگوں کی کھڑکھڑاہٹ۔

میتا اسٹیشن کی طرف چل دیا۔ ہوا کے جھکڑ شور مچاتے رہے۔ بارش سے بھیگے ہوئے درختوں کے پتوں سے بوندیں ٹپکتی رہیں۔ تانگے کھڑکھڑاتے ہوئے گزرتے رہے۔ میتا کے برابر سے سگریٹ کے کش لگاتا ہوا ریلوے کا ایک بابو گزرا۔ میتا کو بھی بیڑی پینے کی طلب ہوئی۔ ماچس اس کے پاس موجود نہ تھی۔ بیڑی سلگانے کے لئے اس نے بابو کو ٹوکا۔

"بابو جی! ذرا سنئے۔"

اس نے گھوم کر میتا کو دیکھا۔ جلدی سے ایک اکنی جیب سے نکالی اور میتا کی ہتھیلی پر رکھ دی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

میتا نے ٹھنڈی، ٹھنڈی اکنی انگلیوں میں بھینچی۔ پھر ہتھیلی کھول کر اکنی کو دیکھا۔ حیرت سے چونکا اور

غصّہ سے بڑبڑانے لگا۔ آخر اس سالے نے مجھے سمجھا کیا۔" اس نے گردن جھکا کر ایک نظر خود پر ڈالی۔ اپنے لمبے اوورکوٹ پر انگلیاں پھیریں۔ کالر کو گردن تک اونچا کیا اور ذرا تن کر کھڑا ہو گیا۔ پھر وہ مسیتا نہیں رہا۔ ایک دم مسیت خان بن گیا۔ جو اوورکوٹ پہنے ہوئے تھا۔ جس کی جیب میں گیارہ روپئے تھے۔ لیکن یہ اکنی اور اکنی کے احساس نے اس کے شانوں میں پھر جھکاؤ پیدا کر دیا۔ وہ جھلایا ہوا اس طرف لپکا جدھر ریلوے کا بابو گیا تھا۔

مسیتا نے تلملا کر اکنی سڑک کے کنارے ڈال دی۔ اور پھر اس پر بیٹھ کر پیشاب کرتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔

"لے سالے بڑا سخی بن کر آیا تھا۔ کہیں سے پھوکٹ کی رقم ہاتھ لگ گئی ہو گی۔ لگے سالے خاں اترانے۔ اَخ تھو!" وہ زمین پر تھوک کر اٹھ کھڑا ہوا۔

مہکتی وادیوں میں

بھوٹان کا کوہستانی علاقہ، گندے اور بھورے پربت کا طویل سلسلہ ہے، جو حدِ نظر تک ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بھوٹان دیش کی زخمی پیٹھ پر خارش زدہ کوبڑ نکل آیا ہو۔ ان ہیبت ناک پہاڑوں کی تلیٹی میں نیلگوں ڈھلوانوں پر الجھے ہوئے گیسوؤں کی طرح دور، دور تک مہکتے ہوئے چائے کے باغات ہیں، یہ میلوں تک پھیلا ہوا ڈیوپاریس کا نشیب گہری وادیوں میں لہراتا ہوا آسام کی سرحد سے مل گیا ہے۔

چائے کے باغوں میں کام کرنے والے عام طور پر بھوٹان کے باشندے نہیں ہوتے۔ وہ مہیشی منڈا، بلاس پور اور چھوٹا ناگپور کے رہنے والے ہیں۔ ان کے بلے بال چوٹی میں گندھے ہوتے ہیں۔ مضبوط کلائیوں میں لوہے کے کڑے پہنتے ہیں۔ ان کی چوڑی چکلی پیٹھ گوشت سے بھری ہوتی ہے، جو ترائی کی مرطوب ہوا سے سوکھ جاتی ہے۔ چائے کے باغوں میں منڈلانے والی ملیریا کی خونخوار وبا ان کے گٹھے ہوئے ٹھوس جسموں کو توڑ پھوڑ کر پگھلا دیتی ہے۔ چائے کی پتیاں جھک کر چنتے چنتے ان کی چوڑی چکلی پیٹھ خم کھا کر ابھر آتی ہے۔

چائے کے باغوں میں کام کرنے کے لئے ان کو ریل گاڑیوں میں بھر بھر کر لایا جاتا ہے۔ پندرہ بیس برس تک کڑی محنت کرنے کے بعد ان کو چھٹی مل جاتی ہے۔ وہ واپس اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔ مگر کچھ ہی عرصہ بعد لوٹ آتے ہیں اور ٹھیکیدار کے چمکتے ہوئے جوتوں کو چوم کر گڑگڑاتے ہیں۔

"گھر پر کھیتی باڑی، کچھ بھی نہیں۔"

"کوئی کام وام بھی نہیں۔"

"کیا کریں ساب۔ اگر یہاں محنت نہ کریں تو کہاں جائیں"

"ساب کی مہربانی چاہئے"

وہ اپنے دھنسے ہوئے پیٹوں کو برہنہ کرکے دکھاتے ہیں اور مریل کتوں کی سی تیز حریصانہ نظروں سے ٹھیکیدار کو دیکھتے ہیں۔ مگر وہ نہ تو پسلیوں میں دھنسے ہوئے پیٹوں پر کوئی توجہ دیتا ہے۔ اور نہ تیز حریصانہ نظروں کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لئے کہ اب وہ کڑی مشقت نہیں کر سکتے۔ ان کے کڑیل جسموں کو ملیریا نے توڑ پھوڑ کر پگھلا دیا ہے۔ ان کی چوڑی چکلی پیٹھ مرطوب ہوا سے سوکھ گئی ہے اور ابھری ہوئی ہڈیوں پر صرف جھلسی ہوئی کھال منڈھی ہے۔ ٹھیکیدار کو ان مریل جسموں کی ضرورت نہیں۔ وہ ان کو اب کام نہیں دے سکتا۔ صرف گالیاں دے سکتا ہے۔ اور یہ دھتکارے ہوئے لوگ پھاٹک کے پاس کھڑے ہو کر سامنے سے گزرتے ہوئے قلیوں کی قطار کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتے رہتے ہیں، جن کی پشت پر بید کی ٹوکریاں لٹک رہی ہیں۔ اور جو آہستہ آہستہ چلتے ہوئے چائے کے باغوں کی طرف جا رہے ہیں۔

گورکھا چوکیدار ان کو دیکھتے ہی غضب ناک ہو جاتا ہے۔ اپنی سنگین سنبھال کر ان کی طرف چیختا ہوا جھپٹتا ہے۔

"بھاگو! بھاگو، بڑا ساب آنے والا ہے"

اور یہ ٹھیک بھی ہے بڑا صاحب ان کو دیکھ کر بہت ناراض ہوتا ہے۔ وہ اس کے آنے سے پہلے ہی ہٹ کر دور کسی درخت کے نیچے جا کر اکٹھا ہو جاتے ہیں۔ کچھ دیر خاموش بیٹھے رہتے ہیں۔ پھر کوئی دھنسی ہوئی آواز میں پوچھتا ہے۔

"اب کیا ہوگا؟"

"....."

"بولو نا اب کیا ہوگا؟"

مگر کوئی نہیں بولتا۔ کوئی نہیں جواب دیتا۔ حالانکہ ان کی بجھی بجھی آنکھوں میں یہی سوال جھلک رہا ہے۔ جھلسے ہوئے چہروں پر یہی خیال تار عنکبوت کی طرح چھایا ہوا ہے۔ یہ چھوٹا ناگپور کے باشندے ہیں جن کی

تلاش میں کمپنی کے دلال گدھوں کی طرح بستیوں میں منڈلایا کرتے ہیں۔ کوئی بیس برس ادھر کی بات ہے۔ جب ان کی بستی میں ایک اجنبی آیا تھا۔ اس کے خاکی کوٹ میں پیتل کے بٹن جھلملا رہے تھے۔ گلے میں گلٹ کی خوبصورت زنجیر پڑی تھی۔ پیروں میں وزنی جوتے تھے جن میں لوہے کی نالیں جڑی تھیں اور جو چلنے کے دوران میں پتھروں سے ٹکرا کر زور زور سے بجتی تھیں۔ جھکے ہوئے جھونپڑوں میں بسنے والے نیم وحشی لوگ، اجنبی کے گرد بن بلائے اکٹھا ہو گئے تھے۔ عورتیں دروازوں سے چمٹی ہوئی کھڑی تھیں اور شور مچاتے ہوئے بچے خوفزدہ نظر آ رہے تھے۔ یہ اساڑھ کی ایک سلگتی ہوئی سہ پہر تھی۔ آسمان پہ گہرا غبار چھایا تھا۔ تیز ہوا کے گرم بگولے چٹیل میدانوں میں رقصاں تھے۔ اجنبی نے گیروے رنگ کی سخت اور خشک زمین کو تیکھی نظروں سے دیکھا اور اس پر تھوکر مار کر بولا۔

"بارش کب سے نہیں ہوئی؟ کھیتی باڑی کا کیا حال ہے؟"

انھوں نے مویشیوں کی طرح گردن اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور بتانے لگے۔

"کھیتی باڑی کچھ بھی نہیں۔"

"دھان وان بھی نہیں رہا۔"

"زمین بھی چھین لی گئی۔"

اجنبی مسکرانے لگا۔ اپنی گھنی مونچھوں پہ تاؤ دے کر بولا "کام چاہتے ہو؟" اس نے منجھے ہوئے دلال کی طرح گردن اکڑا کر ان کی جانب بے نیازی سے دیکھا۔

سب ملی جلی آواز میں حیرت سے چیخ اٹھے۔

"کام؟"

دلال چند لمحے تک اطمینان سے مسکراتا رہا۔ پھر آواز پر زور دے کر بولا "ہاں کام۔ محنت کرو گے پیسہ ملے گا۔ پھر چین کی بنسی بجے گی۔"

چھوٹا ناگپور کے نیم وحشی باشندے ذرا دیر حیرت کے عالم میں خاموش رہنے کے بعد راضی ہو گئے۔ "ہم محنت کریں گے۔" انھوں نے اپنے گٹھے ہوئے کڑیل جسموں کو پھیلا دیا اور تن کر کھڑے ہو گئے۔ پیتل کے بٹنوں والا

دلّال برابر مسکراتا رہا۔

اس طرح مضبوط جسموں والے نوجوانوں کو آمادہ کر کے کسی ایک مقام پر اکٹھا کیا جاتا۔ سب کو ایک ساتھ اسٹیشن پر پہنچایا جاتا۔ کمپنی کا دلال زرد رنگ کے ٹکٹ خرید کر اپنے خاکی کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیتا۔ اور جیسے ہی ریل گاڑی آتی انھیں ڈبوں میں ٹھونسنا شروع کر دیتا۔ وہ ٹرین میں سوار ہونے سے قبل ایک بار اتنا ضرور پوچھتے۔

"ہم کو کہاں لے جا رہے ہو؟"

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

دلّال مسکرا کر جواب دیتا۔ "محنت کرو گے، پیسہ ملے گا۔ پھر چین کی بنسی بجے گی۔ کیا سمجھے؟"

پھر گویا وہ سب کچھ سمجھ جاتے۔ ان کے خوفزدہ چہروں پر اطمینان جھلکنے لگتا۔ وہ مسکرانے لگتے اور ان میں سے کسی کی آواز بلند ہوتی۔ "محنت کریں گے پیسہ ملے گا۔ ہڑ یا پئیں گے۔ کیا کہتا ہے بودھن؟"

بودھن کھلکھلا کر ہنسنے لگتا۔ دوسرے بھی ہنسنے لگتے۔ ٹرین ہچکولے کھاتی ہوئی چل دیتی۔ پھر ان جان پہاڑیاں، تاریک کھڈ، اجنبی لوگ اور پھر چائے کے باغوں کا میلوں تک پھیلا ہوا سلسلہ!!

سب سے پہلے ان کو ٹھیکیدار کے سامنے پیش کیا جاتا۔ وہ ذبح ہونے والے جانوروں کی طرح ان کے جسموں پر چڑھی ہوئی گوشت کی تہوں کو ٹٹول، ٹٹول کر دیکھتا۔ اس معائنہ میں جو پورا اترتا، اسے پیچھے کی طرف ڈھکیل دیا جاتا۔ اس سے اگریمنٹ فارم پر انگوٹھے کا نشان لگوا لیا جاتا۔ اب پندرہ سال تک وہ اپنے گھر واپس نہیں جا سکتا۔ اگریمنٹ میں یہی لکھا ہوتا ہے۔

۲

قلی اسی طرح ٹرین کے ڈبوں میں بھر بھر کر ڈبو یارس کے علاقہ میں آتے ہیں۔ ان کو سینکڑوں ایکڑ رقبے پر پھیلے ہوئے چائے کے باغات کی حدود میں ایک بار داخل ہونے کے بعد باہر قدم نکالنے کا حکم نہیں۔ اگر کوئی قلی فرار ہونے کی کوشش کرتا ہے تو چوکیداروں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر حراست میں واپس آجاتا ہے۔ بڑے

بابو اسے کڑی نظروں سے گھور کر پوچھتے ہیں۔

"بھاگ کر گیا تھا؟"

"ہاں ساب غلطی ہو گئی۔ اب ایسا نہیں ہو گا۔ مہربانی چاہیئے۔" قلی ہاتھ جوڑ کر گڑگڑاتا ہے۔

مگر بڑے بابو ذرا مہربانی نہیں کرتے۔ چائے کے باغوں میں اس کا رواج نہیں۔ بڑے صاحب کا حکم نہیں، بھاگنے والے قلی کی گردن میں وزنی پتھر لٹکا دیا جاتا ہے، جسے لٹکائے ہوئے سزا کی میعاد پوری ہونے تک اسے کام کے گھنٹوں کے دوران میں سیدھی ڈھلوانوں پر چلنا پڑتا ہے۔ اتنے دنوں تک اس کی غیر حاضری لگائی جاتی ہے۔ اس غیر حاضری کا مطلب ہے۔ بھوکے رہنا مسلسل فاقہ کشی اور تنگ دستی۔

باغوں کی سرحدوں پر لوہے کے تیز نوکیلے کانٹوں سے مضبوط حصار بنا دیا گیا ہے جس کی سخت نگرانی کی جاتی ہے۔ پہریدار چوبیس گھنٹے گشت کرتے رہتے ہیں۔ اس مضبوط حصار کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے باغوں کا یہ سلسلہ ایک آہنی جیل خانہ ہے، جس کے اندر لڑکے لڑکیاں، جوان اور بوڑھے انسانوں کا ہجوم منڈلایا کرتا ہے۔ کسی غلیظ جوہڑ کی طرح اس کی گندگی بڑھتی جاتی ہے تاڑی پی کر پہلے تو قلی خوب شور مچاتے ہیں۔ پھر آپس میں لڑنے لگتے ہیں۔ مگر جب رات ڈھل جاتی ہے اور سنسان باغوں کے گرد چوکیداروں کی آوازیں گیدڑوں کی طرح ابھرنے لگتی ہیں تو کوئی نیند کی ماتی مدھم آواز میں گانے لگتا ہے۔ اس طرح ڈیویارس کے علاقہ میں چھوٹا ناگپور اور بلاس پور کے مقبول عوامی آرٹسٹ اور سماں جنگلی راگوں کی تانیں شب کے سناٹے میں عام طور پر سنائی دیتی ہیں۔

قلی دن بھر باغوں میں کام کرتے ہیں۔ اور رات کو تاڑی پیتے ہیں، آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں۔ زندگی ان ہنگاموں میں گزرتی جا رہی ہے۔ اور بازار میں دھان کا بھاؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ تیرہ روپے جیب میں ہوں تو چالیس سیر دھان مل سکتا ہے۔

قلی کبھی کبھی اکٹھا ہو کر مہنگائی پر باتیں بھی کر لیتے ہیں۔

"دھان روپے میں تین سیر ملتا ہے۔"

"پانچ آنے روز مزدوری ملے گی تو کیا کھائیں گے؟"

"کیا پہنیں گے، کیا اوڑھیں گے؟"

"کیا کریں گے، کیسے رہیں گے؟"

جو قلی ایسی باتیں سوچتے ہیں، ان کی آنکھوں میں ہر دم خوف سمایا رہتا ہے۔ وہ گھبرائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ باغیچہ کے گودام کی جانب انگلی اٹھا کر بے چینی سے پوچھتے ہیں۔

"وہاں کتنا دھان رکھا ہے؟"

"یہ کس واسطے اکٹھا کیا گیا ہے؟"

مگر ان کو کوئی جواب نہیں ملتا۔ قلیوں میں پھیلتے ہوئے اس چرچے کا کسی پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ بلکہ سال بھر کے اندر چائے کے باغیچہ میں ایک اور گودام کھڑا ہو جاتا ہے۔ چائے کا نہیں دھان کا گودام۔ خاص محل کے گنجان جنگلوں میں بسنے والے جوت داروں کے کھلیانوں سے ہزاروں من دھان، لاریوں میں لد لد کر آتا ہے۔ اور رات کے سناٹے میں گودام سے نکل کر کسی انجان جگہ چلا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں کوئی بھی نہیں جانتا۔ البتہ گودام کے آہنی دروازے پر ڈبل پہرہ بٹھا دیا گیا ہے۔ بھدے چہروں والی نوجوان لڑکیاں اپنے گندے لباسوں میں گودام کے پاس اکٹھا ہو کر باغ بابو سے پوچھتی رہتی ہیں۔

"بھلا تین سیر راشن میں کتنے آدمی کھا سکتے ہیں؟"

"اور یہ دھان کس لئے گودام میں اکٹھا کیا جا رہا ہے؟"

"یہ دھان رات کو کہاں جاتا ہے؟"

باغ بابو انکی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیتا۔ بلکہ بدمعاشی سے آنکھ مار کر مسکرانے لگتا ہے۔

اتوار کے روز کمپنی کی جاگیر میں بازار لگتا ہے۔ میلوں تک پھیلے ہوئے ڈیو پارس کے علاقہ میں ہفتہ بھر میں ایک روز کام نہیں ہوتا۔ اس دن چھٹی رہتی ہے۔ سب قلی بازار میں جمع ہوتے ہیں۔

کانوں کے بڑے بڑے سوراخوں میں لال کاغذ کے گہنے پہن کر، پیٹھ پر بچوں کو باندھ کر اور روکھے بالوں میں تیل لگا کر نوجوان قلی عورتیں بازار میں گھومتی پھرتی ہیں۔ وہ کسی سے کچھ کہتی سنتی نہیں۔ بس خاموشی سے ادھر، ادھر چکر کاٹتی رہتی ہیں۔ دھان کے بھاؤ سے گھبرا کر مرد بازار سے دور جا کر پیڑوں تلے بیٹھ جاتے ہیں اور

خشک تمباکو کے چرٹ بنا کر طویل کش لگاتے ہیں۔ دھول کے غبار میں ان کے چہرے خواب کی پرچھائیوں کی طرح بے جان نظر آتے ہیں ہر شخص کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ پھر سوچتے سوچتے باتیں شروع ہو جاتی ہیں۔ پھر باتوں کی آوازیں اونچی ہو جاتی ہیں۔ کچھ قلی بے وجہ دوسرے قلیوں سے کتوں کی طرح غرا کر جھگڑنے لگتے ہیں۔ اس ہنگامے سے پریشان ہو کر کتنے ہی قلی مہنگے بھاؤ میں دھان خرید لیتے ہیں۔

دن اسی طرح گزرتا جا رہا ہے۔ بازار کی گہما گہمی سست پڑتی جا رہی ہے۔ قلی بازار سے لوٹتے ہوئے آپس میں باتیں کرتے ہیں۔

"دیش میں یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"روپئے میں تین سیر دھان"

"ان لوگوں نے گودام پر پہرہ کیوں بٹھا دیا ہے؟"

"اور یہ چوکیدار کیوں بڑھائے جا رہے ہیں؟"

وہ اسی طرح باتیں کرتے ہوئے گھروں کو جا رہے ہیں۔ شکرا منڈ خاموش بیٹھا ہوا ان کی باتیں سن رہا ہے۔ اس نے ابھی تک دھان نہیں خریدا۔ سرمئی پتھر سے تراشے ہوئے مجسمہ کی طرح اس کے ٹھوس چہرے پر سنجیدگی کے آثار ہویدا ہیں۔ وہ چپ بیٹھا ہوا خود پر جھنجھلا رہا ہے۔ چھریرے جسم پر دھوتی کا پھینٹا کس کے باندھے ہوئے وہ قرونِ وسطیٰ کا کوئی شکاری معلوم ہوتا ہے۔ اس لنگوٹی کے نیچے دو مضبوط پاؤں خزاں رسیدہ شاخوں کی طرح کھردرے اور سخت نظر آ رہے ہیں۔ پنڈلیوں کی مچھلیوں پر سانپ کی طرح کالی نسوں کا جٹ سکڑ کر اونچا ہو گیا ہے۔ خریدار اب بازار سے گھروں کو واپس جا رہے ہیں، شکرا سوچ رہا ہے کہ ایک روپیہ دیکر تین سیر دھان کیوں خریدا جائے۔

خاص محل کے دیسی ادھیار کسان، خالی بوریاں بغل میں دبائے ہوئے وحشت اور پریشانی کے عالم میں بازار کا چکر کاٹ رہے ہیں۔ بیکاروں نے بوریاں کھول کر جگہ جگہ دھان کی ڈھیریاں لگا رکھی ہیں۔ ہوا کا جھونکا آتا ہے۔ دھان کے اوپر کی دھول اڑ جاتی ہے۔ صاف چمکتے ہوئے اجلے اجلے دھان نظر آنے لگتے ہیں۔ بازار میں چپ چاپ گھومتے گھومتے کچھ دیسی ادھیار کسان، کانپتے ہاتھوں میں میلے نوٹ لیکر

آگے بڑھتے ہیں اور دھان کی ڈھیری کے سامنے بیٹھ کر اپنی بوری کا منہ دونوں ہاتھوں سے کھول دیتے ہیں، تیکھی نظروں سے ترازو کی طرف دیکھتے ہیں کہ کہیں بیکار ڈنڈی مار کر کم نہ تول دے۔ بیکار نوٹ لے کر کھلے منہ والی بوری میں جتنا دھان ڈال دیتا ہے، اس سے ایک کونا بھی نہیں بھرتا۔

بازار میں اب سناٹا ہو گیا ہے۔ سب لوگ گھروں کو جا چکے ہیں، صرف شکرا منڈا بازار میں ابھی تک کھڑا ہے۔ اس نے جیسے دھان نہ خریدنے کی قسم کھالی ہے، پھر نہ جانے کیا سوچ کر وہ مڑا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا تاڑی خانے میں گھس گیا۔

جب تاڑی خانہ سے باہر نکلا تو اس کے دونوں پیر آندھی میں جھولتے ہوئے شال کے پیڑ کی طرح کپکپا رہے تھے۔ منہ کے کونوں میں تاڑی کا سفید، سفید پھینا اب تک لگا تھا۔

جن لوگوں نے دھان خرید لیا ہے یا نہیں خرید سکے، وہ سب جا چکے ہیں۔ بازار اب بالکل سنسان ہو گیا ہے۔ شام کا دھندلکا پھیلتے ہی مان سنگھ چائے والے کی دکان پر روشنی جھلملانے لگی ہے۔ شکرا منڈا اس کی دکان پر پہنچ گیا۔ اور بے ڈھنگے پن سے کہنے لگا۔

"ہم چاء پئیں گے۔ ہم کو چاء دو"

یہ کہتا ہوا وہ دکان کے سامنے رکھی ہوئی بنچ پر اونچا ہو کر بیٹھ گیا۔ مان سنگھ چپ چاپ چولہے کے سامنے کھڑا ہو کر چائے بنانے لگا۔ اس وقت بھی وہ اپنی لنگڑی ٹانگ پر جھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کا کبڑا سایہ سامنے والی دیوار پر بڑا ڈراؤنا معلوم ہو رہا تھا۔

مان سنگھ بھوٹان کا رہنے والا ہے۔ اس کے جسم پر زخموں کے بڑے بدنما داغ ہیں، جن کو وہ اپنے بلے کرتے کے اندر بڑی احتیاط سے چھپائے رکھتا ہے۔ پچھلے بھادوں کا ذکر ہے۔ جب وہ بھی چائے کے باغوں میں کام کرتا تھا۔ یہی اتوار کا دن تھا۔ تلیوں کی چھٹی تھی۔ وہ بہت تڑکے ہی اپنے گاؤں چلا گیا تھا۔ گاؤں سے لوٹتے لوٹتے دن ڈھل گیا۔ شام کے بڑھتے ہوئے دھندلکے میں درختوں کے سائے طویل ہو گئے تھے۔ مان سنگھ پتھریلے راستوں پر تیز تیز قدموں سے چل رہا تھا۔ چائے کے باغیچوں کے مالک اس روز جنگلوں میں شکار کھیل رہے تھے۔ یکایک شام کے سناٹے میں بندوقیں چلنے کی آوازیں گونجیں اور گولیاں درختوں تلے

سنسناتی ہوئی گزریں۔ شکاری پتھروں کو روندتے ہوئے اس سمت بھاگے، جہاں آہٹ ہوئی تھی اور ایک دھندلا، دھندلا سایہ نظر آیا تھا۔ مگر یہ کوئی جنگلی جانور نہ تھا۔ بلکہ مان سنگھ تھا جو خون میں ڈوبا ہوا بے سدھ پڑا تھا۔ شکاریوں میں چائے کے باغات کا انگریز مالک مسٹر مائیکل بھی شامل تھا، جس کو بڑے صاحب کہا جاتا تھا۔ بڑے صاحب کو دیکھتے ہی وہ جھٹ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مان سنگھ کی جان ایک سخت جان پہاڑی قلی کی جان تھی۔ لہٰذا اس نے مرنے سے انکار کر دیا۔ بڑے صاحب کو مان سنگھ پر بڑا غصہ آیا اور اس لئے غصہ آیا کہ سب سے پہلے انہوں نے گولی چلائی تھی۔ شکار پر ان کا حق سب سے زیادہ تھا۔ مگر وہ مان سنگھ پر ناراض نہ ہوئے۔ دس روپے بخشش دیکر صرف اس قدر کہا۔ "بھاگ جاؤ! تم ہماری شکار گاہ میں کیوں چلے آئے؟" مان سنگھ نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ بلکہ احمقوں کی طرح ہاتھ اونچا کر کے اس وقت بھی اس نے بڑے صاحب کو سلام کیا تھا۔ دس روپے پا کر وہ اپنے چہرے پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر اس کوشش میں اس نے اپنے چہرے کو اور بگاڑ لیا تھا۔ اس روز سے اس کے چہرے پر خوف کا ایک مہیب سایہ چھا گیا تھا۔ چلنے میں ہر قدم پر اس کی ایک ٹانگ سمٹ کر جھک جاتی تھی۔ اب وہ لنگڑا کر چلتا تھا۔

چائے بن کر تیار ہو گئی۔ چائے خانہ کی پستہ قد لڑکی نے شکر امنڈا کے سامنے چائے کی پیالی رکھی اور دور جا کر کھڑی ہو گئی۔

شکر امنڈا مزا لے، لے کر چائے کے گھونٹ بھرنے لگا۔ اسی اثنا میں سوبھا ناتھ اندھیرے سے نکل کر چائے خانہ کی دھندلی، دھندلی روشنی میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے بال گرد سے بھورے پڑ گئے تھے۔ تکان سے چہرہ بیماروں کی طرح نڈھال نظر آ رہا تھا۔ مان سنگھ نے اسے دیکھ کر دکان کے اندر ہی سے پوچھا۔

"کہاں رہے تمام دن؟"

سوبھا ناتھ نے بتایا۔ "انگٹانگ کے باغوں کی طرف گیا تھا۔ وہاں قلیوں کا راشن کاٹ دیا گیا ہے۔ یہ خبر ملتے ہی گنج کے دکانداروں نے ایک دم سے دھان کا بھاؤ بڑھا دیا۔"

مان سنگھ نے اس کی بات سن کر کوئی تبصرہ نہ کیا۔ کہنے لگا۔ "اچھا پہلے تم کچھ کھا پی لو۔ بھلا اب تک کھانے کو کیا ملا ہوگا؟"

سوبھاناتھ تھکا ہوا سا شکرا کے برابر بنچ پر بیٹھ گیا۔ شکرا نے اسے دیکھا تو گھبرا کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ دراصل وہ سوبھاناتھ پر یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا کہ وہ تاڑی پیئے ہوئے ہے۔ شکرا نے ایسا کسی خوف سے نہیں کیا بلکہ ڈیلو یارس کے علاقہ میں کام کرنے والا ہر قلی سوبھاناتھ کی عزت کرتا ہے۔ سوبھاناتھ مان سنگھ کی دکان کے پچھلے حصہ میں رہتا ہے۔ تمام دن قلیوں کی بستیوں میں مارا مارا پھرتا ہے۔ اور رات کو چائے خانے کے جھکے ہوئے سائبان تلے بیٹھا ہوا قلیوں کے ساتھ بے تکلفی سے باتیں کیا کرتا ہے۔ ہنستا ہے۔ قہقہے لگاتا ہے۔ جب سے وہ یہاں آیا ہے۔ قلیوں کے لئے دلچسپی کا سامان پیدا ہو گیا ہے۔ تھوڑی دیر کیلئے وہ اپنے دکھوں کو بھول کر زندگی میں ایک اُمنگ محسوس کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر تاش کھیلتے ہیں۔ کہانیاں سنتے ہیں۔ کبھی کوئی پہاڑی قلی جھوم جھوم کر اپنی بنسری بجانے لگتا ہے۔ کبھی چھوٹا ناگپور کے قلی سمان جنگلی اور آدیواسی راگوں کو چھیڑ دیتے ہیں۔ سوبھاناتھ کو ڈیلو یارس کے علاقہ کا ہر قلی جانتا ہے، ہر ایک سے اس کی جان پہچان ہے۔ ہر قلی اس کی عزت کرتا ہے۔ ہر قلی اس کو اپنا سمجھتا ہے۔

سوبھاناتھ نے شکرا کو خاموش دیکھ کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "کیا حال چال ہے شکرا؟"

شکرا سے اب بھی نہ بولا گیا۔ سوبھاناتھ نے پھر کہا۔ "بازار میں دھان کا کیا حال رہا؟"

اس دفعہ شکرا نے بغیر منہ موڑے ہوئے جواب دیا۔ "میں نے دھان نہیں خریدا۔ تین سیر کا دھان میں نہیں خرید سکتا۔ میں دھان کیوں خریدوں؟"

سوبھاناتھ نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ شکرا جھنجھلایا ہوا ہے۔ اس نے شکرا کی پیٹھ پیار سے تھپ تھپا کر آہستہ سے کہا۔

"ٹھیک ہے پر کل بال بچے کیا کھائیں گے۔ تم کیا کرو گے؟"

شکرا اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "میں نے تو ہڑیا پی ڈالی۔ سالا تین سیر کا دھان کیوں خریدا جائے۔"

سوبھاناتھ مسکرانے لگا۔ "اچھا، اچھا آؤ بیٹھو تو۔"

مگر شکرا کو پھر خود ہی خیال آ گیا کہ اس نے ہڑیا پینے والی بات کیوں کہہ دی۔ وہ گھبرا کر آگے بڑھا اور لڑکھڑاتے قدموں سے چلتا ہوا قلی لائن کی طرف روانہ ہو گیا۔

۳

سوموار سے دوسرا دن شروع ہو جاتا ہے۔ اتوار کو بازار میں چاہے کوئی دھان خریدے یا نہ خریدے یا صرف تاڑی پی کر لوٹ آئے، مگر سویرے اُٹھ کر باسی منہ بید کی ٹوکریاں لے کر ہر قلی کو چائے کی پتیاں چننے کے لئے باغ میں پہنچ جانا پڑتا ہے۔

کنوار کا مہینہ شروع ہو گیا تھا۔ چائے کے پودے نرم اور لچکیلی پتیوں سے لدے ہوئے ہوا میں جھول رہے تھے۔ ان دنوں کو ہڑ پاتی کہتے ہیں۔ اس وقت چائے کی پتیوں کو جلدی، جلدی توڑ لیا جاتا ہے، جتنی بھی پتیاں اب توڑی جائینگی، اتنی ہی پتیاں پھر نکل آئیں گی۔ ایسے زمانے میں کام پر سے غائب ہونے کا مطلب ہے کمپنی کا بہت بڑا نقصان۔ چنانچہ کمپنی کی جانب سے یہ طریق کار رائج کیا گیا کہ ان دنوں میں جس قدر بھی پتیاں توڑی جائیں گی، اسی حساب سے مزدوری ملے گی۔

قلی باغیچوں میں جلدی، جلدی پتیاں توڑتے پھر رہے تھے۔ ہر ایک اپنی بید کی ٹوکری جلد سے جلد بھر لینے کی فکر میں تھا۔ شکرا منڈا کی بیوی منگلی پیر دبا دبا کر چل رہی تھی۔ اپنی کوکھ میں نو مہینے کا بچہ لئے کردہ سو طرح رہی تھی کہ اس تکلیف کے ساتھ وہ کتنی پتیاں توڑ سکے گی۔ اسے کتنی مزدوری ملے گی۔ شکرا چائے کی پتیوں کو تیزی سے نوچتے ہوئے پچھتا رہا تھا کہ کل بیکار میں تاڑی پی کر پیسہ برباد کر دیا۔ اس کے دونوں بچے اس وقت بھوک سے بلبلا کر گھر کے آنگن میں لڑھ رہے ہوں گے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ لپک کر منگلی کے پاس پہنچ گیا۔ کہنے لگا۔

"تو گھر لوٹ جا منگلی۔ میں اکیلا ہی دو ٹوکری پتیاں توڑ لوں گا۔"

مگر منگلی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُسے چلنے میں بڑی اذیت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ پھسکڑا مار کر زمین پر بیٹھ گئی۔ ذرا دیر سستانے کے بعد پھر پیر گھسیٹ کر چلنے لگی۔

شکرا نے اصرار کیا۔ "تو واپس چلی جا منگلی۔"

اس دفعہ منگلی نے بیزاری سے جواب دیا۔ "گھر میں دھان وان کچھ بھی نہیں بھلا اکیلا آدمی کتنا کام کر سکتا ہے۔ دونوں مل کر کام نہ کریں گے تو بچے بھوک سے نہ مر جائیں گے۔"

منگلی کی بات بالکل درست تھی۔ لہٰذا شکرا نے پھر کچھ نہ کہا۔ مگر بہت کوشش کے باوجود منگلی کی ٹوکری

کا چوتھائی حصہ بھی نہ بھر سکا۔ شکرا کو اس کی کوئی خبر نہیں۔ وہ اپنے کام میں پوری تندہی سے الجھا رہا۔ منگلی کی طرف دیکھتا بھی نہیں۔ دراصل باتوں میں کام ٹھیک طور سے نہیں ہوتا۔

کام ختم ہوتے کی گھنٹی بجنے سے کچھ دیر پہلے ایک قلی عورت نے آکر شکرا کو خبر دی "تو یہاں پتیاں چن رہا ہے، شکرا اور منگلی باغیچہ کے پچھم اور زمین پر پڑی ہے۔"

شکرا نے سب کچھ سن کر بھی کام بند نہیں کیا۔ ں میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اسی طرح سے ہوتا آرہا تھا۔ شکرا پتیاں توڑنا نہیں بند کر سکتا۔ اس کی ٹوکری ابھی خالی تھی۔ گھنٹی بجنے سے پیشتر اس کی ٹوکری بھر جانا چاہیے۔ نہیں تو چار پیسے بیکار میں کٹ جائیں گے، جس کا رات بھر افسوس رہے گا۔

گھنٹی بجتے ہی شکرا سیدھا منگلی کے پاس پہنچا۔ وہ جھاڑیوں کی اوٹ میں ابھی تک بے سدھ پڑی تھی۔ اس کے برابر ہی نوزائیدہ بچہ پڑا ہاتھ پاؤں ہلا رہا تھا۔ اس کا بدن تانبے کی طرح لال، لال نظر آرہا تھا۔

منگلی نے شکرا کو اپنے قریب دیکھ کر پوری آنکھیں کھول دیں۔ اور ایک ہاتھ کا سہارا لے کر اٹھتے ہوئے کہنے لگی "چلو اب گھر چلیں۔"

شکرا نے جواب دیا "ہاں! چلو گھر پر ٹھیک سے لیٹ جانا۔"

منگلی آہستہ آہستہ چلنے پر بھی جلد ہی تھک گئی۔ اس نے دھنسی ہوئی سی آواز میں کہا "کل تمھیں اکیلے ہی کام پر آنا پڑے گا۔"

شکرا نے جواب نہ دیا۔ البتہ اس کا چہرہ اترا ہوا نظر آرہا تھا۔ دونوں کسی گہرے خیال میں ڈوبے ہوئے گھر کی طرف چلتے رہے۔

ٹیڑھی میڑھی قلی لائن پر سناٹا چھا چکا تھا۔ دن بھر کڑی محنت کرنے کے بعد کچھ لوگ سیلے فرش پر ہی لیٹ گئے تھے۔ ابھی تک کتنے ہی لوگ کروٹوں پر کروٹیں بدل رہے تھے۔ بھوک کے مارے انھیں نیند نہیں آرہی تھی۔ یہ ہفتہ کے آخر دن تھے۔ جن لوگوں نے جھنگے بھاؤ دھان خریدا تھا یا جنھوں نے تاڑی پی کر اپنا پیسہ بے کار خرچ کر دیا، تین چار روز میں سب کا حال یکساں ہو جاتا۔ مزدوری اسی وقت ملتی ہے جب ہفتہ ختم ہوتا ہے۔

شکرا کے دونوں بچے صبح سے بھوکے تھے۔ ان کو کپکپی کے ساتھ بخار بھی آرہا تھا۔ منگلی اپنے نوزائیدہ

بچہ کو سینہ سے چمٹائے ہوئے چپ چاپ پڑی تھی۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے شکرا کو آواز دی۔ شکرا خود بھی کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے منگلی کی آواز پر کوئی توجہ نہ دی۔ مگر منگلی باز نہ آئی۔ اس نے پھر پکارا۔

شکرا ذرا دیر خاموش رہ کر غصے سے چیخا "کیا کہتی ہے؟"

منگلی نے آہستہ سے کہا "جانے کیوں میرا من اندر ہی اندر بیٹھا جا رہا ہے۔"

شکرا جھنجھلا کر بولا "کیا بات ہے۔ تو ہر وقت کیا سوچ بچار کیا کرتی ہے؟"

منگلی نے دبی زبان سے اپنے شک کا آخر اظہار کر ہی دیا "سچ بتا تو مجھے چھوڑ کر چلا تو نہ جائے گا۔"

وہ جھنجھلا کر کہنے لگا "ایسی بات مت کر۔"

منگلی چپ ہو گئی۔ مگر اس کو قرار نہ آیا۔ وہ اسی طرح بے چین رہی۔ اس کا شبہ برقرار رہا۔ یہ شبہ کوئی نیا نہیں، گھر گھر میں یہی خوف ہر ایک کے دل میں کھٹکتا رہتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جو مرد سخت محنت کر سکتا ہے، وہ بیمار بیوی اور مریل بچوں کی خاطر فاقہ کیوں کرے اور جس لڑکی میں کڑی مشقت کرنے کا بل بوتا ہے وہ بوڑھے باپ کے لئے مہنگا دھان خرید کر خود کیوں سوکھ کر کانٹا ہو۔ جب کوئی راستہ نہ سوجھتا تو چائے کے باغوں میں کام کرنے والے کو ایک روز فرار ہو جانا پڑتا اور جس لڑکی کا بدن مچھلی کی طرح گوشت سے بھرا ہوتا اور جو پہاڑی خچر کی طرح محنت کر سکتی ہے، وہ اسے بھلا پھسلا کر کسی دور کے باغیچہ میں لے جاتا اور اس کے ساتھ کام کرنے لگتا۔ ایسی باتوں کو کوئی برا نہیں سمجھتا۔ آئے دن ایسا ہوا کرتا ہے۔ البتہ بیمار بیوی کچھ عرصہ تک پڑی، پڑی گالیاں دیا کرتی ہے۔ اپاہج باپ جھگی ہوئی چھت کے نیچے پڑا سوکھتا رہتا ہے۔ کوئی بھی ان کو دو شی یا پانی نہیں کہتا۔

دوسرے روز شام کو مول دیوتا کے لئے مانی ہوئی مرغی ٹانگ سے پکڑ کر شکرا منڈا، گنج کی جانب روانہ ہو گیا۔ گنج میں دھان کا بھاؤ اور بھی تیز تھا۔ ایک روپیہ میں کل ڈھائی سیر! شکرا نے صرف ایک بار بھاؤ پوچھا، پھر اس کی ہمت نہ پڑی۔ وہ چپ چاپ دھان کی ڈھیریوں کو دیکھتا ہوا سمادھی کی طرف چل دیا۔

گنج سے لوٹتے ہوئے رات کا سناٹا بڑھ گیا تھا، مگر مان سنگھ کی دکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے شکرا ذرا دیر کے لئے ٹھہر گیا۔ چائے خانہ میں کام کرنے والی پستہ قد لڑکی لکٹریاں چیر، چیر کر الاؤ دہکا رہی تھی۔ اس کے گول پہاڑی چہرے پر آگ کی سرخی جھلملا رہی تھی۔ شکرا نے اس کی طرف بھرپور نظروں سے دیکھا اور غور کرنے لگا کہ یہ لڑکی ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتی ہی رہتی ہے۔ جھیل سے پانی بھر بھر کر لاتی ہے۔ برتن صاف کرتی ہے۔ پہاڑی

ڈھلوانوں پر چڑھ کر جلانے کی لکڑیاں چنتی رہتی ہے۔ اس لڑکی کا چہرہ دیکھنے میں بڑا پیارا لگتا ہے۔ شکرا چپ چاپ کھڑا لڑکی کی جانب دیکھتا رہا۔ سامنے بنچ پہ بیٹھے ہوئے تین گندے بھوٹانی چراغ کی دھندلی روشنی میں اپنے پھٹے ہوئے پائجاموں کی سلوٹوں میں جوئیں ڈھونڈھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ چائے کے باغوں میں کام تلاش کرنے آئے تھے۔ اور دو دن سے برابر فاقہ کر رہے تھے۔ مان سنگھ نے آج سویرے کچھ باسی روٹیاں ان کو دان کر دی تھیں۔ ان باسی روٹیوں کو کھا کر ان کے مرجھائے ہوئے چہروں پہ زندگی کی دھندلی سی رمق آ گئی تھی۔

شکرا نے مان سنگھ کو تلاش کیا۔ مگر وہ دکان پہ موجود نہ تھا۔ سوبھا ناتھ کو ملیریا ہو گیا تھا۔ وہ اپنی کوٹھڑی میں پڑا ہوا بخار میں بھن رہا تھا۔ شکرا کو اس کی خبر نہ تھی ورنہ وہ اس کے پاس ضرور جاتا۔ شکرا بنچ کی طرف بڑھا تاکہ اس پر بیٹھ کر ذرا دیر سستا لے۔ دیر تک چلنے سے اس کے پیروں کے تلوے سلگنے لگے تھے۔ لیکن بنچ پر جگہ نہ تھی۔ تینوں بھوٹانی اسے دیکھ کر بھی اس طرح بیٹھے رہے۔ ان کی اس حرکت پر شکرا سخت جھنجھلایا۔ اس نے ایک بھوٹانی کا ہاتھ پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا اور اسے ایک طرف ہٹا کر بنچ پر بیٹھ گیا۔ تینوں بھوٹانی اسے گھور کر دیکھنے لگے۔ پھر وہ جھنجھلا کر چلانے لگے۔

"شالا یہ تمھارے باپ کا ہے۔ یہ مان سنگھ کا ہے۔ یہ ہمارا ہے"

شکرا کا غصہ اور بڑھ گیا۔ اس نے جھپٹ کر ایک بھوٹانی کا گلا دبوچ لیا۔ تینوں بھوٹانی اس سے چمٹ کر زور، زور سے چیخنے لگے۔ چائے خانہ کی پستہ قد لڑکی نے بھی اپنی گھبرائی ہوئی تیز آواز نکالی۔ شکرا تینوں بھوٹانیوں سے لڑ تا رہا۔ اس کے لمبے لمبے بال بکھر کر منہ پر آ گئے اور چہرہ بھوٹانیوں کے لمبے لمبے ناخونوں سے زخمی ہو گیا۔ شور و غل سن کر سوبھا ناتھ بخار سے کپکپاتا ہوا آ کر ان کے بیچ میں کھڑا ہو گیا۔ بھوٹانیوں کے تیز ناخونوں سے اس کی کنپٹی پہ بھی خراشیں آ گئیں۔ مگر اس نے جھگڑے کو بڑھنے نہ دیا۔ شکرا اپنے چہرے سے خون پونچھ کر بار بار بپھر جاتا۔ لیکن جب اسے سوبھا ناتھ کی بیماری کا علم ہوا تو فوراً ٹھنڈا پڑ گیا۔

تھوڑی دیر بعد مان سنگھ بھی آ گیا۔ مگر وہ اتنا گھبرایا ہوا تھا۔ کہ شکرا کے نچے ہوئے چہرے پر کوئی توجہ نہ دے سکا۔ بلکہ آتے ہی جلدی جلدی کہنے لگا۔

"جانتے ہو، کیا کیا کانن لوگوں نے؟ دھان سے لدی ہوئی گاڑیوں کو روک کر پہلے تو کہا۔ ٹھہر جاؤ۔ گاڑیاں ٹھہر گئیں۔ کسی نے لوٹ مار نہ کی۔ سب نے مل کر کہا ایک روپئے میں سات سیر دھان تول دو اور ٹھیک ٹھیک بھاؤ سے اپنے دام لے لو۔ وہ سب پانچسو سے اوپر رہے ہوں گے۔ خاص محل کے آدمی تھے۔ پر گاڑی والے تیار نہیں ہوئے۔ گاڑیاں اسی طرح رکی کھڑی ہیں۔"

شکرا ابھوٹانیوں سے ہونے والے جھگڑے کو بھول کر حیرت سے مان سنگھ کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر بغیر کچھ کہے سنے وہ تیز تیز قدموں سے قلی لائن کی طرف چل دیا۔

باغیچہ کے پھاٹک میں داخل ہوتے ہی گورکھا چوکیدار نے شکرا منڈا کو ٹوکا۔ "کدھر گیا تھا۔ باہر مت جایا کرو۔ جاؤ گے تو اندر نہیں آنے دیا جائے گا۔ ساب کا حکم ہو گیا ہے۔" اس روز خلافِ معمول پھاٹک کے پاس گشت کرنے والے کچھ اور چوکیدار بھی آگ جلا کر بیٹھے ہوئے تھے۔

چوکیدار کی اس نئی پابندی پر شکرا نے تیکھے لہجے میں پوچھا "تو کیا تم دھان بھی نہیں خریدنے دو گے؟"

چوکیدار بولا "کہہ دیا کہ باہر مت جایا کرو۔ جانتے ہو انگٹانگ کے باغیچوں میں کیا ہو گیا۔ راشن کے بارے میں قلیوں نے دنگا فساد شروع کر دیا۔ کیا تم بھی بدنامی کرانا چاہتے ہو؟ جاؤ اب ایسا نہ کرنا ساب کا حکم ہو گیا ہے۔"

شکرا نے اس سے الجھنے کی کوشش نہ کی۔ چپ چاپ پھاٹک سے گزرا اور آگے بڑھنے لگا۔ لیکن چوکیدار نے اسے پھر ٹوکا "اور ایک اور بات دھیان میں رکھ لو۔ مان سنگھ کی دکان پر نہ جایا کرو۔ بڑا بابو کہتا تھا کہ اس کی دکان پر سوبھا ناتھ رہتا ہے۔ وہ بہت بدمعاش اور خطرناک آدمی ہے۔ کلکتہ سے ادھر آیا ہے۔ وہاں اس نے ڈاک مزدوروں میں ہڑتال کرادی۔ گولی چلوادی۔ بڑا بابو کہتا ہے کہ وہ ہر جگہ جھگڑے کراتا پھرتا ہے۔ ایسے خطرناک آدمی سے قلیوں کو نہیں ملنا چاہیئے۔"

شکرا نے یہ باتیں بھی چپ چاپ سن لیں اور سیدھا قلی لائن کی طرف چل دیا۔ قلیوں کی ساری آبادی سو چکی تھی۔ شکرا سنسان مکانوں کے سامنے سے گزرتا رہا۔ اس کے قدموں کی آہٹ سن کر دو تین آوارہ کتے غرانے لگے۔ مگر اس نے ان کی جانب توجہ نہ دی۔ اسی طرح تیز قدموں سے چلتا ہوا بنسی کے دروازے کے سامنے پہنچا۔

اسے آہستہ آہستہ پکارا۔ بنسی ابھی سویا نہیں تھا۔ صرف خاموش لیٹا تھا۔ دراصل قلی لائن میں ان دنوں کوئی بھی نہیں سویا تھا۔ بھوک اور تھکاوٹ سے سب غنودگی میں نڈھال پڑے رہتے۔

شکرا کی آواز سن کر بنسی آنکھیں ملتا ہوا باہر آگیا۔ شکرا جوش میں بھرا ہوا تھا۔ اس نے کہنا شروع کر دیا۔ "کچھ پتہ ہے کیا ہو رہا ہے؟ خاص محل کے قلیوں نے دھان سے لدی ہوئی گاڑیاں رکوالیں۔ پھر لاٹھیاں تان کر کہا۔ ایک روپئے کا سات سیر دھان دینا پڑے گا۔ پورے پانچسو قلیوں نے گھیرا ڈالا ہے اور انگٹانگ کے قلیوں نے راشن کے بارے میں دنگا شروع کر دیا ہے۔" یہ سب کچھ بتاتے بتاتے جیسے خود اس کے دل کا چور بھی بول اٹھا۔ "کیوں بنسی اپنے یہاں گودام میں کتنا دھان ہوگا؟"

بنسی یہ بات سُن کر کچھ گھبرا گیا۔

"ایسی بات مت کر۔"

شکرا بولا۔ "اور کیسی بات کروں؟"

شکرا کی اونچی آواز سن کر بستی کے اور قلی بھی ان دونوں کے گرد اکٹھا ہونے لگے۔ ہر ایک نے بار بار دہرائی ہوئی باتوں کے متعلق پوچھنا شروع کر دیا، پھر ان باتوں پہ بحث ہونے لگی۔ ہمیشہ کی طرح انکی آوازیں اونچی ہوتی گئیں۔ پھر آپس میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ گلا پھاڑ کر چیختے ہوئے ان کی مٹھیاں ایک دوسرے پر تن گئیں۔ رات کے سناٹے میں ان کی آوازوں کا شور دور، دور تک سنائی دے رہا تھا۔

لیکن سویرے اٹھ کر معمولی کے مطابق سارے قلی بید کی ٹوکریاں پشت پر لٹکائے چائے کے باغوں کی طرف چل دیئے۔ رات کا ہنگامہ رات ہی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ کوئی اس کا چرچا بھی نہیں کرتا۔ البتہ خاص محل کے قلیوں کی بات سب کو یاد ہے۔ اور انگٹانگ کے راشن کا بلوہ بھی وہ ابھی تک نہیں بھول سکے۔ قلی چائے کی پتیاں توڑتے جاتے اور سوچتے رہے کہ دھان تین سیر کا ہو گیا ہے۔ خاص محل کے قلیوں نے دھان کی گاڑیاں روک کر لاٹھیاں تان لیں۔ انگٹانگ کے قلی راشن کے بارے میں بلوہ کر رہے ہیں۔ اسی طرح سوچتے سوچتے دن ڈھل گیا۔ چھٹی کی گھنٹی زور، زور سے بجی۔ قلیوں نے کام بند کر دیا اور تول گھر کی طرف چل دیئے۔ باغ بابو رٹے ہوئے سبق کی طرح قلیوں کی حاضری لیتا، پلک جھپکتے ہی وزن بھی کر لیتا اور مزدوری بھی بتاتا جاتا۔

"پانچ آنے۔"

"سات آنے۔"

"ساڑھے چھ آنے۔"

"ساڑھے نو آنے۔"

ساڑھے نو آنے مزدوری سن کر قلی حیرت سے پوچھتے۔

"کیوں بھائی آج بہت کما لیا؟"

"آج تو ہڑیا پی جائے گی۔"

"تیرا بازار بھی اچھا رہے گا۔"

قلی یوں ہی باتیں کرتے جاتے۔ چائے کی تازہ نرم، نرم پتیوں سے بھینی بھینی خوشبو پھوٹ رہی تھی۔ مگر قلیوں کے جسم سے کسی مردار سے نکلتی ہوئی سڑانڈ کی طرح بساند اٹھتی تھی۔ باغ بابو ہوں، ہوں کر کے بار بار اپنی ناک زور زور سے رگڑتا اور چیخ کر قلیوں کو ڈانٹتا۔

"دور ٹھو۔ سر پر کیوں چڑھے آتے ہو؟"

قلی پتیوں سے بھری ہوئی ٹوکریاں لاتے اور باری، باری سے تولنے والی مشین پر لٹکا دیتے۔ باغ بابو ان کا وزن کر کے مزدوری سنا دیتا۔

آج شکرا نے اکیلے ہی تین ٹوکری پتیاں توڑی تھیں۔ اسے تنہا دم پر پانچ آدمیوں کا پیٹ پالنا پڑ رہا تھا۔ ان تینوں ٹوکریوں کو بھر کر جب اس نے دن بھر کے بعد اپنی کمر سیدھی کی تو وہ چلچلاتی دھوپ میں سرپٹ بھاگنے والے خچر کی طرح کانپنے لگا تھا۔

مشین پر اپنی ٹوکری لٹکاتے ہوئے شکرا نے پورے اعتماد سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آج ایک روپیہ سے کم نہ لوں گا۔"

مگر باغ بابو کو شکرا کی بات سننے کی فرصت کہاں تھی۔ وہ اس وقت کسی اور قلی کی ٹوکری کا وزن رجسٹر میں درج کر رہا تھا۔ اس رجسٹر میں پورا پورا وزن نہیں لکھا جاتا۔ قلیوں کو اس بات کا علم بھی ہے۔ جب

وہ اس کے متعلق پوچھتے تو جواب ملتا "کمپنی سوکھی پتیاں بازار میں بیچتی ہے۔ گیلی پتیاں نہیں بیچتی۔ اس لئے پتیوں میں جو پانی کا وزن ہوگا وہ تو کاٹا جائے گا کیا تم لوگ یہ چاہتے ہو کہ پانی کا وزن بھی شامل کر لیا جائے۔ اس میں نقصان کس کا ہوگا؟ ذرا اتنا تو سوچا کرو کہ کمپنی کے بھلے ہی سے سب کا بھلا ہوگا۔" شکرا کے ذہن میں باغ بابو کا بار بار دہرایا ہوا جواب محفوظ تھا۔ بہت سے دوسرے قلیوں کی طرح وہ بھی اس جواب سے کبھی مطمئن نہیں ہوا۔

شکرا نے اپنے کاندھوں کو اونچا کر کے ایک بار پھر باغ بابو کو مخاطب کیا۔ "آج ایک روپیہ سے کم نہ لوں گا۔ میں نے تین ٹوکریاں بھر ڈالی ہیں۔"

باغ بابو اس دفعہ بھی خاموش رہا اور چپ چاپ ٹوکری تولنے لگا۔ اس نے ٹوکری کا وزن کر کے بے نیازی سے کہا۔

"پورے آٹھ آنے۔ بیس سیر وزن کاٹا گیا۔"

"بیس سیر وزن کاٹا گیا!" شکرا کو جیسے یقین نہ آیا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ باغ بابو نے لاپرواہی سے بتایا۔ "ہاں! بیس سیر وزن کاٹا گیا۔"

شکرا نے کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے باغ بابو کو گھورتا رہا۔ اچانک وہ باغ بابو پر جھپٹا اور اس کی گردن دونوں ہاتھوں میں دبوچ کر چلانے لگا۔

"بیس سیر وزن کیوں کاٹا؟ ساڑھے آٹھ آنے مزدوری دے گا۔ ایک روپیہ سے کم نہیں لوں گا۔"

شکرا کی حمایت میں دوسرے قلی بھی تولی گھر کے سامنے اکٹھا ہو کر زور زور سے شور مچانے لگے۔

"مزدوری کا ٹوگے۔ دھان نہیں دوگے۔"

"دھان دو۔ ہم بھوکے ہیں۔"

"باغ بابو بے ایمان ہے۔ اس کو نکال دو۔"

قلیوں کا شور بڑھتا گیا۔ پھر پہاڑی تلیٹی کے مضبوط حصار میں ہوائی حملے کے سائرن کی طرح خطرے کی گھنٹی زور زور سے بجنے لگی۔ قلی اس کی خوف ناک آواز سن کر لمحہ بھر کے لئے دم بخود ہو گئے، مگر ان کا غم و غصہ کم نہ

ہوا۔ وہ پھر شور مچانے لگے۔ عورتیں بھی گلا پھاڑ، پھاڑ کر چیخنے لگیں۔ سب نے مٹھیاں بھینچ لیں اور مکے تان کر دیوانوں کی طرح چیختے چلاتے گودام کے دروازے پر جاکر اکٹھا ہو گئے۔ ان کی آوازیں برابر ابھرتی رہیں۔ پھر اس ملے جلے انسانی شور میں گولی چلنے کی آواز زور سے گونجی اور اس کی صدائے بازگشت وادی میں دیر تک گرجتی رہی۔

گولی بڑے صاحب کی کوٹھی سے چلائی گئی تھی۔ اس کی خوف ناک آواز سن کر قلی دہشت زدہ ہو گئے اور اِدھر اُدھر بکھرنے لگے۔ بنسی قلی لڑکھڑا کر گر گیا۔ ذرا ہی دیر میں قلیوں کا ہجوم تتر بتر ہو گیا۔ سب قلی بدحواسی کے عالم میں قلی لائن کی طرف بھاگے۔ تول گھر کے سامنے صرف بنسی ٹوکری میں منہ ڈالے خون سے لت پت پڑا تھا۔ اسے دیکھنے کے لئے نہ ڈاکٹر آیا اور نہ ہی اسے کمپنی کی ڈسپنسری میں لے جایا گیا۔ اس کا جسم ٹھنڈا پڑتا جا رہا تھا اور آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ آخر دو ہٹے کٹے چوکیدار آئے اور بنسی کو اٹھا کر لے گئے۔ طبی امداد پہنچانے کیلئے نہیں، کسی گہرے اور تاریک کھڈ میں پھینکنے کے لئے تاکہ چیلیں اور گدھ اس کے ٹھوس جسم کے گوشت کو نوچ، نوچ کر کھا جائیں۔ حاضری کے رجسٹر میں اسے مفرور قرار دے دیا جائے گا۔

شام کو شکرا کا بلاوا آیا۔ دو چوکیدار اسے پکڑ کر پیشی کے لیئے بڑے صاحب کی کوٹھی پر لے گئے۔ بڑے صاحب اپنی خوبصورت پہاڑی کوٹھی کے برآمدے میں بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں چمڑے کا مضبوط ہنٹر تھا، جسے وہ انگلیوں سے بار، بار دبا رہے تھے۔ برآمدے کے پہلو میں جو کمرہ تھا، اس کا ریشمی پردہ ہٹا کر بڑے صاحب کی ملازم پہاڑی لڑکی سہمی ہوئی نظروں سے شکرا کو دیکھ رہی تھی، جو چوکیداروں کے زرغے میں سر جھکائے آہستہ آہستہ برآمدے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ لڑکی کی گول، گول آنکھیں خوف اور دہشت سے چمک رہی تھیں۔

شکرا منڈا کو بڑے صاحب کے روبرو پیش کرنے کے بعد دونوں چوکیدار الٹے قدموں پیچھے ہٹ گئے اور کچھ دور جاکر کھڑے ہو گئے۔ بڑے صاحب نے شکرا کو قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ ان کی نیلی، نیلی آنکھیں غصّے سے پھیل گئیں۔ گورا چٹا یورپین چہرہ سرخ ہو گیا۔ ان کے ہاتھ میں دبا ہوا ہنٹر یکایک تیزی سے لہرایا اور شکرا کے جسم پر سڑاک، سڑاک برسنے لگا۔ پہاڑی لڑکی کی آنکھیں سراسیمہ ہو کر بند ہو گئیں۔ وہ پردے کے پیچھے سرک گئی۔

شکرا منڈا خاموش کھڑا رہا۔ بڑے صاحب کا ہاتھ چلتا رہا۔ ہنٹر شکرا کی کمر پر، گردن پر، ٹانگوں پر، ہر جگہ

پڑتا رہا۔ بڑے صاحب ہانپنے لگے۔ ان کا ہاتھ رک گیا۔ شکرا کی پھٹی ہوئی گندی صدری خون سے تربتر ہو کر پیٹھ سے چپکنے لگی۔ بڑے صاحب نے ہاتھ سے ہٹ جانے کا اشارہ کیا۔ شکرا پیچھے ہٹا۔ مگر مشکل سے دو قدم بھی نہ چل سکا۔ لڑکھڑا کر گرا اور برآمدے کی سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا نیچے چلا گیا۔ وہ کچھ دیر تک بے سدھ پڑا ہوا رُک، رُک کر سانس بھرتا رہا، پھر اس نے کروٹ بدلی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

بڑے صاحب نے چیخ کر حکم دیا۔ "ہٹاؤ، باہر کرو۔" اس حکم کا مطلب ہے کہ چوبیس گھنٹے کے اندر، اندر شکرا کو چائے کے باغ سے نکل جانا ہوگا۔ چوکیدار اور کمپنی کے دوسرے کارندے گھر میں گھس کر شکرا کا تمام سامان توڑ پھوڑ ڈالیں گے اور آج سے چائے کے کسی باغ میں شکرا کو کام نہیں ملے گا۔ کل سویرے بڑے صاحب کے دستخطوں سے ایک گشتی چٹھی ہر جگہ روانہ کر دی جائے گی۔ جس میں خبردار کیا جائے گا کہ شکرا منڈا نامی ایک بدمعاش قلی کو برخاست کر دیا گیا ہے۔ اس سے ہوشیار رہا جائے اور ہرگز کام پر نہ لگایا جائے۔ مالکان کے باہمی سمجھوتے کے تحت ہر چائے کے باغ کی انتظامیہ کے لئے لازم ہوگا کہ اس پر سختی سے عمل کرے۔

شکرا کوشش کے باوجود زیادہ دیر بیٹھ نہ سکا۔ اس کی آنکھیں بار، بار بند ہو جاتیں۔ وہ جھومنے لگا اور جھومتے، جھومتے بے حال ہو کر گر گیا۔ وہ زمین پر منہ ڈالے، تھکے ہوئے نچھر کی طرح ہانپتا رہا۔ وہ نہ تو درد سے چلایا اور نہ زخموں کی کسک سے تلملایا۔

ایک، ایک کر کے بیس قلی اسے دیکھنے کے لئے آئے قریب بیٹھ کر اظہار ہمدردی کیا۔ مگر یہ اظہار ہمدردی ان کو بہت مہنگا پڑا۔ ان سب کے خلاف بھی بڑے صاحب نے "ہٹاؤ، باہر کرو" کا حکم جاری کر دیا۔ پھر کسی قلی کو اتنی ہمت نہ ہوئی کہ شکرا کے پاس جائے اور اس کا حال احوال پوچھے۔ ہمدردی کے دو بول کہے۔ البتہ کچھ قلی لوہے کی کانٹوں دار باڑھ کو رات کی تاریکی میں پھلانگ، پھلانگ عبور کر کے مان سنگھ کے چائے خانے کی طرف چلے گئے

۴

سوبھا ناتھ کا بخار اب اتر گیا تھا۔ لیکن اس کا چہرہ ابھی تک بیمار اور مرجھایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ اپنی کوٹھری میں کمبل اوڑھے ہوئے بیٹھا تھا۔ سامنے دھیمی، دھیمی آگ دہک رہی تھی۔ انگاروں کی تیز روشنی میں قریب

بیٹھے ہوئے قلیوں کے چہرے پتھر کے مجسموں کی مانند ٹھوس معلوم ہو رہے تھے۔ سوبھاناتھ آہستہ، آہستہ باتیں کر رہا تھا۔ قلیوں کی آنکھوں میں تیز چمک پھیلتی جا رہی تھی۔

رائت گئے جب یہ قلی اپنے گھروں کو واپس پہنچے تو قلی لائن کے گھر، گھر میں یہ چرچا ہونے لگا کہ کل سب قلی دھرنا دے کر بیٹھ جائیں گے۔ کوئی بھی کام پر نہیں جائے گا۔

باغیچہ سے باہر چوکیداروں کی بھاری، بھاری آوازیں گونج رہی تھیں۔ گشت لگاتے ہوئے ان کے بوجھل جوتوں کی آوازیں پتھروں پر ابھر رہی تھیں۔ تمام رات سنسان وادی میں ان کی آوازیں بلند ہوتی رہیں۔

"ہوشیار رہنا، جاگتے رہنا!"

"باہر سے کوئی آدمی گھسا ہو تو پکڑ لو!"

"ہوشیار رہو، کوئی کھٹکا تو نہیں!"

سب چوکیدار ڈرے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ بڑے صاحب کی کوٹھی پر دو سنتری بندوقیں سنبھالے ہوئے مستعدی سے ٹہل رہے تھے۔ ذرا سی آہٹ پر وہ اپنی سنگینیں تان کر اسی سمت گھورنے لگتے۔

صبح جب کوئی بھی کام پر نہ گیا تو بڑے صاحب نے قلیوں کو بلا بھیجا۔ پہلے تو قلی کچھ گھبرائے۔ پھر آپس میں صلاح مشورہ کر کے سب کوٹھی کے سامنے اکٹھا ہو کر شور مچانے لگے۔

"ہم بھوکے ہیں، ہمیں دھان دو۔"

"ہمیں دھان دو۔ باغ بابو ہماری مزدوری کیوں کاٹتا ہے؟"

"ہم کام پر کیسے جائیں۔ پیٹ تو بھرتا نہیں!"

قلی اکٹھا ہو کر اسی طرح ملی جلی آوازوں سے چیختے رہے۔ کچھ دیر بعد بڑے صاحب برآمدے میں آ کر کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے دو، دو آنے سب کے سامنے بخشش کے پھینک دیئے اور غیر قانونی طریقے سے کشید کی ہوئی دیسی شراب بیچ میں رکھ دی گئی۔

قلیوں نے جھپٹ، جھپٹ کر بخشش کی دونیاں اٹھانا شروع کر دیں۔ دیسی شراب پر بھی سب اسی طرح ٹوٹ پڑے۔ باغ بابو نے ہمیشہ کی طرح قلی لڑکیوں سے آنکھ مار کر کہا "ناچو۔ ناچ دکھاؤ نا، سب مل کر ناچو،

گاڈ۔ صاحب تم لوگوں سے بہت خوش ہیں۔" وہ اپنے گندے دانت نکال کر ہنسنے لگا۔

ڈھولک پر تھاپ پڑی۔ پہلے مردوں نے اپنے جسموں کو ڈھیلا کر کے جھرجھری لی اور ناچنا شروع کر دیا۔ ناچ دھیرے دھیرے جاری رہا۔ عورتیں کھڑی کھڑی ان کو ناچتے ہوئے دیکھتی رہیں۔ پھر کانوں پہ ہاتھ رکھ کر اور اپنے روکھے بالوں کو درست کر کے وہ بھی متوالوں کی طرح ناچ میں شامل ہو گئیں۔

ناچ بڑھتے ہوئے نشہ کے ساتھ برابر تیز ہوتا گیا۔ بڑے صاحب ہونٹوں میں موٹا سا چرٹ دبا کر منہ سے دھوئیں کے بادل چھوڑتے رہے۔ مسکرا، مسکرا کر قلیوں کا ناچ دیکھتے رہے۔ مگر وہ زیادہ دیر نہ ٹھہر سکے۔ اس روز انھوں نے اپنی وسیع شکارگاہ میں شکار کا خاص طور پر اہتمام کیا تھا۔ بھوٹان کا چوگیال اور دارجلنگ سے انگریز کلکٹر کے علاوہ دوسرے کئی بڑے افسر بھی شکار کھیلنے آ رہے تھے۔ لہٰذا شکارگاہ میں بڑے صاحب کی موجودگی بہت ضروری تھی۔ وہ اپنے دو مینجروں کے ساتھ شکارگاہ کی طرف چلے گئے۔

قلی ان کے جانے کے بعد بھی گھیرا بنا کر تیزی سے ناچتے رہے۔ ڈھول اور بھی زوروں سے بجنے لگا تھا۔ باغ بابو اپنے گندے دانت نکالے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ اور نیلگوں پہاڑیوں کے پیچھے سے سورج سنہری کرنیں بکھیرتا ہوا بلند چوٹیوں سے بھی اوپر آ گیا تھا۔ دھوپ چائے کے باغوں میں ہر طرف پھیل گئی تھی۔

سب قلی خالی پیٹ ناچ رہے تھے۔ اور جب پیٹ خالی ہو تو نشہ بڑی سرعت سے چڑھتا ہے۔ قلی ناچتے ناچتے مستی کے عالم میں چلانے لگے۔

"آج ہم لوگ باغ میں کام نہیں کریں گے۔"

"ہاں ہم لوگ آج کام نہیں کریں گے۔"

باغ بابو کی مسکراہٹ فنا ہو گئی۔ وہ ان کو سمجھانے لگا۔ "کام نہیں کرو گے۔ پر ناچو تو۔"

قلیوں نے ناچ تیز کر دیا۔ ڈھولک کی گمک اونچی اور اونچی ہوتی گئی۔ ناچنے والوں کے جسم بگولے کی مانند تیزی سے گردش کرنے لگے۔ نوجوان قلی عورتیں اور لڑکیاں کانوں پہ ہاتھ رکھ کر لمبی، لمبی تانیں لگانے لگیں۔

شکرا نے رقص کرتے ہوئے قلیوں کو دور سے دیکھا۔ اس کے چہرے پہ اداسی چھا گئی۔ اسے اپنے زخموں کی تکلیف کا پہلی بار شدت سے احساس ہوا۔ منگلی ابھی تک بیمار پڑی تھی۔ اس لئے وہ ناچ میں شامل نہ ہو سکی۔ اس

نے شکرا کو اس قدر دل گرفتہ دیکھا تو گھبرا گئی۔ اس کے دل کا چور ایک بار پھر بول اٹھا۔

"تو بھاگ تو نہ جائے گا۔ تیری آنکھوں میں بڑا ڈر دکھائی پڑتا ہے۔"

شکرا نے ڈھٹائی سے جواب دیا "ہاں تو نے ٹھیک ہی سوچا۔ تو محنت نہیں کر سکتی اور مجھے اب کسی باغ میں کام نہیں ملے گا۔"

منگلی دل برداشتہ ہو کر بولی "میری بات چھوڑ۔ پر تجھے اپنے بچوں کا بھی کچھ خیال نہیں۔"

شکرا تیوری پر بل ڈال کر بولا "ہاں کہہ تو دیا۔ کوئی کسی کی چنتا نہیں کرتا ہے۔ دیکھتی نہیں سب لوگ کیسے ٹھاٹھ سے ناچ رہے ہیں اور میرا سارا بدن دکھ رہا ہے۔ پیٹ میں دانا بھی نہیں گیا۔ اس بات کو کون نہیں جانتا۔ پر ایسی بات کون سوچتا ہے۔ میں کیوں بھوکا مروں۔" وہ تیزی سے اٹھا اور بڑبڑاتا ہوا مان سنگھ کی دکان کی طرف چل دیا۔

منگلی کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ اس نے اپنے بچہ کو زور سے سینہ میں بھینچ لیا۔

بڑے صاحب کی کوٹھی کے سامنے قلی ابھی تک ناچ رہے تھے۔ مگر ان کے جسم شل ہوتے جا رہے تھے۔ ناچ کی رفتار رفتہ رفتہ سست پڑتی جا رہی تھی۔ باغ بابو نے فوراً ان کو للکارا۔

"ناچو، ناچو اور تیزی سے ناچو۔ ارے کیا ہو گیا تم لوگوں کو؟"

قلی ناچتے، ناچتے اب بالکل نڈھال ہو گئے تھے۔ نشہ کا رنگ پھیکا پڑتا جا رہا تھا اور اس پر بھوک غالب آتی جا رہی تھی۔ پھر ناچ تھم گیا۔ سب خاموش ہو کر کھڑے ہو گئے۔ باغ بابو حیران ہو کر بولا۔

"ارے! یہ کیا؟ بڑے صاحب کو پتہ چلے گا تو بہت ناراض ہوں گے۔"

لیکن اس دھمکی کے باوجود وہ ناچنے گانے پر آمادہ نہ ہوئے۔ کسی نے تھکی ہوئی آواز میں کہا "تمھارا جی تو بہل گیا۔ ہم اب کیا کریں۔ ہڑیا تو پلا دی۔ پر دھان نہیں دیا۔" باغ بابو نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر انھوں نے اسے بولنے کا موقع ہی نہ دیا۔ زور، زور سے چیخنا شروع کر دیا۔

"ہاں دھان تو دیا نہیں۔ جاؤ نہیں ناچتے۔"

"ہاں اب نہیں ناچیں گے۔"

باغ بابو جھنجھلا کر دھاڑا "ارے کیا ہو گیا تم لوگوں کو؟"

مگر کسی نے اس کے بگڑنے پر توجہ نہ دی اور کچھ کہے سنے بغیر سب تھکے ہوئے قدموں سے قلی لائن کی طرف روانہ ہو گئے۔

۵

شکرا منڈا، مان سنگھ کی دکان کے سامنے بنچ پر خاموش بیٹھا تھا۔ کچھ فاصلے پر تینوں بھوٹانی دھوپ میں بیٹھے ہوئے اپنے گندے کپڑوں میں سے جوئیں نکال نکال کر مار رہے تھے۔ چائے خانہ کی پستہ قد لڑکی دکان کے اندر سے نکلی۔ اس نے شکرا کی طرف دیکھا۔ اس کی صدری پر خون کے گہرے داغ جلی ہوئی اینٹوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ لڑکی نے گھبرا کر پوچھا۔

"بڑے ساب نے تم کو ہٹاؤ باہر کر دیا؟"

شکرا نے لاپرواہی سے کہا "ہاں، پر مان سنگھ اور سوبھا ناتھ کہاں ہیں؟"

لڑکی نے بتایا "سویرے پولیس کے آدمی آئے تھے۔ سوبھا ناتھ کو پکڑ کر لے گئے۔ مان سنگھ بھی سوبھا ناتھ کے ساتھ گیا ہے۔"

شکرا نے پھر کچھ نہ کہا۔ وہ لڑکی کے گول ماتھے پر بکھرے ہوئے گندے اور بھورے بالوں کو دیکھنے لگا اور جب ایک بار لڑکی نے بھی اس کی طرف بھرپور نظروں سے دیکھا تو شکرا کہنے لگا۔

"منگلی اب محنت نہیں کر سکتی تو میرے ساتھ چلے گی؟"

لیکن لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے دکان کے اندر چلی گئی۔ شکرا کو اس کی یہ حرکت بہت بُری معلوم ہوئی۔ وہ ذرا دیر تک بنچ پر بیٹھا ہوا جھنجھلاتا رہا۔ پھر اٹھ کر چل دیا۔ مگر وہ زیادہ دور تک نہیں گیا تھا کہ پیچھے سے کسی نے پکارا۔ شکرا نے مڑ کر دیکھا۔ چائے خانہ کی پستہ قد لڑکی اسے آواز دے رہی تھی۔ وہ وہیں ٹھہر گیا۔ لڑکی تیز قدموں سے چلتی ہوئی اس کے قریب آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں میلے کپڑوں کی گٹھڑی لٹک رہی تھی۔ شکرا نے پوچھا

"یہ کیا ہے؟"

لڑکی نے جواب دیا۔ "مان سنگھ اب واپس نہیں آئے گا۔ پولس کے ساتھ جاتے ہوئے اس نے یہی بتایا تھا۔ یہ دکان اب بند ہو جائے گی۔" اس نے لمحہ بھر خاموش رہ کر کہا۔ "چلو میں تمھارے ساتھ چلتی ہوں۔ میں کڑی محنت کر سکتی ہوں۔" اس نے نظریں اٹھا کر شکرا کو دیکھا پھر دریافت کیا۔

"تو مجھے مارے گا تو نہیں۔ مان لے اگر میں کبھی کام نہ کر سکوں تو کیا تو مجھے بھی چھوڑ دے گا؟"

شکرا نے جھک کر اس کی گردن کو چوم لیا۔ "بھلا میں تجھے کیوں چھوڑنے لگا۔ تو اتنی سندر ہے اور تیرا بدن بھی مضبوط اور سڈول ہے۔"

لڑکی نے پھر کچھ نہ کہا۔ دونوں ساتھ، ساتھ پتھریلی پگڈنڈی پر چلنے لگے۔ ان کی پشت پر نیچے تلیٹی میں چائے کے باغ کے ایک طرف قلی لائن سیاہ دھبے کی مانند نظر آ رہی تھی، جہاں منگلی اپنے سہمے ہوئے بچوں کے درمیان کھڑی تھی اور خوف زدہ نظروں سے کمپنی کے کارندوں کو دیکھ رہی تھی، جو بڑے صاحب کے حکم کے مطابق سڑے ہوئے خشک پتوں سے بنی ہوئی چھتوں والے گندے اور بوسیدہ مکانوں کو لاٹھیاں مار، مار کر گرا رہے تھے۔ مکانوں کے اندر رکھی ہوئی میلی کچیلی گتھریاں، پھٹے پرانے کپڑے، مٹی کی ہنڈیاں اور بید کی ٹوکریاں اٹھا، اٹھا کر باہر پھینک رہے تھے۔ کوڑے کرکٹ کی طرح اس بکھرے ہوئے سامان کے قریب بیس قلی خاموش بیٹھے احمقوں کی طرح ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔

چھتوں کو لاٹھیوں سے گرا کر کارندے بکھرے ہوئے سامان کو جوتوں سے روندھنے لگے۔ انھوں نے سامنے بیٹھے ہوئے بیس قلیوں سے ڈپٹ کر کہا۔ "بھاگو۔ یہاں سے ایک دم نکل جاؤ۔ بڑے صاحب کا تمھارے لئے یہی حکم ہے۔" مگر وہ اسی طرح خاموش بیٹھے کھوئی کھوئی نظروں سے کارندوں کا منہ تکتے رہے۔

کارندوں کو انکی یہ حکم عدولی سخت ناگوار معلوم ہوئی۔ وہ جھنجھلا کر ان پر جھپٹے اور اپنی لمبی، لمبی لاٹھیاں برسانے لگے۔ قلی کیلی زمین پر بیٹھے ہوئے لاٹھیوں کو ہاتھ اٹھا، اٹھا کر روکنے لگے۔ انھوں نے اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش نہ کی۔ لاٹھیوں کے سروں پر لوہے کی مضبوط شامیں لگی تھیں، جنکی چوٹ سے قلیوں کے سر جگہ، جگہ سے پھٹ گئے اور چہرے لہو لہان ہو گئے۔

منگلی خون میں لتھڑے ہوئے قلیوں کو خوف زدہ نظروں سے دیکھتی رہی۔ پھر تڑپ کر آگے بڑھی اور انکے

درمیان پہنچ گئی۔ کمپنی کے کارندوں نے منگلی کو اپنے سامنے پایا تو ہاتھ روک لئے۔ مگر ذرا ہی دیر بعد انھوں نے پھر لاٹھیاں برسانا شروع کر دیں۔ منگلی کا شیر خوار بچہ سینے سے چمٹا ہوا تھا۔ وہ زور، زور سے رونے لگا۔ منگلی نے غضب ناک ہو کر اپنے تانبے کے ایسے لال، لال بچے کو کارندوں کے بھاری، بھاری بوٹوں کے سامنے پھینک دیا۔ اور بے قرار ہو کر چلانے لگی۔

"مار ڈالو۔ مار ڈالو۔"

کارندے گھما گھما کر لاٹھیاں چلاتے رہے۔ ایک ننھا سا ہاتھ ان کے بھاری، بھاری بوٹوں کے نیچے آ کر کچھ سے دب گیا اور ہاتھ کی جگہ صرف گوشت کا لوتھڑا رہ گیا۔ قلی ہاتھ اٹھا، اٹھا کر لاٹھیوں کے وار روکنے کی کوشش کرتے رہے۔ ان کے چہرے خون سے تر بتر ہو کر لال، لال ہو گئے تھے۔ منگلی کے ماتھے سے بھی خون بہہ، بہہ کر گالوں پر پھیلنے لگا تھا۔ اس کے میٹالے بال بکھر کر منہ پر آ گئے تھے۔ وہ پاگلوں کی طرح گلا پھاڑ کر چیخے جا رہی تھی۔

"مار ڈالو، مار ڈالو۔"

بھوٹان دیش کے اوپر جو خارش زدہ کوبڑ نکلا ہوا ہے، اس کے دامن میں بندوقوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ چائے کے باغات کے مالکان، مسٹر مائیکل کی وسیع شکار گاہ میں بھوٹان کے چوگیال اور دارجلنگ شہر سے آئے ہوئے افسروں کے ساتھ شکار کھیل رہے تھے۔

ایک تھا سوداگر

ان کوہستانی چٹانوں کے دامن میں دریائے کوڑیالا کا بہاؤ بہت تیز ہوگیا ہے۔ گہری وادیوں میں شوریدہ سر لہروں کا شور جھنکارتا ہے اور تاریک کھڈوں میں طوفانی ہوائیں سیٹیاں بجاتی ہیں۔ اس پار نیپال کا علاقہ ہے۔ ڈھلوانوں پر پھیلا ہوا چیڑ اور دیودار کے درختوں کا طویل سلسلہ دور سے کسی گذرتے ہوئے کارواں کی طرح نظر آتا ہے۔ نشیب میں سرحدی چوکی ہے لکڑی کی بنی ہوئی مختصر عمارت جس کے سامنے ایک گورکھا پہریدار ہر وقت سنگین سنبھالے مستعدی سے کھڑا رہتا ہے اس طرف سرکاری حدود کے اختتام پر نکینہ کی بستی ہے، جہاں موسم سرما میں نہایت گہما گہمی رہتی ہے۔ سردیاں شروع ہوتے ہی کوہستانوں میں بسنے والے پہاڑی باشندے تنگ دروں سے اتر کر نکینہ میں آجاتے ہیں۔ پھر ہر طرح کا بیوپار ہونے لگتا ہے۔

ابھی رات زیادہ نہیں گذری، بازار میں تھوڑی بہت چہل پہل باقی تھی۔ جھکی ہوئی سائبان نما چھتوں کے نیچے چراغوں کی دھندلی روشنیاں لرز رہی تھیں کہیں کہیں الاؤ بھی دہک رہے تھے۔ اور ان کے گرد بیٹھے ہوئے انسانوں کے سائے جھوم رہے تھے۔ ہر پال بازار کے سنسان ہوجانے کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ سردی برابر بڑھتی جارہی تھی۔ ہوا بھی بپھری ہوئی تھی۔ ہرپال بھیڑ کی گرم پوستین میں سکڑا ہوا سرد ریت پر بڑے پُراسرار انداز میں ٹہل رہا تھا۔ کہر کا ہلکا سرمئی غبار وادی میں پھیلا تھا۔ اس دھندلکے میں گھاٹ پر بندھی ہوئی کشتیاں دھندلی، دھندلی نظر آرہی تھیں۔ جن سے ٹکراتی ہوئی تیز لہروں میں جھاگ اٹھ رہے تھے۔ کچھ ہی دیر قبل مخبر نے آکر اطلاع دی تھی کہ ان کشتیوں کے ذریعہ نمک کی بوریاں سرحد پار اسمگل کی جانے والی تھیں۔ ہرپال اسی ہفتے کسٹم انسپکٹر کی حیثیت

سے اس علاقہ میں تعینات کیا گیا تھا۔ علاقے میں ہونے والی غیر قانونی سرگرمیوں کے متعلق وہ بہت کچھ سُن چکا تھا۔

کشتیاں اس کی نظر میں تھیں، مگر ان کے قریب اس نے ابھی تک کسی انسانی آہٹ کو نہیں سُنا تھا۔

ناگاہ درختوں کے اندھیرے میں قدموں کی آواز ابھرنے لگی۔ ہرپال نے چونک کر اس طرف دیکھا اور سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اندھیرے سے نکل کر دو آدمی اس کے سامنے آ گئے۔ ہلکی مدہم روشنی میں ہرپال جھکی ہوئی مونچھوں والے اس ادھیڑ آدمی کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگا جو بالکل اس کے نزدیک کھڑا تھا۔ مگر ہرپال نے جلد ہی اسے پہچان لیا۔ وہ غلہ منڈی کا آڑھتی بھاگوناتھ تھا جس کے گودام ہمیشہ بھرے رہتے تھے۔

ہرپال نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "ساہوجی تم اس وقت یہاں کیسے نکل آئے؟"

بھاگوناتھ ہنسنے لگا۔ "سرکار آپ لوگ کہیں چین سے بیٹھنے بھی دیں۔"

ہرپال نے جلدی سے کہا۔ "کیوں کیا ہوا؟"

بھاگوناتھ بولا۔ "ہوا تو کچھ نہیں۔ میں نے سُنا کہ آپ یہاں سردی میں پریشان ہو رہے ہیں۔ بھلا اس جاڑے پالے میں یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ کبھی ہم غریبوں کو بھی درشن کرا دیا کیجئے۔ دوپہر کو جیسے ہی مجھے پتہ چلا کہ آپ آئے ہوئے ہیں۔ میں تو اسی وقت سے آپ کی تلاش میں تھا۔ اگر ملاقات ہو جاتی تو آپ یہاں آ کر بے کار میں پریشان کیوں ہوتے۔"

ہرپال اس کی باتیں خاموشی سے سنتا رہا اور سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی انجان بن کر بولا۔ "کیا کریں ساہوجی! نوکری کا معاملہ ہے۔ اب چاہے جاڑا ہو یا پالا ڈیوٹی کا خیال تو رکھنا ہی پڑتا ہے۔"

بھاگوناتھ نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "اجی ڈیوٹی تو گھر پر بیٹھ کر بھی جاتی ہے۔ آپ میرے ساتھ آئیے۔ بڑے کڑاکے کا جاڑا ہے۔" اس نے ہرپال کا بازو پکڑ کر اپنی طرف آہستہ سے کھینچا۔ ہرپال نے ہلکی سی مزاحمت کی اور اس طرح اس کے ساتھ آہستہ، آہستہ چلنے لگا جیسے وہ یہی چاہتا تھا۔ جیسے اسے نمک کی بوریوں کے لدنے کا انتظار نہیں تھا۔ بلکہ بھاگوناتھ کا انتظار تھا۔ بھاگوناتھ جس کے گودام ہمیشہ بھرے رہتے تھے اور جو شب کے سناٹے میں غیر قانونی طور پر کشتیوں کے ذریعہ مال سرحد پار بھیجتا تھا۔

بازار کے پچھواڑے سے ہوتے ہوئے تینوں بستی میں پہنچ گئے اور ایک سُنسان گلی سے گزرتے ہوئے ایک مکان کے سامنے جاکر ٹھہر گئے۔ بھاگو ناتھ کے ساتھ جو دوسرا آدمی تھا، وہ اس کا گماشتہ تھا۔ اس نے مکان میں داخل ہوکر بیٹھک کا بیرونی دروازہ کھول دیا۔ ہرپال چپ چاپ بھاگو ناتھ کے ہمراہ بیٹھک میں چلا گیا۔ سامنے طاق میں لالٹین روشن تھی جس کی پھیکی، پھیکی روشنی پتھروں کی دیوار والے نیم کشادہ کمرے میں بہت مدھم معلوم ہو رہی تھی۔ دیوار کے پاس کونے میں کوئی سکڑا سکڑایا بیٹھا تھا۔ ہرپال نے اسے حیرت زدہ نظروں سے دیکھا۔ مگر خاموش کھڑا رہا۔ بھاگو ناتھ نے دروازہ بند کیا۔ لالٹین اٹھائی اور اس کونے کے نزدیک جاکر بولا۔

"ذرا اپنی گردن تو اٹھا"

اس نے گردن اٹھاکر بھاگو ناتھ کی طرف دیکھا۔ ہرپال نے اس پر گہری نظر ڈالی۔ اور اندازہ لگایا کہ وہ نیپال کے شمالی کوہستانوں کی رہنے والی ایک نوجوان لڑکی تھی۔ بھاگو ناتھ نے ہرپال کو قریب بلایا۔ لالٹین اوپر اٹھائی اور لڑکی کے چہرے کے بالکل نزدیک لے جاکر کہنے لگا۔

"کہئے کیا خیال ہے؟"

ہرپال سوچنے لگا کہ لڑکی کی آنکھیں بڑی، بڑی اور شفاف ہیں اس کے رخساروں پر دوشیزگی کا نکھار ہے مگر اس کے چہرے پر ہلکی، ہلکی افسردگی بھی ہے، جسے گہری خاموشی نے اور غمناک بنا دیا ہے۔ وہ اس قدر سہمی ہوئی معلوم ہو رہی تھی، جیسے بھاگو ناتھ کی طرف دیکھتے ہی دیکھتے رو دے گی اور اس کی لانبی پلکیں آنسوؤں سے بھیگ جائیں گی۔ لیکن بھاگو ناتھ اس کے احساسات سے بے نیاز خالص کاروباری انداز میں مسکرا رہا تھا۔ جھکی ہوئی مونچھوں کی اوٹ سے ابھرتی ہوئی اس کی مسکراہٹ گھیکوار کی طرح لیسدار معلوم ہو رہی تھی۔

بھاگو ناتھ نے یکایک ہلکا قہقہہ لگایا اور بڑی بے تکلفی سے بولا "انسپکٹر صاحب! تم تو اس طرح دیکھ رہے ہو کہ مجھے تو جان پڑتا ہے کہ اسے اپنے ساتھ لے جائے بغیر رہو گے نہیں۔ چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ گھر پر پڑی رہے گی۔ کچھ کام کاج ہی کر دیا کریگی۔"

ہرپال گھبرا کر بولا "نہیں ساہو جی مجھے ایسی کوئی ضرورت نہیں میرے پاس چپراسی ہے وہ گھر کی سب دیکھ بھال کر لیتا ہے۔"

مگر بھاگوناتھ اسی طرح بے تکلفی سے ہنستا رہا۔ "اب مجھ سے زیادہ نہ بنئے۔ میں نے بہت دنیا دیکھی ہے۔" اس نے گماشتہ کو آواز دے کر کہا۔ "رام چند! بوڑھے کو اندر بھیج دو۔"

ذرا ہی دیر بعد گٹھے ہوئے جسم کا ایک کبڑا سا بوڑھا کمرے کے اندر آگیا۔ رخساروں کی ہڈیوں میں دبی ہوئی چھوٹی، چھوٹی باریک آنکھیں۔ ٹھوڑی پر ہلکی سی ملگجی داڑھی اور کانوں میں پڑے ہوئے بڑے، بڑے چاندی کے بالے۔ وہ منگول نسل کا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے چہرے پر زخموں کے ایسے گہرے، گہرے نشانات تھے۔ کہ وہ بڑا ہیبتناک نظر آرہا تھا ہرپال نے لال ٹین کی دھندلی روشنی میں اسے دیکھا تو دم بخود رہ گیا مگر بھاگو ناتھ بوڑھے کے خوفناک چہرے سے مطلق خائف نہ ہوا۔ بالکل کاروباری انداز میں پوچھنے لگا۔

"بولو تمھیں کتنا روپیہ دیا جائے؟"

بوڑھے نے احمقوں کی طرح ہرپال کو گھور کر دیکھا اور بھاگوناتھ سے کہنے لگا۔ "بس اتنا ہی لے گا ساہوجی جتنا بتایا ہے۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر چار انگلیاں سامنے کر دیں۔

بھاگوناتھ نے جیب سے چار سو روپے کے نوٹ نکال کر اسے دیدیئے۔ "اچھا جا تیری ہی بات سہی۔ پر کسی کو کچھ معلوم نہ ہو۔ سویرا ہونے سے پہلے ہی پہلے یہاں سے نکل جانا۔" بوڑھے نے نوٹوں کو گنتے ہوئے اثبات میں گردن ہلادی۔

ہرپال چپ چاپ کھڑا سوچ رہا تھا کہ بھاگوناتھ بڑا باتونی ہے۔ ایسا کاٹیاں ہے کہ اس کی اسمگلنگ کو کوئی روک نہیں سکتا۔ وہ ہر طرح کی رشوت دے سکتا ہے۔ اور اس بوڑھے منگول کا چہرہ کتنا خونخوار ہے اور یہ لڑکی کتنی سہمی ہوئی نظر آرہی ہے۔ اس کی آنکھیں شفاف ہیں اور رخساروں پر دوشیزگی کا نکھار ہے۔ وہ لڑکی کو اپنے ہمراہ لے جائے گا۔ اسے اس خونخوار بوڑھے کے پاس نہیں رہنا چاہیئے لیکن وہ اسے اپنے ساتھ کیسے رکھ سکتا ہے۔ نہ معلوم بعد میں کیا ہو۔

ہرپال اسی طرح کھڑا سوچتا رہا۔ اس کی الجھن بڑھتی گئی اور خونخوار چہرے والا کبڑا منگول کمرے سے باہر چلا گیا۔ بھاگوناتھ اس کے قریب آکر ہنسنے لگا۔ وہی گھیکوار کی سی لیسدار ہنسی اور پھڑکتی ہوئی مونچھیں۔ وہ ہرپال کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"اجی آپ سوچ کیا رہے ہیں۔ ہمیں بھی کبھار کچھ سیوا کر لینے دیا کیجیے۔" اس نے خوشامد سے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ "ہم غریبوں پر کچھ تو دیا کیجیے۔" اس نے اچانک کاروباری پینترا بدلا۔ اور حرف مطلب زبان پر لایا۔ "بس تھوڑی سی ہی بوریاں جائیں گی۔ آپ اطمینان رکھئے اس پار بھی سب اپنے ہی آدمی ہیں۔ یوں بھی میرے ہوتے ہوئے آپ پر کہیں آنچ آسکتی ہے۔"

ہرپال آہستہ سے بولا۔ "ساہو جی آپ بھی مزے دار آدمی ہیں۔" اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔

بھاگوناتھ ٹھٹھا مار کر ہنسنے لگا۔ ہرپال کو بھی ہنسی آگئی۔ اس نے ایک نظر لڑکی پر ڈالی۔ وہ ٹکٹکی باندھے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ہرپال نے طے کر لیا کہ اسے اپنے ہمراہ سردار نگر ضرور لے جائے گا۔ کل کوس بھر کا تو راستہ ہی ہے۔ اور رات بھی کچھ ایسی زیادہ نہیں ہوئی وہ اسے لے کر ابھی جا سکتا ہے۔

وہ بھاگوناتھ کی بیٹھک سے نکل کر چودھری رکھنام کے مکان کی طرف چل دیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے اپنی بندوق اٹھائی۔ اسے پشت پر لٹکایا اور کارتوس کی پیٹی درست کر کے کمر سے باندھ لی۔ ہرپال واپس بھاگوناتھ کی بیٹھک پر پہنچا۔ لڑکی کو اپنے ساتھ لیا اور سنسان پگڈنڈیوں سے گزرتا ہوا نشیب میں چلنے لگا۔ آس پاس کھیت تھے، جن پر کہرے کی ہلکی نیلی، نیلی دھند چھائی ہوئی تھی۔

کوئی میل بھر چلنے کے بعد دونوں موٹر روڈ پر آگئے اور ساتھ، ساتھ چلنے لگے۔ آگے بڑھے تو ایک پہاڑی ندی آگئی جو دریائے کوڑیالا ہی کی شاخ تھی۔ ندی کے پل پر سے گزرتے ہوئے انہوں نے دیکھا کہ نیچے پانی پتھروں سے ٹکرا کر شور مچاتا ہوا تیزی سے بہہ رہا تھا۔ پل کے دوسرے کنارے پر ایک جھکی ہوئی چٹان تھی۔

ہرپال چٹان کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ بھری ہوئی ہوا کھڑوں میں سیٹیاں بجاتی ہوئی گزر رہی تھی۔ دائیں ہاتھ کو وہ درہ تھا، جس کے درمیان سے ایک پگڈنڈی بل کھاتی ہوئی اوپر پہاڑ پر چلی گئی تھی۔ پہاڑ کی چوٹی پر شرت دیوی کا خوبصورت مندر تھا، جس کے درشن کو دور، دور سے یاتری آتے تھے۔ ہرپال خاموش کھڑا غور کر رہا تھا کہ اس خطرناک راستے سے یاتری کس طرح اوپر پہاڑی پر پہنچ جاتے ہیں۔ پگڈنڈی اتنی تنگ تھی کہ ایک خچر مشکل سے گزر سکتا تھا۔ اس کے ایک جانب پہاڑ تھا اور دوسری جانب گہرے، گہرے کھڈ مگرمچھ کی طرح منہ کھولے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔

ہرپال کو دفعتاً لڑکی کا خیال آگیا۔ اس نے لڑکی کو قریب بلایا۔ وہ چٹان سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔

ہرپال نے ٹھنڈے پتھر پر اطمینان سے بیٹھ کر اس کے شانے کو تھپکا، مسکرا کر پوچھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"سارنا!" اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

ہرپال نے کہا۔ "اوپر چٹان پر آجاؤ۔"

چٹان اونچی تھی۔ سارنا کوشش کے باوجود اُوپر نہ پہنچ سکی۔ ہرپال نے اس کے دونوں بازو پکڑے اور اُوپر اٹھالیا۔ سارنا کچھ نہ بولی۔ وُہ بالکل گُم صُم تھی، اداس اور کھوئی ہوئی نظر آرہی تھی۔

دونوں ذرا دیر خاموش بیٹھے رہے، پھر ہرپال نے پشت پر سے بندوق اتاری۔ اس میں کارتوس ڈالا اور ندی کی جانب نالی کا رُخ کرکے لبلبی دبادی۔ گولی وادی کے گہرے سناٹے میں زور سے چیخی۔ اس کی کڑکتی ہوئی آواز چٹانوں سے ٹکرا کر دیر تک تھرتھراتی رہی۔ درختوں تلے خشک پتے ہولے، ہولے کھڑکھڑانے لگے۔ ہرپال چند منٹ چپ رہا۔ پھر اس نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ خوفزدہ نظر آرہی تھی۔ ہرپال مسکرا کر کہنے لگا۔

"آؤ اب چلیں۔ جنگلی جانور جو ندی پر پانی پینے آئے تھے۔ بندوق کی آواز سے بھاگ گئے ہیں۔"

دونوں بلندی سے اتر کر سڑک پر چلنے لگے۔ لڑکی بالکل خاموش تھی۔ ہرپال نے بھی کوئی بات نہیں کی۔

ندی کا پانی گنگناتا ہوا بہہ رہا تھا۔ ہوا اپنے بازو پھڑپھڑا رہی تھی۔ سردی بہت شدید تھی۔ ہرپال نے چلتے، چلتے محسوس کیا کہ اس کے پیر بوجھل ہوتے جارہے ہیں۔ اس کی پنڈلیوں کا گوشت سکڑتا جارہا ہے۔ اس نے زور، زور سے پیروں کو زمین پر پٹکنا شروع کردیا تاکہ خون رگوں میں منجمد نہ ہوجائے۔ اس نے گردن موڑ کر سارنا کی طرف دیکھا۔ وہ برہنہ پا تھی۔ اور ٹھنڈے پتھروں پر خاموش چل رہی تھی۔ اس کی پشت پر بید کی شاخوں سے بنی ہوئی ٹوکری لٹک رہی تھی جس میں میلے کچیلے کپڑے ٹھنسے ہوئے تھے۔ اس کے بوجھ سے سارنا کی کمر کچھ خمیدہ ہوگئی تھی۔ مگر وہ بڑی بے نیازی سے چل رہی تھی۔ نہ اسے گنگناتی ہوئی ندی کا خیال تھا۔ نہ تیکھی ہواؤں کے یخ بستہ جھونکوں کا۔ ویران سڑک پر وہ اس طرح چل رہی تھی جیسے اس کی کوئی منزل نہیں۔ جیسے اس کا کوئی مقصد نہیں۔ وہ زندگی بھر یونہی چلتی رہے گی۔ خاموش اور اداس۔

ہرپال سوچ رہا تھا کہ سردی کا زور بڑھتا جا رہا ہے۔ اس کی پنڈلیاں چٹخ رہی ہیں۔ چہرہ بالکل سن ہو گیا ہے۔ اور کہر کی گہری دھند میں راستہ کے نشان مٹتے جا رہے ہیں۔ اسے اس طرح رات گئے نہیں آنا چاہئے تھا۔ وہ سارنا کی خاطر چلنے کے لئے آمادہ ہوا تھا۔ اور سارنا گہری خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھی سارنا جسے بھاگو ناتھ نے اسے رشوت میں دیا تھا۔ اور جسے کبڑا منگول چار سو روپے میں بھاگو ناتھ کے ہاتھ بیچ گیا تھا۔ لیکن اسے سارنا کی ضرورت نہیں ہے۔ اسے ایک اعلیٰ النسل کا گھوڑا درکار ہے جس پر بیٹھ کر وہ سرحدی علاقہ کا دورہ کر سکتا ہے۔ اداس اور خاموش لڑکی نے تو اسے خواہ مخواہ الجھن میں مبتلا کر دیا۔ اگر اس کا یہاں سے تبادلہ ہو گیا تو وہ اسے اپنے ساتھ کیسے لے جائیگا۔ یہ سوچتے، سوچتے ہرپال چونک پڑا پھر اس نے خود کو مطمئن بھی کر لیا کہ یہاں سے جاتے ہوئے سارنا کو کسی چپراسی کے پاس چھوڑ جائے گا۔ بھلا وہ اس ذلیل لڑکی کو لئے ہوئے کہاں، کہاں گھومتا پھرے گا۔

ندی اونچے، اونچے پہاڑوں کے گرد گھوم کر ایک بار پھر سامنے آ گئی تھی۔ اس کے اگلے پل پر سے ایک تنگ راستہ مشرق کی طرف مڑ گیا تھا جس کے نکڑ پر لگے ہوئے محکمہ جنگلات کے بوسیدہ بورڈ پر لکھا تھا "سردار نگر نصف میل"۔ ہرپال نے بورڈ کو پہچان لیا اور تنگ راستہ پر چلنے لگا۔ اس نے پیکٹ سے سگریٹ نکالی۔ اسے سلگایا اور ایک لمبا کش لگا کر دھوئیں کے مرغولے بنانے لگا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ پہاڑی عورتوں میں سگریٹ نوشی کا عام چلن ہے۔ اس نے ایک سگریٹ نکال کر سارنا کی جانب بڑھائی۔

"سگریٹ پیو گی؟"

سارنا نے سگریٹ لیتے ہوئے گردن ہلا دی۔

دیو قامت درختوں کے نیچے سے گزرتا ہوا راستہ بہت تاریک تھا۔ کہر کا دھندلکا اور گہرا ہو گیا تھا۔ ہرپال نے بندوق میں پھر کارتوس ڈالا اور اسے سنبھالے ہوئے مستعدی سے چلنے لگا۔ وہ چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا جاتا۔ سارنا اس کے پیچھے، پیچھے چل رہی تھی۔ دونوں کے قدموں کی آہٹ سنسان رہگذار پر آسیب زدہ سی معلوم ہو رہی تھی۔ گنجان درختوں کی شاخوں سے الجھتے ہوئے ہوا کے تھپیڑے مدھم سُروں میں بجتے ہوئے ساز کی مانند جھنکار رہے تھے۔ دونوں خاموشی سے چلتے رہے۔

جب وہ سردار نگر پہنچے تو ہر طرف گہری خاموشی چھائی تھی۔ گلیوں میں گھومتے ہوئے آوارہ کتے انہیں دیکھ کر بھونکنے لگے۔ ہرپال اپنے ٹھکانے پر پہنچا۔ بند دروازے پر دستک دی۔ چپراسی ابھی تک جاگ رہا تھا۔ وہ اس کی واپسی کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ اس نے اُٹھ کر فوراً دروازہ کھولا۔ ہرپال گھر میں داخل ہوا تو چپراسی نے مطلع کیا کہ کلکٹر صاحب شام ہی کو سردار نگر پہنچ گئے تھے اور ڈاک بنگلے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان کا اردلی ہرپال کو بلانے دو بار آچکا تھا۔ ہرپال نے سوچا کہ صبح اٹھتے ہی ان کے پاس جائے گا۔ اب تو رات بھی زیادہ ہو گئی۔ کلکٹر صاحب سو رہے ہوں گے۔ وہ خود بھی تھک کر نڈھال ہو گیا تھا۔

ہرپال سویرے بہت تڑکے بیدار ہو گیا۔ اس نے چپراسی کو بلا کر بتایا کہ سارنا اب یہیں رہے گی اور گھر کا سب کام کاج کریگی۔ وہ اسے سارا کام اچھی طرح سمجھا دے اور قصبہ کے بازار سے سارنا کے لئے کپڑے خرید لائے۔ سارنا کا لباس بہت گندا تھا۔ اس کے لباس سے سڑی ہوئی مچھلیوں کی سی تیز بو اٹھتی تھی جس سے ہرپال کو سر میں درد محسوس ہونے لگا تھا۔

دن کی پہلی سنہری روشنی کے ساتھ وہ گھر سے نکلا اور ڈاک بنگلے کی طرف چل دیا۔ کلکٹر اس کا منتظر تھا۔

کلکٹر کے ساتھ سرحدی علاقہ کی بستیوں کا دورہ کرتے ہوئے ہرپال ہفتہ بھر تک مصروف رہا۔ ان سات راتوں کو تنہائی میں اس نے سارنا کے متعلق صرف اسی قدر سوچا تھا کہ کہیں وہ بھاگ نہ گئی ہو۔ کہیں وہ بوڑھا خونخوار منگول اسے آکر لے نہ گیا ہو۔ لیکن جب وہ واپس اپنے گھر پہنچا تو سارنا موجود تھی۔ سفید لباس میں وہ کنواریوں کی طرح دلآویز نظر آرہی تھی۔ اس کے چہرے پر چھائے ہوئے مایوسی کے دھندلے نشانات مٹ چکے تھے۔ اس کے گالوں پر جوانی کی دمک تھی۔ آنکھیں اور شفاف ہو گئی تھیں۔ لیکن خود ہرپال سہما ہوا تھا۔ راستہ ہی میں اسے معلوم ہو گیا تھا کہ علاقہ میں طاعون بڑی تیزی سے پھیلتا جا رہا ہے بستیاں ویران ہوتی جا رہی ہیں۔ لوگ مکانوں کو چھوڑ چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں۔ سردار نگر میں بسنے والے بھی گھبرائے ہوئے نظر آرہے تھے۔ آبادی پر ایک مضمحل سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہ سارنا کے پاس زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔ گھر سے نکل کر چپراسی کے کوارٹر کی طرف چلا گیا۔ چپراسی بھی خوف زدہ معلوم ہو رہا تھا۔

ہرپال نے اس سے پوچھا۔ "بندرا بہت گھبرائے ہوئے نظر آرہے ہو۔ کیا بات ہے؟"

وہ کہنے لگا "سرکار! یہاں تو بڑی وبا پھیلی ہوئی ہے۔ قصبہ میں اب تک کئی موتیں ہو چکی ہیں۔ ابھی دیکھئے اور کیا ہونے والا ہے۔ یہاں بھی وہ ڈراؤنی آواز سنائی دینے لگی ہے۔ کل رات کو تو مجھے بھی کچھ شبہ ہوا تھا۔"

ہرپال نے گھبرا کر کہا "آواز کیسی؟"

"سرکار! لوگ کہتے ہیں کہ جب سے طاعون پھیلا ہے۔ بستیوں میں کوئی بلا رات کے سناٹے میں چیختی ہوئی گزرتی ہے۔ جس بستی میں اس کی آواز سنائی پڑی۔ وہاں پوری آبادی کی آبادی کا ناس ہو گیا۔"

ہرپال نے اسے ڈانٹا "یہ سب واہیات باتیں ہیں۔ ہاں طاعون ضرور پھیلا ہوا ہے۔"

وہ بندرا کے کواٹر سے واپس آیا اور خاموشی سے بستر پر دراز ہو گیا۔ وہ بستر پر لیٹا ہوا سوچتا رہا کہ یہ دیہات کے رہنے والے بھی کتنے جاہل ہوتے ہیں۔ بھلا کوئی بلا بھی چیختی ہوئی گزر سکتی ہے۔ طاعون نہ ہوا بھوت ہو گیا کہ جس کے سر پر چاہا چڑھ کر جھومنے لگا۔ انھیں ابھی تک یہ نہیں معلوم کہ بیماری زہریلے جراثیم سے پھیلتی ہے۔ لیکن یہ سمجھنے اور سوچنے کے باوجود وہ سہما ہوا تھا۔ اسے کچھ وحشت سی ہو رہی تھی۔ سارنا باہر دھوپ میں بیٹھی تھی۔ ہرپال نے اسے آواز دے کر اپنے پاس بلایا۔ کہنے لگا۔

"میں تو جب تک دورہ پر رہا یہی سوچتا رہا کہ کہیں تم یہاں سے چلی نہ گئی ہو۔"

سارنا مسکرا کر بولی "کہاں؟"

ہرپال بولا "اپنے گھر اور کہاں۔ تمھیں اپنا دیس نہیں یاد آتا؟"

سارنا ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ "نہیں!"

ہرپال کو یقین نہ آیا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ قطعی جھوٹ بول رہی تھی۔ اس نے پوچھا "تمھیں یہ گھر پسند ہے؟"

سارنا بولی "بہت۔"

ہرپال کے ذہن میں معاً ایک لذت ناک خیال بیدار ہوا۔ پوچھنے لگا "اور میں؟"

سارنا نے اسی شگفتہ مسکراہٹ سے جواب دیا۔ "ہاں تم بھی۔" اس کے چہرے پر نہ حیا کی سرخی تھی۔ نہ کوئی جذباتی

ہیجان تھا۔

ہرپال کو اس وقت سارنا بڑی اچھی معلوم ہوئی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اس سے یونہی باتیں کرتا رہے اور وہ مسکراتی رہے۔ اس نے دریافت کیا۔ "وہ بوڑھا تمھیں یہاں کیسے لے آیا؟"

سارنا کہنے لگی۔ "وہ تو میرا بابا ہے۔"

ہرپال چونک پڑا۔ "ارے وہ تمہارا پتا ہے۔ تمھیں اس نے بیچ کیوں دیا۔ اُسے تم سے کوئی پیار نہیں؟"

وہ بولی "نہیں وہ اپنی بھیڑوں سے پیار کرتا ہے۔ اپنی چمڑا گاہوں سے پیار کرتا ہے اور کسی سے نہیں۔ وہ تبت کا رہنے والا ہے۔ اور اسے اپنا دیش بہت اچھا لگتا ہے۔ وہ کہتا ہے شام پڑے جب سورج ٹیلوں کے پیچھے ڈوبنے لگتا ہے اور آسمان پر لالی پھیل جاتی ہے تو دن بھر محنت کرنے والے سارے لوگ اپنا کام چھوڑ کر پچھم کی اور دیکھتے ہیں۔ اس وقت کتنا اچھا لگتا ہے۔ تبت کے رہنے والے صرف شام کی لالی کے لئے جیتے ہیں۔ یہی ان کا سب کچھ ہے۔ اسے وہ بھول نہیں سکتے۔"

"مگر تم تو نیپال کے علاقے کی رہنے والی معلوم ہوتی ہو۔" ہرپال نے قیاس آرائی کی۔

سارنا نے کہا۔ "میرے بابا نے اپنے ملک میں کسی سے ادھار لیا تھا، جسے وہ ادا نہ کر سکا۔ تب بڑے لامہ نے اسے اپنے دیش سے نکال دیا تھا۔ اس نے ہماری بستی میں آکر میری ماں سے بیاہ کر لیا۔"

ہرپال نے پوچھا۔ "تمہاری ماں زندہ ہے؟"

"مر گئی۔ میں نے تو اسے دیکھا بھی نہیں۔ مجھے تو بابا نے پالا ہے۔"

ہرپال نے طنزیہ لہجہ میں کہا۔ "کسی کے ہاتھ بیچ دینے کے لئے۔"

سارنا نے گردن ہلا کر اقرار کیا۔ "ہاں!" اس کے چہرے پر گہری خاموشی چھا گئی۔

ہرپال سوچنے لگا کہ یہ لڑکی بے چاری کتنی دکھیاری ہے۔ اس کا کوئی بھی تو سہارا نہیں۔ اس کے چہرے کی مایوسی اس کی دردناک زندگی کا سایہ ہی تو ہے اور وہ کبڑا منگول خونخوار بھی ہے اور کمینہ بھی۔ اور یہ پہاڑوں میں بسنے والے باشندے سب ذلیل ہوتے ہیں۔ وہ اپنے علاقے سے باہر آکر اپنی لڑکیوں کو فروخت کرتے ہیں، روپئے کی انکی نظروں میں بڑی اہمیت ہے اور ماں تا کا ان کے نزدیک کوئی وجود نہیں۔ نفرت کا یہ احساس

پہاڑی لوگوں کے خلاف ہرپال کے دل میں غالباً پہلی بار ابھرا تھا۔ ورنہ اس نے انہیں ہمیشہ ہمدردی سے دیکھا تھا۔ آغازِ سرما کے ساتھ ہی وہ پہاڑوں سے اتر کر میدانی علاقے میں آنا شروع ہو جاتے تھے۔ انکی زبوں حالی سے ہرپال بہت متاثر ہوتا تھا۔ ان کا نیم برہنہ جسم گندا لباس، میل کی سیاہی سے دھندلائے ہوئے بے رونق چہرے۔ بڑے بڑے، سردی سے پھٹے ہوئے برہنہ پیر اور سخت محنت سے بدن پر ابھری ہوئی بدنما رگیں۔ وہ اس قدر پریشان حال معلوم ہوتے کہ ہرپال دل ہی دل میں سوچتا کہ یہ لوگ کتنے مصیبت زدہ اور دکھی ہیں۔ انھیں زندگی کا کوئی بھی سکھ نصیب نہیں۔ لیکن اب اسے ان پہاڑی لوگوں سے نفرت ہو گئی تھی۔ وہ غور کرنے لگا کہ یہ مرجھائے ہوئے چہروں والے گندے انسان کس قدر خود غرض اور کمینے ہوتے ہیں۔

کلکٹر دورہ ختم کر کے جا چکا تھا۔ ہرپال کی مصروفیات کم ہو گئیں۔ سرحدی علاقے میں شدت سے طاعون کی وبا پھیلی تھی، لہٰذا وہ چیک پوسٹ پر معائنہ کے لئے بھی نہ گیا۔ اس کا بیشتر وقت اب گھر ہی پر گزرتا۔ سارنا اب اور نکھر گئی تھی۔ اس کا گلابی چہرہ اور خوبصورت نظر آتا۔ آنکھیں شفاف جھیلوں کی مانند جھلملاتیں۔ سردار نگر بھی طاعون سے محفوظ نہ تھا، لیکن نہ ہرپال کچھ زیادہ پریشان تھا، نہ سارنا۔

مگر ایک شام جب یہ معلوم ہوا کہ بندرا طاعون کے ڈر سے دن ڈوبتے ہی بھاگ گیا ہے تو ہرپال بھی خوفزدہ ہو گیا۔ رات کو وہ ذہنی پریشانی کے عالم میں سویا۔ ناگاہ شب کے گہرے سناٹے میں رونے کی دردناک آوازیں ابھریں۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔ کچھ عورتیں بڑے رقت انگیز انداز میں بین کر رہی تھیں۔ ہرپال نے سوچا شاید کوئی مر گیا ہے۔ شاید کوئی طاعون کا نشانہ بن گیا ہے۔ وہ آنکھیں بند کئے ہوئے خاموش پڑا رہا۔ دردناک چیخیں سناٹے میں تھرتھراتی رہیں۔ پھر اس نے کہیں نزدیک ہی ایک ہولناک آواز سنی۔ کوئی بڑی ڈراؤنی آواز میں صدا لگا رہا تھا۔ "چُنر یا ہو، اُو"۔ اسے محسوس ہوا کہ رونے والی عورتوں کی آوازیں خاموش ہو گئی ہیں۔ اور یہ بھیانک صدا تاریک وادیوں میں آنے والے طوفان کی طرح گرجدار ہے۔

ہرپال سکتے کے سے عالم میں سہما ہوا خاموش لیٹا رہا۔ اس دفعہ وہ بھیانک صدا بالکل اس کے گھر کے پچھواڑے ابھری۔ ہرپال کی تمام قوتِ احساس جیسے فنا ہو گئی۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ وہ چھت کو تک رہا تھا۔ پھر اسے معلوم ہوا کہ سارنا نے اپنے پلنگ پر کروٹ بدلی ہے۔ اس کے قدموں کی آہٹ سنائی

دی، پھر دروازہ کھلنے کی چرچراہٹ ہوئی۔ سارنا گھر سے باہر جا چکی تھی۔ ہرپال سہما ہوا لیٹا رہا۔

ذرا دیر بعد دروازہ پھر کھلا اور لیمپ کی دھندلی روشنی میں ہرپال نے دیکھا، سارنا کے برابر کبڑا منگول کھڑا تھا۔ وہی رخساروں کی ہڈیوں میں دبی ہوئی تیز آنکھیں۔ وہی داڑھی پر تھوڑے سے بال۔ وہی کانوں میں لٹکے ہوئے چاندی کے بالے۔ اس کا چہرہ زخموں کے نشانات سے اسی طرح ہیبت ناک نظر آ رہا تھا۔

ہرپال کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اتنی رات گئے کیوں آیا ہے۔ وہ کیا چاہتا ہے۔ آخر گھبرا کر وہ اٹھ بیٹھا اور وحشت زدہ نظروں سے بوڑھے کو دیکھنے لگا۔

بوڑھے نے اپنی کمر سے نوٹوں کا بنڈل نکالا اور ہرپال کے سامنے پھینک دیا۔ "مجھے یہ روپیہ نہیں چاہیئے۔ مجھے اپنی چراگاہیں نہیں چاہیئے۔ مجھے اپنے مویشی نہیں چاہیئے۔ میں اپنے دیش جانا نہیں چاہتا۔ مجھے اپنی بچی چاہیئے۔ میں اس کے بنا جی نہیں سکتا۔ میں اسے بستی بستی ڈھونڈتا رہا ہوں۔"

ہرپال ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اسے فوراً اندازہ ہو گیا کہ یہ بھیانک صدا اسی نے لگائی تھی۔ اس کا چہرہ خونخوار ضرور تھا۔ مگر وہ ایک باپ بھی تھا۔ بوڑھے نے ہرپال کے جواب کا انتظار بھی نہیں کیا۔ سارنا کا بازو پکڑا اور اسے کمرے کے باہر لے جانا چاہا، مگر سارنا اس کے ہمراہ جانے کے لئے آمادہ نہ تھی وہ اپنا بازو چھڑاتے ہوئے زور زور سے چیخنے لگی۔ پھر اس نے غضب ناک ہو کر بوڑھے کی کلائی پر اپنا منہ رکھ کر زور سے کاٹا۔ بازو چھڑایا اور بھاگ کر باہر چلی گئی۔

بوڑھا خاموش کھڑا رہا۔ اس کی برہنہ کلائی سے خون کی ایک ہلکی سی دھار نکل رہی تھی۔ خون کی بوندیں فرش پر ٹپک ٹپک کر گر رہی تھیں۔ بوڑھا ذرا دیر خاموش کھڑا رہا۔ پھر سر جھکائے ہوئے وہ بھی باہر چلا گیا۔ اس کے چہرے پر نہ جھنجھلاہٹ تھی اور نہ کوئی اذیت۔ صرف گہری مٹیالی سی زردی جو ہر پہاڑی باشندے کے چہرے پر نظر آتی ہے۔

اس کے جانے کے بعد ہرپال بھی اٹھ کر باہر چلا گیا۔ دور دھندلکے میں بوڑھے کے قدموں کی ہلکی، ہلکی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔ ہرپال سارنا کو تلاش کرنے لگا۔ وہ وہاں موجود نہ تھی۔ ہرپال نے سوچا، عجیب دیوانی لڑکی تھی۔ بے چارے بوڑھے کے ہاتھ میں بری طرح کاٹ کھایا اور پھر اس کے ساتھ چلی بھی گئی۔ مگر اس کے

جانے کا ہر پال کو کوئی ملال نہ تھا۔ وہ فطری طور پر بڑا حساس واقع ہوا تھا۔ اگر بوڑھا بغیر سارنا کے چلا جاتا تو اسے واقعی صدمہ ہوتا۔

لیکن جب گھر میں واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ سارنا میز کے نیچے اندھیرے میں دبکی ہوئی بیٹھی تھی۔ وہ اس کے آنے سے قبل ہی کمرے میں آگئی تھی۔

ہر پال نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا "تو اپنے بابا کے ساتھ کیوں نہیں گئی؟" سارنا نے انکار میں گردن ہلادی۔

"نہیں! میں نہیں جاؤں گی۔"

"کیوں؟" ہر پال نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔

سارنا اندھیرے سے نکل کر روشنی میں آئی۔ آگے بڑھی اور ہر پال کے بازوؤں سے چمٹ گئی۔ "نہیں میں نہیں جاؤں گی۔" وہ بچوں کی طرح بلک، بلک کر رونے لگی۔ ہر پال غصہ سے تلملا اٹھا۔ اس نے سارنا کو زور سے پیچھے ڈھکیل دیا۔ وہ دیوار سے ٹکرا کر فرش پر گر پڑی۔ لیکن۔ فوراً ہی اُٹھ کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو خشک ہو چکے تھے۔ چہرے پر جھنجھلاہٹ بھی نہ تھی۔ ہر پال اور بپھر گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر سارنا کے رخسار پر زور سے تھپڑ مارا اور چلا کر بولا۔

"ابھی یہاں سے چلی جا۔"

مگر وہ خاموش کھڑی ہر پال کو دیکھتی رہی۔ ہر پال نے سوچا کہ اب وہ کیا کرے؟ وہ نڈھال ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔ لیٹے لیٹے معاً خیال آیا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اس سے محبّت کرنے لگی ہے۔ لیکن محبّت کا یہ انداز اسے کچھ گھناؤنا سا معلوم ہوا۔ ذلت کا یہ احساس، جو نہ بالکل ذلّت ہی تھی اور نہ نفرت۔ وہ بستر پر لیٹا رہا اور سوچتا رہا۔

وہ قد آور اور خوش شکل نوجوان تھا۔ پڑھا لکھا تھا۔ برسرِ روزگار تھا اور گھر سے بھی آسودہ حال تھا۔ ذات کا کھتری تھا۔ وہ سارنا ایسی فلاکت زدہ اور نچلے طبقے کی لڑکی سے محبّت نہیں کر سکتا تھا۔ شادی کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ مگر سارنا کی محبت کے خیال نے اس کی اہمیت خود اپنی نظروں میں بڑھا

دی۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ مسکرا کر سارنا کو دیکھا اور فخر سے گردن اونچی کر کے پوچھا۔

"اچھا یہ بتا سارنا! تو سچ مچ مجھ سے بہت پیار کرتی ہے؟"

سارنا نے گردن ہلا کر صاف انکار کر دیا۔ "نہیں!"

ہرپال حیرت سے چونک پڑا۔ جل کر پوچھا۔ "تو پھر تو یہاں کیوں رہنا چاہتی ہے؟"

سارنا نے کوئی جواب نہ دیا۔ بلکہ اپنی پیٹھ برہنہ کر کے اس کے سامنے کر دی۔ اس کی نرم نرم جلد پر گہرے گہرے سیاہ نشان ابھرے ہوئے تھے۔

ہرپال نے گھبرا کر دریافت کیا۔ "یہ کیا ہے؟"

سارنا بتانے لگی۔ "میں پہلے شہتیر دھوتی تھی۔ بہت بڑے بڑے اور بھاری شہتیر۔ ان شہتیروں کو پیٹھ پر لاد کر مجھے اوپر پہاڑی سے نیچے لانا پڑتا تھا۔ لمبے لمبے راستے تھے۔ بہت دیر تک ان کو پیٹھ پر لاد کر چلنا پڑتا تھا۔ ساری پیٹھ پر گھاؤ پڑ گئے تھے۔ بہت سے تو سڑنے لگے تھے۔ ان میں کیڑے پڑ گئے تھے۔"

ہرپال لرز کر رہ گیا۔ اس نے آہستہ سے پوچھا۔ "تم اتنی محنت کا کام کیوں کرتی تھیں؟"

سارنا نے بڑی بے باکی سے اپنا پیٹ کھول کر عریاں کر دیا۔ اس پر ایک بڑا سا بھورا دھبہ نظر آ رہا تھا۔ ہرپال کو اور تعجب ہوا۔ پوچھنے لگا۔ "یہ کیسے پڑ گیا؟"

سارنا نے اپنا پیٹ تھپ تھپا کر کہا۔ "جب کھانے کو نہیں ملتا تھا تو بابا کہتا تھا کہ پیٹ پر پتھر رکھ کر کپڑا لپیٹ لے۔ سو اس طرح یہاں کالا پڑ گیا ہے۔"

ہرپال خاموش بیٹھا ہوا یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ سارنا کے دل آویز چہرے پر مایوسی کے دبیز دھندلے سائے پھیل گئے، جو اس نے پہلے روز دیکھے تھے۔

تانتیا

کرفیو کی رات تھی۔ پت جھڑ کی تیز ہوائیں سسکیاں بھر رہی تھیں۔ ویران گلیوں میں کتے رو رہے تھے کیسانوا ہوٹل خاموشی میں اونگھتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ رقص گاہ کے ہنگامے سرد تھے۔ جام منہ اوندھائے پڑے تھے۔ باورچی خانے کی چمنی سے نہ دھواں نکل رہا تھا، نہ چنگاریاں اُڑ رہی تھی۔ باہر گلی میں کھلنے والی باورچی خانے کی کھڑکی بھی بند تھی۔ تانتیا دیوار کی اُوٹ میں خاموش بیٹھا تھا۔

جب بازاروں کی چہل پہل اُجڑ جاتی اور رات گہری ہو جاتی تو تانتیا اس تنگ و تاریک گلی میں داخل ہوتا۔ دھوئیں میں الجھی ہوئی باورچی خانے کی پھیکی، پھیکی روشنی دیکھتا۔ اور کھڑکی پہ ابھرنے والے انسانی سائے کا انتظار کرتا۔ لیکن جب دیر تک کوئی نظر نہ آتا تو وہ جھنجھلا کر چلّانے لگتا۔

"ابے کیا اپنے باپ کو بھول گئے سالو! یہ انتظاری کب تک ہو گی؟" باورچی خانے میں بیرے ٹھٹھا مار کر ہنستے۔ خانساماں کھڑکی سے گردن نکال کر کہتا۔ "ارے مراکیوں جاتا ہے۔ کوئی میز تو خالی ہونے دے۔" تانتیا مطمئن ہو جاتا۔ جھوم کر نعرہ لگاتا۔

"واہ کیا بات ہے تیری۔ جیو میرے راجہ۔"

بوڑھے خانساماں کو راجہ کہلوانے کا ارمان تھا۔ یا کوئی جذبۂ ہمدردی، یا محض احساسِ برتری اور یہ ارمان تھا، یا ہمدردی یا احساس برتری کہ خانساماں کو برابر یہ خیال ستاتا رہتا کہ باہر اندھیرے میں تانتیا بیٹھا ہے۔ سردی بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کے الجھے ہوئے مٹیالے بال اُوس میں بھیگتے جا رہے ہیں۔ اس کی بھوکی آنکھیں

کھڑکی کی طرف لگی ہیں۔ وہ ولایتی شراب کی تیز مہک پہ جان دیتا ہے۔ اس کی تلخی اسے مرغوب ہے۔ خان ساماں اپنے کام میں الجھا رہتا۔ بیرے مستعدی سے آکر آرڈر پر آرڈر سناتے اور خان ساماں کو تانتیا کا خیال ستاتا رہتا۔ رقص گاہ میں قہقہے کھنکتے رہتے۔ جام ٹکراتے رہتے۔ آرکسٹرا کے نغمے تھرتھراتے رہتے۔ پھر کوئی میز خالی ہوتی۔ پھر کوئی بیرا جھوٹی پلیٹوں میں بچا کھچا کھانا لے کر آتا۔ کسی گلاس میں بچی ہوئی شراب لے کر آتا۔ خان ساماں بچے کھچے کھانے کو ایک پلیٹ میں انڈیل کر ذرا قرینے سے لگاتا اور اس پہ گلاس کی جھوٹی شراب چھڑک دیتا۔ آگے بڑھتا اور کھڑکی پر جا کر کھڑا ہو جاتا۔ تانتیا اسے دیکھتے ہی بے تابی سے جھپٹتا۔ لیکن خان ساماں پیچھے ہٹ کر تانتیا کی بے صبری سے لطف اٹھاتا۔ "سالے اتنی جلدی۔ بیٹا اصلی شراب پڑی ہے۔ یوں تھوڑی ملے گی۔" تانتیا کی گرسنہ آنکھیں چمکنے لگتیں۔ ہونٹ پھڑپھڑانے لگتے اور بکھری ہوئی مونچھیں دانتوں سے الجھنے لگتیں۔ وہ خوشامد کرنے لگتا۔

"ارے کیوں جلا رہے ہو، پیٹ میں آگ لگ رہی ہے۔"

خان ساماں کو معاً بیروں کے سنائے ہوئے آرڈر یاد آجاتے۔ مینجر کی ڈانٹ ڈپٹ یاد آجاتی۔ وہ جلدی سے ہاتھ باہر نکالتا اور پلیٹ تانتیا کے ہاتھ میں تھما دیتا۔ تانتیا پلیٹ لے کر فوراً دونوں ایڑیاں جوڑتا اور ایک ہاتھ اٹھا کر خالص فوجی انداز سے سلیوٹ کرتا۔ مزے لے لے کر ہر چیز کھاتا۔ پاس کھڑے ہوئے اوارہ کتوں کو دھتکارتا۔ خان ساماں کو زور زور سے گالیاں دیتا اور خان ساماں بے وقوفوں کی طرح ہنستا رہتا۔ شاید اسے گالیاں کھانے کا بھی ارمان تھا۔

لیکن آج کھڑکی بند تھی۔ تانتیا چلایا بھی۔ خوشامد بھی کی اور گالیاں بھی دیں۔ بوڑھے خان ساماں کو نہ راجہ کہلوانے کا ارمان پیدا ہوا۔ نہ رگ ہمدردی پھڑکی۔ نہ احساس برتری نے ستایا اور نہ گالیوں پہ اسے ہنسی آئی۔ چند گھبرائے ہوئے بیروں کے ساتھ وہ بھی باورچی خانے میں سہما ہوا بیٹھا رہا۔

کھڑکی کھل نہ سکی۔ تانتیا نے مایوس ہو کر اندھیرے میں گلی کے فرش کو دونوں ہاتھوں سے ٹٹولنا شروع کر دیا۔ سوکھے ہوئے ٹوسٹوں کے کچھ ٹکڑے اسے مل گئے۔ اس نے ٹکڑوں کو منہ میں بھر کر چبانا شروع کر دیا۔ باسی مکھن کے کھٹے پن پر اسے شراب کی تلخی یاد آرہی تھی۔ نزدیک ہی ایک مریل کتا مزے سے ہڈی چچوڑ رہا تھا۔ تانتیا کو اس کے اس طرح ہڈی چچوڑنے پر الجھن ہونے لگی۔ اس نے جل کر اس کے ایک لات جما دی۔ "یہاں تو بیٹھے ترس رہے ہیں

اور یہ سالے موج اڑا رہے ہیں۔" کتا چیختا ہوا بھاگا۔ اور اس کی چیخیں فلک بوس عمارتوں سے ٹکرا کر گلی کی گہرائیوں میں گونجنے لگیں۔

گلی کے نکڑ پر لیمپ پوسٹ کی بتی جل رہی تھی۔ اس کی دھندلی روشنی میں پولس والوں کے سائے نظر آئے۔ وہ گشت پر نکلے تھے۔ اچانک کسی نے چیخ کو پوچھا۔ "کون ہے گلی میں؟" ساتھ ہی ٹارچ کی تیز روشنی تانتیا کے جسم پر پڑی۔ وہ بدحواس ہو کر دوسری سمت بھاگا۔ بندوق چلنے کی تیز آواز خاموشی میں ابھری گولی تانتیا کے پیر کے پاس سے چھچلتی ہوئی گزر گئی۔ وہ دیواروں کے اندھیرے میں دبکتا ہوا اس سڑک پر آ گیا جو کشادہ بھی تھی اور روشن بھی۔

تانتیا گھبرا کر ایک کوٹھی کے کھلے ہوئے پھاٹک میں داخل ہو گیا۔ اس نے لان عبور کیا اور بیرونی برآمدے میں پہنچ گیا۔ سب دروازے بند تھے۔ مگر کونے والے کمرے کی کھڑکی کھلی رہ گئی تھی۔ وہ اس پر چڑھ کر اندر کود گیا اور جھٹ کھڑکی بند کر دی۔

جب پولس والوں کے بھاری، بھاری بوٹوں کی آوازیں دور ہو گئیں اور سڑک پر سناٹا چھا گیا تو وہ سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ کمرے میں اندھیرا چھایا تھا۔ روشن دان سے روشنی کی ہلکی، ہلکی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ اس نے دیکھا دیوار کے پاس ایک لمبی میز تھی۔ اس پر کچھ کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔ کچھ کاغذات پھیلے ہوئے تھے۔ سگریٹ کا ایک ڈبا بھی موجود تھا۔ کمرہ خالی تھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ کوٹھی کے دوسرے حصے میں بھی نہ کوئی آہٹ تھی اور نہ آواز۔ خاموشی بہت گہری تھی۔ وہ میز کے پاس چلا گیا۔ سگریٹ کا ڈبا اٹھا کر کھولا۔ صرف ایک سگریٹ نکالی اور پھر اسی طرح میز پر رکھ دیا۔ مگر اس نے سگریٹ سلگائی نہیں۔ بلکہ برابر والے کمرے کا دروازہ کھول کر جھانکنے لگا۔ وہاں بھی کوئی نظر نہ آیا۔ وہ کمرے میں چلا گیا۔ اس کمرے میں بھی دھندلی روشنی تھی۔ فرش پر پرانے اخبارات بکھرے ہوئے تھے۔ دیوار کے پاس دو خالی پلنگ پڑے تھے۔ سامنے کھونٹی پر ایک پرانا گاؤن لٹک رہا تھا۔ تانتیا نے اس کو چھو کر دیکھا۔ گاؤن اونی کپڑے کا بنا ہوا تھا۔ تانتیا کو سردی کا احساس شدت سے ہونے لگا۔ اس نے گاؤن اتارا اور اسے پہن لیا۔ ٹہلتا ہوا دوسرے کمرے میں اس طرح چلا گیا جیسے خواب میں چل رہا ہو۔ اس کمرے

میں روشنی تھی۔ وہ آہستہ، آہستہ پکارنے لگا۔

"ارے کوئی ہے یہاں؟"

"کوئی ہے یہاں؟"

"کوئی ہے؟"

تینوں مرتبہ اس کی آواز دیواروں سے ٹکرا کر خاموشی میں ڈوب گئی۔ وہ کھویا، کھویا سا آگے بڑھا اور ایک صوفے پر جا کر نیم دراز ہو گیا۔ اس تمام عرصے میں پہلی بار اسے تھکان محسوس ہوئی۔ اس کا جسم سردی سے تھرتھرا رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ بھوک سے زیادہ اُسے آرام کی ضرورت ہے۔ وہ خوابیدہ نظروں سے آتشدان پر رکھے ہوئے دھات کے مجسمے کو دیکھنے لگا۔ مجسمہ اسے اپنی طرح تنہا اور اونگھتا ہوا معلوم ہوا۔

وہ اُٹھ کر آتشدان کے پاس گیا۔ مجسمے کو اٹھایا اور پھر اس طرح گھبرا گیا جیسے وہ کوئی پُراسرار طاقت تھی جو دھات میں سمٹ کر منجمد ہو گئی تھی۔ جیسے وہ صدیوں سے بھٹکا ہوا کوئی راہی تھا جو نڈھال ہو کر ٹھہر گیا تھا۔ تانیتا نے چوکنا نظروں سے ہر طرف دیکھا۔ کمرے میں ہلکی، ہلکی روشنی تھی۔ دیواروں کا سبز رنگ بڑا نواب ناک معلوم ہو رہا تھا۔ خاموشی بہت گہری تھی اور تانیتا کا جسم سردی سے تھرتھرا رہا تھا۔ اسے آرام کی ضرورت تھی۔ مگر اس نے آرام نہ کیا۔ دروازہ کھول کر دوسرے کمرے میں گھس گیا۔ یہ کمرہ بھی خالی تھا۔ اس میں اندھیرا بھی تھا۔ باہر سے آنے والی روشنی کو کھڑکی پر پڑے ہوئے پردے نے روک رکھا تھا۔ تانیتا نے اندھیرے سے وحشت زدہ ہو کر پردے پر ہاتھ مارا اور اسے نوچ کر پھینک دیا۔ روشنی اچانک کمرے میں پھیل گئی۔ تانیتا مسکرانے لگا۔ اس کمرے میں کوئی پلنگ نہ تھا۔ اور فرش بہت ٹھنڈا تھا۔ تانیتا کے برہنہ پیروں کے تلوے سنسنانے لگے۔

سامنے دیوار سے لگی ہوئی دو الماریاں تھیں۔ اس نے ایک کو کھولا۔ الماری میں میلے کپڑے بھرے تھے۔ اس نے جھنجھلا کر کپڑوں کو اٹھایا اور باہر پھینک دیا۔ پھر الماری کو اطمینان بخش نظروں سے دیکھنے لگا۔ الماری اتنی کشادہ تھی۔ کہ وہ اس میں دبک کر سو سکتا تھا۔ مگر اس نے ایسا کیا نہیں۔ اس کا جی چاہا کہ ایک بار پھر سب کمروں میں جائے۔ اس نے الماری بند کر دی۔ دروازے کے ایک پٹ میں آئینہ آویزاں تھا۔ الماری کا دروازہ بند کرتے ہی آئینہ سامنے آ گیا۔ اس نے اپنا عکس دیکھا۔ الجھے ہوئے مٹیالے بال۔ بکھری ہوئی گھنی مونچھیں۔ گندی بے ترتیب ڈاڑھی اور اس دھندلے، دھندلے چہرے پر چھائی ہوئی ویرانی۔ اس نے خود کو پہچان کر بھی پہچاننے

سے انکار کر دیا۔ ناگواری سے دھات کا مجسمہ اٹھایا اور آئینے پر دے مارا۔ آئینہ ایک چھناکے سے ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اور الماری کے پیچھے سے چودہ پندرہ برس کی ایک کم سن سی لڑکی چیخ کر باہر آ گئی۔

تانتیا نے خوف زدہ ہو کر کہا "کون ہے ری تو؟"

لڑکی گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "میں نمو ہوں۔"

تانتیا کی سراسیمگی جاتی رہی۔ اسے خود پر غصہ آیا کہ وہ اس کمزور لڑکی سے ڈر کیوں گیا۔ جھنجھلا کر چیخا۔

"حرامزادی! تو یہاں کیا کر رہی تھی؟"

لڑکی سہمی ہوئی تھی۔ اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "میں تو ڈر کر یہاں چھپ گئی تھی۔"

تانتیا پوچھنے لگا۔ "تو یہاں اکیلی ہی ہے اور کوئی نہیں؟"

لڑکی نے بتایا۔ "ڈاکٹر ساب شام ہی کو چلے گئے۔ میں نے کہا مجھے بھی اپنے ساتھ موٹر میں لیتے چلو۔ لیکن وہ مجھے اپنے ساتھ نہیں لے گئے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے بھی کیسے جاتے۔ ہوائی جہاز میں دو ہی آدمیوں کی تو جگہ تھی۔"

یہ بتاتے بتاتے لڑکی کے چہرے پر بچوں کی سی معصومیت چھا گئی۔ "وہ بھی چلے گئے، بی بی جی کو بھی لیتے گئے اور بابا کو بھی لے گئے۔"

لڑکی اداس ہو گئی۔

تانتیا نے پوچھا۔ "یہ بابا کون تھا؟"

لڑکی کا چہرہ نکھر گیا۔ اداسی کا غبار چھٹ گیا چہک کر بولی۔ "ان کا ننھا۔ بہت بھولا بھالا تھا۔ بڑا پیارا سا، بالکل ربڑ کا سا لگتا تھا۔ آؤ تم کو بھی دکھا دوں۔" وہ برابر والے کمرے کی طرف مڑ گئی۔ تانتیا خاموشی سے اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ لڑکی نے کمرے میں داخل ہو کر دیوار پہ لگی ہوئی ایک خوبصورت بچے کی تصویر دکھائی، جو ایک لڑھکتی ہوئی گیند کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ہنسی کی دھوپ تھی اور ہاتھ پھیلے ہوئے تھے۔

لڑکی کہنے لگی۔ "دیکھو! کتنا پیارا ہے!"

تانتیا سوچنے لگا کہ بچہ جس گیند پر لپک رہا ہے وہ گیند نہیں نمو ہے۔ نمو جو اب اسے نہیں مل سکتی۔ نمو جو اس کے لئے اداس ہے۔ لیکن بچہ ہنس رہا تھا۔ وہ کیوں اداس ہو۔ اس کو کوئی اور نمو مل جائے گی۔ تانتیا نے

سوچتے۔ سوچتے غضب ناک ہو کر ہاتھ بڑھایا۔ تصویر ایک جھٹکے سے کھینچی اور فرش پر ٹپک دی۔

لڑکی خوفزدہ ہو کر بولی "یہ کیا کیا تم نے؟"

تانتیا کہنے لگا "تو بالکل اُلّو کی پٹھی ہے۔ یہ بھی تو اسی ڈاکٹر کا بیٹا ہے جو تجھے اکیلا چھوڑ کر چلا گیا۔"

لڑکی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اس نے ٹوٹی ہوئی تصویر اٹھائی اور اسے گہری نظروں سے دیکھنے لگی۔ تانتیا سوچنے لگا کہ یہ لڑکی واقعی اُلّو کی پٹھی ہے اور اس کا اپنا جسم سردی سے تھرتھرا رہا ہے۔ اس کے پیر کے ناسور میں ٹیس اٹھ رہی ہے۔ اس نے نمّو سے کہا "اے لڑکی! ذرا کڑوا تیل لے آ۔ میں اپنے پیر کے زخم پر ملوں گا۔"

نمّو اس کے قریب آگئی۔

"کیا ہوا تمھارے پیر میں؟"

تانتیا نے بتایا "ناسور ہو گیا ہے۔"

لڑکی اس کے زخم میں دلچسپی لینے لگی "تو اس کا علاج کیوں نہیں کرواتے؟"

تانتیا نے بتایا "بہت علاج کروایا۔ ہسپتال میں بھرتی ہو گیا۔ پر یہ ڈاکٹر ہوتے ہی بدمعاش ہیں سالوں نے علاج تو کچھ کیا نہیں۔ کہنے لگے کہ تم اپنا پیر گھٹنے پر سے کٹوا دو۔ نہیں تو ساری ٹانگ سڑ جائے گی۔ میں بھی ایک ہی سیانا نکلا۔ جس روز انھوں نے آپریشن کا انتظام کیا، میں رات ہی کو وارڈ کی کھڑکی پھاند کر بھاگ آیا۔ پھر کسی ڈاکٹر واکٹر کے پاس نہیں گیا۔ اپنا تو کڑوے تیل سے ہی کام چل جاتا ہے۔"

نمّو نے جھٹ شلوار چڑھا کر اپنی پنڈلی دکھا دی "دیکھو یہ کتنا بڑا نشان ہے۔ میرا تو اتنا بڑا گھاؤ ڈاکٹر ساب نے اچھا کر دیا۔"

تانتیا سوچنے لگا کہ اس کا اپنا پیر بڑا گھناؤنا ہے۔ اس پر چیتھڑے لپٹے ہیں۔ ناسور سے پانی بہہ رہا ہے اور نمّو کی پنڈلی بہت خوبصورت ہے۔ اس کے چہرے پر کنواریوں کا اچھوتا پن ہے۔ نرمی ہے۔ جوانی کی شگفتگی ہے۔ پھر نمّو، نمّو نہ رہی۔ صرف ایک لڑکی، ایک عورت رہ گئی۔ تانتیا سوچتا رہا کہ اس گھر میں سب کچھ اس کا ہے۔ یہ خوبصورت کمرہ، یہ نرم نرم صوفہ، یہ لہراتے ہوئے پردے۔ یہ نکھری، نکھری صاف شفاف دیواریں، اور یہ نمو صرف ایک لڑکی، ایک عورت، اور عورت کو کبھی اس نے اتنے قریب نہیں پایا تھا۔

نمو نے تانتیا کے چہرے کو دیکھا اس کے چہرے کی دہشت کو دیکھا اور گندی، گندی آنکھوں کو دیکھا اور جسے دیکھ کر وہ شرما بھی گئی۔ گھبرا بھی گئی۔ اس نے جھٹ اپنی پنڈلی چھپالی۔ تانتیا جھنجھلا کر نمو کی طرف بڑھا۔ وہ خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹنے لگی۔ تانتیا کی جھنجھلاہٹ بڑھتی گئی۔ اس نے جھپٹ کر نمو کو بے ڈھنگے پن سے دبوچ لیا۔ اس کے لباس کو تار تار کر دیا۔ اس کے رخساروں کو چبا ڈالا۔ اس کی نرم نرم چھاتیوں کو، اس کی گداز باہوں کو اور اس کے تمام جسم کو دانتوں سے نوچنا شروع کر دیا۔ نمو دہشت زدہ ہو کر اسے دیکھتی رہی پھر چیخنے لگی پھر وہ بے ہوش ہو گئی۔

نمو کا برہنہ جسم فرش پر پڑا تھا۔ اس کے جسم پر جگہ جگہ دانتوں کے نشان تھے۔ رخسار نیلے پڑ گئے تھے اور ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔ کمرے میں گہری خاموشی چھائی تھی۔ باہر زمستانی ہوائیں سسکیاں بھر رہی تھیں۔

تانتیا نے نمو کے برہنہ جسم پر پرانا گاؤن ڈال دیا۔ اور اس کے قریب بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔

تانتیا بیٹھا ہوا چپ چاپ سگریٹ پیتا رہا۔ دھوئیں کے پیچ و خم لہراتے رہے۔ کمرے میں خاموشی چھائی تھی۔ یکایک رات کے گہرے سناٹے میں ملی جلی انسانی آوازوں کا ہلکا، ہلکا شور ابھرنے لگا۔ تانتیا بیٹھا ہوا چپ چاپ سگریٹ پیتا رہا۔ شور بڑھتے بڑھتے قریب آ گیا۔ پھر کوٹھی کے احاطے کی چار دیواری پھاندنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ کوٹھی کے بیرونی برآمدے میں قدموں کی آہٹیں رک، رک کر ابھرنے لگیں۔ پھر کچھ لوگ دروازہ کھول کر کمرے کے اندر آ گئے۔ وہ سب بلوائی تھے۔ ان کے ہاتھوں میں خنجر تھے۔ بلم تھے۔ اور لاٹھیاں تھیں۔ چہروں پر ڈھاٹے بندھے تھے۔ تانتیا نے انکو دیکھا اور اس طرح اطمینان سے بیٹھا ہوا سگریٹ پیتا رہا جیسے وہ ان کو پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ جیسے وہ ان کو ہمیشہ سے جانتا تھا۔

پھر ان میں سے کسی نے پوچھا "ابے تو کون ہے؟"

"تانتیا!"

"ہندو ہے یا مسلمان؟"

"یہ تو میں نے بہت مدت سے سوچنا چھوڑ دیا کہ میں کون ہوں؟" تانتیا نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"کیا بکتا ہے؟" ایک بلوائی نے بڑھ کر اس کے منہ پر زور کا تھپڑ مارا۔ "ٹھیک ٹھیک بتا۔"

"میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔" تانتیا نے انکو مطمئین کرنے کی کوشش کی۔ مگر وہ مطمئین نہ ہوئے۔ تانتیا کے گال پر ایک اور کرارا تھپڑ پڑا۔ کسی نے ڈپٹ کر پوچھا۔ "سیدھی طرح بتاتا ہے کہ نہیں۔" اس نے جھلکتا ہوا خنجر اس کے سامنے کر دیا۔ "اسے دیکھا ہے۔"

تانتیا خاموشی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اپنی میلی جیکٹ پتلون کے بٹن کھولنے لگا۔ انھوں نے اسے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ "یہ کیا کر رہا ہے؟"

"پتلون اتار رہا ہوں۔"

"پتلون کیوں اتار رہا ہے؟"

"تاکہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ کر تصدیق کر لو کہ میں کون ہوں۔" تانتیا نے مسکین سی شکل بنا کر کہا اور ایسی نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو تم نے مجھے اب تک نہیں پہچانا۔ پھر انھوں نے جیسے اسے پہچان لیا۔ "اچھا تو یہ تو ہے! ہم سے پہلے ہی یہاں پہنچ گیا۔" وہ ٹھٹھا مار کر ہنسنے لگے۔ پھر انھوں نے نمو کی جانب ہاتھ اٹھا کر پوچھا۔

"یہ کون ہے؟"

تانتیا نے کہا۔ "لڑکی!!" اور وہ مسکرا دیا۔ اس کی مسکراہٹ میں طنز بھی تھا اور بے باکی بھی۔

وہ نمو کے جسم کو گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ کسی نے گاؤن ہٹا دیا اور حیرت زدہ ہو کر کہنے لگا۔ "ارے یہ تو بالکل ننگی ہے۔" سب جھک کر دیکھنے لگے۔

وہ جھکے ہوئے بھوکی نظروں سے اسے دیکھتے رہے!

پھر کسی نے ان میں سے کہا۔ "ارے یہ تو مر گئی ہے۔ کیا دیکھ رہے ہو؟"

سب علیحدہ ہو کر بکھر گئے۔ نمو کے جسم پر گاؤن ڈال دیا گیا۔ اور وہ تجسس انگیز نظروں سے ہر طرف دیکھنے لگے۔

پھر کوٹی بول اٹھا۔

"ڈاکٹر سالا سب کچھ لے گیا۔ اب یہاں کیا دھرا ہے۔" وہ تانتیا کی طرف دیکھنے لگے۔

"ابے تو یہاں کیا کر رہا ہے۔ سالے کیا تو بھی جل کے مر جانا چاہتا ہے۔"

ایک بلوائی نے بڑھ کر تانتیا کو دروازے کی طرف ڈھکیل دیا۔ "چل بھاگ یہاں سے۔"

تانتیا نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ "تو مار کیوں رہے ہو۔ سیدھی طرح کیوں نہیں کہتے۔ میں کوئی یہاں بیٹھا رہوں گا۔"

تانتیا مڑا اور آہستہ، آہستہ چلتا ہوا کوٹھی سے نکل کر باہر آ گیا۔

باہر آ کر تانتیا نے محسوس کیا کہ سڑک وہی ہے۔ جھلملاتی ہوئی روشنیاں وہی ہیں۔ سامنے ڈاکٹر کی کوٹھی بھی وہی ہے اور یہ کوٹھی اس کی نہیں ہو سکتی۔ کمرہ اس کا نہیں ہو سکتا۔ نرم، نرم صوفہ اس کا نہیں ہو سکتا۔ لہراتے ہوئے پردے اس کے نہیں ہو سکتے۔ وہ صرف تانتیا ہے۔ گاؤن اس نے نمو کو اوڑھا دیا تھا۔ دھات کا مجسمہ پھینک دیا تھا۔ اور سگریٹ ختم ہو چکی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ڈاکٹر کی کوٹھی سے دھواں اٹھنے لگا۔ شعلے لال، لال زبانیں نکال کر ابھرنے لگے۔ دروازے چٹخ کر شور مچانے لگے۔ پھر کوٹھی کے اندر نمو کی گھٹی ہوئی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ تانتیا کوٹھی کی طرف پلٹ پڑا۔ نمو ابھی زندہ تھی۔ اور نمو اسے ابھی چاہیئے بھی تھی۔

تانتیا شعلوں سے الجھتا ہوا کوٹھی میں گھس گیا۔ نمو کے پاس پہنچا۔ نمو دیکھتے ہی اس سے چمٹ گئی۔ تانتیا نے اسے اٹھا کر اپنے کندھے پر ڈال لیا۔ وہ اسے لے کر باہر نکلنے لگا۔ اس کے چاروں طرف دھواں پھیلا ہوا تھا۔ شعلے بھڑک رہے تھے۔ لکڑیاں چٹخ، چٹخ کر گرتیں تو چنگاریاں دور تک بکھر جاتیں۔ وہ شعلوں کے درمیان سے گزرتا، دھوئیں میں ٹھوکریں کھاتا ہوا باہر آ گیا۔ اس کا چہرہ جھلس گیا تھا۔ داڑھی جل کر اور خوفناک ہو گئی تھی۔ نمو نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ وہ قصے کہانیوں کے بھوتوں کی طرح بھیانک معلوم ہوا۔ اس نے ڈر کر آنکھیں بند کر لیں۔

تانتیا اسے اپنے کندھے پر اٹھائے ہوئے ایک بار پھر سڑک پر آ گیا اور فٹ پاتھ پر دیواروں کے کنارے کنارے چلنے لگا۔

تانتیا دیواروں کی اوٹ میں چلتا رہا۔ اس کے چہرے پر جلن ہوتی رہی۔ اور نمو بازوؤں سے چمٹی رہی۔ پھر ایک پولیس لاری اس کے پاس آ کر رک گئی۔ دو کانسٹیبل اتر کر نیچے آئے۔ اور اس کو ٹھہرا لیا۔

"کہاں سے آ رہا ہے؟"

تانتیا نے نمو کو سامنے کر دیا۔ "میں تو اس لڑکی کو آگ سے نکال کر لا رہا ہوں۔"

انہوں نے گاؤن اٹھا کر دیکھا۔ نمو خوفزدہ نظروں سے ان کو دیکھنے لگی۔ تانتیا نے جھٹ ہاتھ ہٹا دیا۔

"اے اس کو نہ کھولو، یہ بالکل ننگی ہے۔"

وہ ہنسنے لگے۔ "تو سالے اس کو لے کہاں جا رہا ہے؟"

تانتیا نے حیرت سے پوچھا۔ "کیوں؟"

وہ بے باکی سے ہنسنے لگے۔ "ابے اسے کھڑا تو کر۔"

تانتیا نے نمو کو فٹ پاتھ پر کھڑا کر دیا۔ نمو بالکل چپ تھی۔ تانتیا بھی چپ تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے رہے۔ پھر انھوں نے نمو کا بازو پکڑ کر ایک طرف کر لیا۔

"یہ ہمارے ساتھ لاری میں جائے گی۔ رات بھر تھانے میں رہے گی اور صبح رفیوجی کیمپ میں پہنچا دی جائیگی۔"

وہ نمو کو لے کر لاری کی طرف چلنے لگے۔ نمو اب بھی خاموش تھی۔

تانتیا کہتا رہا۔ "یہ میرے پاس رہے گی۔ میں نے اس کو آگ سے بچایا ہے اسے میرے پاس رہنا چاہیئے۔"

مگر انھوں نے ایک نہ سنی۔ نمو کو لاری میں بٹھایا اور خود بھی بیٹھ گئے۔ ڈرائیور نے لاری کا انجن اسٹارٹ کیا اور وہ آگے بڑھ گئی۔ تانتیا لاری کو خوابناک نظروں سے دیکھتا رہا۔ لاری دور ہوتی گئی۔ نمو دور ہوتی گئی۔

نمو جس کا جسم لہراتے ہوئے پردوں کی طرح نرم تھا جس کے چہرے پر کنواریوں کا چھوتا پن تھا۔ نرمی تھی۔ اور جوانی کی پھوٹتی ہوئی شگفتگی تھی۔ نمو صرف ایک لڑکی۔ ایک عورت۔ جسے اس نے اپنے قریب محسوس کیا تھا۔ جسے اس نے چھو کر دیکھا تھا۔

لاری اندھیرے میں اوجھل ہو گئی۔ تانتیا نے غصے سے فرش پر تھوک دیا۔ اور پولس والوں کو گالیاں دیتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

تانتیا سڑک پر تھکا ہوا سا چلتا رہا۔ مگر وہ جاتا بھی کہاں۔ سامنے مکان جل رہے تھے۔ شعلے لہرا رہے تھے۔ دھوئیں کے بادل بلندیوں پر پھیلتے جا رہے تھے۔ جلتے ہوئے مکانوں سے انسانی چیخیں ابھر رہی تھیں۔ وہ آگے نہ گیا۔ ایک نیم کشادہ سڑک پر مڑ کر نشیب میں اتر گیا۔ قریب ہی گندا نالا تھا جو سڑک کے نیچے سے گزرتا تھا۔ تانتیا نالے کی پلیا کے نیچے گھس گیا۔

پلیا کے نیچے اندھیرا تھا۔ کیچڑ تھی اور بڑی تیز بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے ماچس جلا کر دیکھا۔ قریب ہی ایک برہنہ لاش پڑی تھی۔ لاش پھول کر اکڑ گئی تھی۔ زبان باہر نکلی ہوئی تھی۔ آنکھیں کچھ اس طرح پھٹی ہوئی تھیں جیسے کہہ رہی ہوں، دیکھو مجھے کتنی بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ میں نے انتقام نہیں لیا۔ مجھے انتقام لینا چاہیئے تھا۔

وہ وہاں سے ہٹ کر دوسری طرف چلا گیا۔ جہاں زمین خشک تھی۔ وہ زمین پر بیٹھ گیا۔

تانتیا اندھیرے میں بیٹھا ہوا سوچتا رہا کہ اس کے چاروں طرف تاریکی ہے۔ کیچڑ ہے اور قریب ہی ایک لاش پڑی سڑ رہی ہے۔ جس کی زبان باہر نکل آئی ہے اور آنکھیں پھٹ گئی ہیں۔ باہر تیز ہوائیں سسکیاں بھر رہی ہیں۔

ایک آدمی گھبرایا ہوا پلیا کے سامنے آ کر ٹھہر گیا۔ تانتیا اسے دیکھتا رہا۔ مگر جب وہ اندر آ کر لمبی لمبی سانسیں بھرنے لگا تو تانتیا نے کہا۔ "وہاں کیچڑ میں کیوں کھڑے ہو۔ ادھر آ جاؤ۔ یہاں زمین صاف ہے۔"

وہ خوف سے چیخ کر بولا۔ "تم کون ہو؟"

تانتیا نے جل کر کہا۔ "میں کوئی بھی ہوں، کیچڑ میں کھڑے ہونے کا شوق ہے تو وہیں کھڑے رہو۔ نہیں تو ادھر چلے آؤ۔"

وہ تانتیا کے قریب آیا اور زمین پر بیٹھ گیا۔

ذرا ہی دیر بعد اس نے تانتیا سے پوچھا۔ "تم ہندو ہو یا مسلمان؟"

تانتیا جھنجھلا کر بولا۔ "میں کوئی بھی ہوں۔ ابے ہندو مسلمان کے بچے پہلے یہ بتا کہ کوئی سگرٹ وگرٹ بھی ہے؟"

"میرے پاس سگریٹ نہیں ہے۔ نہ جانے کس طرح جان بچا کر بھاگا ہوں۔ تمہیں سگریٹ کی پڑی ہے۔"

تانتیا ٹھٹھا مار کر ہنسنے لگا۔ "ابے جا بے تو بھی یونہی رہا۔"

اجنبی ذرا دیر خاموش رہ کر بولا۔ "یہاں تو بڑی بدبو ہے۔"

تانتیا نے ماچس جلائی اور سڑتی ہوئی لاش دکھلانے لگا۔ "دیکھو یہ کوئی مرا ہوا آدمی پڑا سڑ رہا ہے۔"

وہ خوفزدہ ہو کر تانتیا کے نزدیک سرک گیا۔ پھر آہ بھر کر رقت انگیز لہجے میں بولا۔ "ہائے بے چارہ!"

"یار دکھ تو مجھے بھی ہو رہا ہے۔ پر یہ سرکار بھی الو کی پٹھی ہے۔ اتنا گوشت بیکار سڑ کر جا رہا ہے۔" تانتیا آہستہ آہستہ بولتا رہا۔ "یہی پچھلی جنگ کی بات ہے۔ ہم لوگ برما کے جنگلوں میں جاپانیوں کے خلاف لڑ رہے تھے۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ جاپانیوں نے ہیڈ کوارٹر والی سڑک بمباری کر کے تباہ کر دی۔ سڑک بند ہوئی تو ہمیں راشن ملنا بند ہو گیا۔ بس پوچھو نہ کہ کیا بیتی۔ ہم نے سامان لے جانے والی گاڑیوں کے خچروں کو مار مار کر کھانا شروع کر دیا۔ مگر خچر کا گوشت بہت خراب ہوتا ہے۔ سالا ہضم ہی نہ ہوتا تھا۔ پھر ہوائی جہازوں سے راشن پھینکا جانے لگا۔ اس میں ہمیں ایسا گوشت ملتا جسے سکھا کر ڈبوں میں بند کر دیا گیا تھا۔ سچ کہتا ہوں کیا مزے کا گوشت ہوتا تھا۔ اب تمھیں بتاؤ کہ روز جو اتنے بہت سے آدمی بلوے اور فساد میں مر رہے ہیں، کتنا گوشت بیکار جا رہا ہے۔ سرکار اس کو سکھا کر کیوں نہیں رکھ لیتی۔ کال کے دنوں میں کام دیگا۔ پھر کال تو یوں بھی پڑ رہا ہے۔ کتنے ہی بھوکوں کا بھلا ہو جائے گا۔ کہو استاد کیسی کہی؟" تانتیا نے اسکی پیٹھ پہ زور سے دھپ مارا۔ "ابے تو تو بہت تگڑا ہے۔ امرے گا۔ تو بہت سا گوشت نکلے لگا اور ڈھیر بھر چربی بھی نکلے گی۔"

اجنبی خوف سے اچھل پڑا۔ اس کی جیبیں روپوں کی جھنکار سے کھنک اٹھیں۔

تانتیا نے جھٹ اس کی گردن دبوچ لی۔ "ابے تیرے پاس تو بڑی رقم ہے۔ نکال۔"

وہ گھٹی ہوئی آواز میں بولا۔ "میری گردن تو چھوڑ دو۔" تانتیا نے اس کی گردن چھوڑ دی۔

وہ گڑگڑانے لگا۔ "مجھ ستائے ہوئے کو ستا کر تمھیں کیا ملے گا؟"

تانتیا ہنسنے لگا۔ "سیدھی سی بات ہے۔ رقم ہاتھ لگے گی اور کیا۔" وہ دھکا دیکر اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ دونوں ہاتھوں سے گردن دبا کر کہنے لگا۔ "ابے سیدھی طرح نکالتا ہے یا گھونٹ دوں گلا۔"

وہ بدحواس ہو کر بولا۔ "سب کچھ اندر کی جیب میں ہے۔ نکال لو۔"

تانتیا نے اس کی جیبیں ٹٹولیں۔ نوٹ نکالے، روپے نکالے اور ریزگاری تک نکال لی۔

وہ خوشامد کرنے لگا۔ "میرے پاس کچھ تو چھوڑ دو۔"

تانتیا پھر ہنسنے لگا۔ "ابے بہت دن تم نے ٹھاٹھ کئے ہیں۔ کچھ دن یونہی سہی۔"

"تمھارے دل میں ذرا رحم نہیں۔ میرا گھر جل رہا ہے۔ سب کچھ لٹ گیا۔ بیوی کو بھی مار ڈالا۔ بچوں کو بھی قتل کر دیا۔ میری جوان لڑکیوں کو اٹھا کر لے گئے۔ اب میرے پاس رہ ہی کیا گیا ہے۔ عزت تو تھی وہ بھی برباد ہو گئی۔" وہ آدمی بڑا اداس معلوم ہو رہا تھا۔ مگر تانتیا ہنستا رہا۔ "ابے تو اس میں گھبرانے کی کون سی بات ہے۔ تیری لڑکیوں کو کوئی نہ

کوئی تولے ہی جاتا کوئی اور نہ لے گیا۔ وہ لے گئے۔ کیا فرق پڑتا ہے؟"

اجنبی خاموش بیٹھا رہا۔ اسے تانتیا سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ مگر اسے اپنی جان بھی پیاری تھی۔ وہ وہیں بیٹھا رہا۔ تانتیا نے اسے پھر چھیڑا۔

"ابے خاموش کیوں بیٹھا ہے۔ کچھ باتیں ہی کر۔"

وہ جھنجھلا کر بولا۔ "تم نے آج تک لوگوں کو دکھ ہی پہنچایا ہے یا اور بھی کچھ کیا ہے۔"

تانتیا نے تلملا کر کہا۔ "ابے! میں نے کیا کیا ہے۔ میں نے چلچلاتی دھوپ میں سڑکوں پر محنت کی ہے۔ کڑکڑاتی سردیوں میں پہرے داری کی ہے۔ فوج میں بھرتی ہو کر گولیاں کھائی ہیں۔ چوریاں کی ہیں۔ جیل کاٹی ہے۔ مار کھائی ہے۔ گالیاں سنی ہیں۔" تانتیا تیزی سے بولتے، بولتے اچانک بے نیازی سے ہنسنے لگا۔ "اور اب میں بھوکوں مرتا ہوں، شرابیوں کا بچا کھچا کھانا کھاتا ہوں۔ گوشت کے ایک ایک ٹکڑے کے لئے کتوں سے لڑتا ہوں۔ سردی میں کسان سڑکوں پر ٹھٹھرتا پھرتا ہوں۔ بتاؤ استاد تم نے یہ سب کچھ کیا ہے۔ اور نہیں کیا تو تمہاری ایسی کی تیسی۔" تانتیا نے اس کے منہ پر کس کے تھپڑ مارا۔ "سالا! اُلّو کا پٹھا! خواہ مخواہ رعب جھاڑتا ہے۔"

وہ آدمی سہما ہوا خاموش بیٹھا رہا۔ مگر تانتیا پلیا سے اب اکتا چکا تھا۔ اس آدمی سے اکتا چکا تھا۔ اندھیرے اور گھٹن سے اکتا چکا تھا۔ وہ اٹھا اور پلیا کے نیچے سے نکل کر سڑک پر آ گیا۔ خزاں کی تیز ہوائیں سسکیاں بھر رہی تھیں۔ رات اور گہری ہو گئی تھی۔ ویران عمارتوں کی پشت پر چاند کی زرد، زرد روشنی ابھر رہی تھی۔ پت جھڑ کے مارے ہوئے سوکھے درخت تارِ عنکبوت کی طرح اُلجھے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ تانتیا درختوں کے نیچے چلنے لگا۔ خشک پتے اس کے قدموں کے نیچے ہلکی، ہلکی آہٹ پیدا کر رہے تھے۔

سنسان سڑک پر اس کا سایہ بھوتوں کی طرح ڈراؤنا معلوم ہوتا۔ وہ آہستہ، آہستہ چلتا رہا۔ پھر ایک موڑ پر کسی نے ٹوکا۔

"کون آ رہا ہے؟"

تانتیا نے گھبرا کر دیکھا ایک فوجی سپاہی رائفل سنبھالے ہوئے اس کی طرف آ رہا تھا۔ تانتیا پلٹ کر دیواروں کے سایوں میں دبکنے لگا۔

مسلح فوجی نے للکارا "ہے !! ٹھہر جاؤ۔"

مگر تانتیا نہ رکا۔ اس نے اپنی چال اور تیز کر دی۔

ناگاہ، رات کے پر ہول سناٹے میں رائفل چلنے کی آواز گونجی۔ گولی تانتیا کی پسلیوں کو توڑتی ہوئی گزر گئی۔ وہ فرش پر گر پڑا۔ سپاہی اس کے قریب آکر ٹھہر گیا۔

تانتیا نے اس کی طرف دیکھا۔ ہانپتے ہوئے لہجے میں بولا "جوان! تمہارا نشانہ بہت اچھا ہے۔ کبھی میں بھی اتنا ہی سچا نشانہ لگاتا تھا۔ پر ان خوبیوں کی کون قدر کرتا ہے۔ جنگ ختم ہو گئی اور میرا حال تم نے دیکھ ہی لیا۔"

تانتیا نے ہاتھوں میں دبے ہوئے نوٹ، روپے اور ریزگاری، سب کچھ سڑک پر پھینک دیا۔ فوجی اپنی رائفل سنبھالے ہوئے حیرت سے دیکھتا رہا۔

تانتیا اس کی بے نیازی پر بھنا گیا۔ جل کر بولا "ابے دیکھ کیا رہا ہے۔ اس کو اٹھا لے۔ سالے اکڑ تا کیوں ہے۔ کہیں ایک دن تیرا بھی یہی حال نہ ہو۔ ابے اس وقت یہ رقم کام آئے گی۔"

فوجی نے جھنجھلا کر تانتیا کی کمر پر زور سے لات ماری اور روپیہ اٹھا کر چل دیا۔

تانتیا کے زخم سے خون بہتا رہا۔ اس کا جسم سنسان سڑک پر پھڑکتا رہا۔ ہوائیں سسکیاں بھرتی رہیں اور ویران گلیوں میں کتے روتے رہے۔

یہ کرفیو کی رات تھی۔ فسادات کی رات تھی۔ تانتیا کی زندگی کی آخری رات تھی۔ تانتیا مر گیا۔ اس کی پھٹی ہوئی آنکھوں میں ابھی تک بھوک زندہ تھی۔

یہ بیمار

میں کچھ بوہیمین قسم کا آرٹسٹ ہوں اور مکمل بوہیمین بننے کے لئے مجھے زندگی کو ابھی اور بے ترتیب بنانا ہے۔ مزاج میں کچھ اور آشفتہ سری اور لا اُبالی پن پیدا کرنا ہے۔ میرے پاس سیاہ چمڑے کا یہ بوسیدہ پورٹ فولیو ہے، جس میں کچھ پروفائلز ہیں۔ کچھ کیریکچیرز اور کچھ ادھورے اسکیچ ہیں۔ میری زندگی کا تمام سرمایہ صرف راتوں سے وابستہ ہے۔ یہ راتیں زاہد شب زندہ دار کی طرح نہ تاریک حجروں میں کٹی ہیں، نہ عاشق مہجور کی طرح اختر شماری میں میری راتیں چائے خانوں میں گذرتی ہیں۔ قہوہ خانوں میں گزرتی ہیں۔ شراب خانوں میں گزرتی ہیں اور اکثر سنسان سڑکوں پر محض آوارہ گردی کرتے ہوئے۔ میں شہر کے ان تمام ایسے ٹھکانوں کو جانتا ہوں، جہاں طویل راتیں صرف چائے کے گھونٹوں اور سگریٹ کے کشوں پہ گذاری جاسکتی ہیں۔

میں جھکی ہوئی چھتوں والے ان نیم تاریک چائے خانوں میں بھی بیٹھا ہوں، جن میں ہر طرف دھواں منڈلایا کرتا ہے اور بوسیدہ میزوں کے گرد بیٹھے ہوئے انسان سایوں کی مانند دھندلے نظر آتے ہیں۔ یہ لوگ ان چائے خانوں ہی کی طرح غلیظ ہیں۔ تمام دن ابلنے والی باسی چائے پیتے ہیں، گالیاں بکتے ہیں اور بات بات پر بے تکے قہقہے لگاتے ہیں۔ انھیں کچھ خبر نہیں کہ زندگی کیسے، کیسے ہنگاموں سے گزر رہی ہے۔ سوائے اس کے کہ مہنگائی بہت ہے اور ہر چیز کی قلت بڑھتی جارہی ہے۔ یہ بڑے سے بڑے واقعہ کو اسی زاویہ نظر سے دیکھتے ہیں۔

سامنے تنبولی کی دکان پر ریڈیو لگا ہے۔ خبر آتی ہے کہ برلن کے مسئلہ پر امریکہ اور روس کے درمیان لڑائی کا خطرہ بڑھ گیا ہے۔ اس خبر پر چائے خانہ کا بوڑھا مالک کھنکار کر کہتا ہے "لو سن لو، لڑائی پھر چھڑنے والی ہے"۔

چائے کی پیالی ہونٹوں سے ہٹا کر کوئی طنزیہ لہجہ میں تبصرہ کرتا ہے۔ "تو پھر تمھاری تو بن آئے گی۔ چمپا اب تین آنے کپ چائے بیچنا" اس کی بات سن کر چائے خانے کی گھٹی گھٹی فضا میں ملے جلے قہقہوں کا شور گونجنے لگتا ہے۔

کشمیر کی جنگ پر کسی اخبار کا ضمیمہ نکلتا ہے۔ میں اسے پڑھ کر سناتا ہوں "کشمیر کے محاذ پر لڑائی بند ہو گئی"۔ اس خبر پر وہ اس طرح اپنے ردِ عمل کا اظہار کرتے ہیں۔

"سنا ہے اس لڑائی پر سرکار کا بڑا روپیہ خرچ ہو رہا تھا"۔

"چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ سالی مہنگائی اب کچھ تو کم ہو گی"۔

مائکروفون سے سجی ہوئی جیپ اعلان کرتی ہوئی گزرتی ہے "کل شام کو چھ بجے ایبن الدولہ پارک میں پنڈت جواہر لال نہرو کا بھاشن ہو گا۔ آپ سے نویدن ہے کہ ادھک سے ادھک سنکھیا میں آویں۔ شام کو چھ بجے۔ کل شام کو چھ بجے!" اعلان کرنے والے کی بھاری بھرکم آواز لاؤڈ اسپیکر پر گونجتی رہتی ہے اور کل شام ہی کے متعلق چائے خانے میں اچانک کوئی دریافت کرتا ہے۔

"اماں کل شام کو بھی مٹی کا تیل ملے گا یا نہیں۔ کئی روز سے گھر میں اندھیرا پڑا ہے"۔

مجھے ان کی اس بے نیازی پر جھنجھلاہٹ بھی محسوس ہوتی ہے، ہمدردی بھی آجاتا ہے۔ میں سوچنے لگتا ہوں کہ یہ بے چارے اس باسی چائے میں کتنی فرحت محسوس کرتے ہیں۔ دکھوں نے ان کو کس قدر بے حس اور چڑچڑا بنا دیا ہے۔ یہ گالیاں اور یہ بے تکے قہقہے اس کا ردِ عمل ہیں۔ ایک غیر شعوری طنز یا محض فرار۔ اور یہ بڑھتی ہوئی مہنگائی ان کے ذہنوں پر کابوس کی طرح طاری ہے۔ یہ خود اپنے وجود سے سہمے ہوئے ہیں۔ ان کے چہروں کے نقوش مجھے بہت گہرے معلوم ہوتے ہیں۔ دھنسی ہوئی آنکھوں میں زندگی ہانپتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ میں پورٹ فولیو سے کاغذ نکالتا ہوں اور ان کے مسخ اور بدوضع چہروں کے پنسل اسکیچ بنانے لگتا ہوں۔

پھر میں اس امریکن جرنلسٹ سے ملتا ہوں، جسے اس ملک کے تباہ حال انسانوں سے بہت ہمدردی ہے۔ وہ میرے فن کے بارے میں ایک باتصویر فیچر تیار کر رہا ہے۔ میں اسے کپور میں لے جاتا ہوں۔ شراب و کباب سے اس کی تواضع کرتا ہوں۔ وہ وہسکی کی چسکی لگاتا ہے۔ میرے نئے اسکیچ دیکھتا ہے۔ میری تعریف و توصیف

کرتا ہے اور میں خوشی سے وارفتہ ہو کر سوچتا ہوں کہ ایک روز اس کا فیچر مکمل ہو جائے گا۔ کسی معروف امریکن اخبار میں شائع ہو گا۔ میرا فن پروان چڑھے گا اور میں بائرن کی طرح ایک ہی شب میں شہرت دوام حاصل کر لوں گا۔ وہ میری فنی صلاحیتوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور میں وہسکی کے بڑھتے ہوئے نشہ میں ایک اچھوتا کیف محسوس کرتا ہوں۔ پھر اس کے پاس ننگ سک سے درست کوئی انٹلکچوئل قسم کی لڑکی آجاتی ہے۔ وہ اس سے میرا تعارف کراتا ہے۔ میرے فن کے بارے میں بتاتا ہے۔ اسے میرا پورٹ فولیو دکھاتا ہے۔

وہ تعجب سے کہتی ہے "ارے یہ آپ نے بنائے ہیں! سچ مچ آپ نے تو کمال کر دیا۔ کتنے پرفکٹ اکسپریشن ہیں"

میں اس کے چہرے کی طرف دیکھتا ہوں۔ اس کے تیکھے نقوش مجھے یونانی مجسموں کی طرح سبک معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی کنول کی سی شفاف آنکھوں میں زندگی انگڑائیاں لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اس کے لباس سے پھوٹتی ہوئی ہلکی ہلکی خوشبو مجھے بے خود اور بے قرار کر دیتی ہے۔ میں وارفتہ ہو کر سوچتا ہوں کہ میں مونالزا سے بھی زیادہ اچھوتا شاہکار بنا سکتا ہوں۔

میں خود فراموشی کے عالم میں سوچتا رہتا ہوں۔ نشہ سے سرشار ہو کر ہولے ہولے جھومتا رہتا ہوں۔ امریکن جرنلسٹ مجھ سے رخصت ہو کر چلا جاتا ہے تیکھے نقوش والی لڑکی بھی اس کے ساتھ چلی جاتی ہے۔ میں خود کو بری طرح تنہا محسوس کرنے لگتا ہوں۔ گلاس اٹھا کر جلدی، جلدی کئی گھونٹ بھرتا ہوں، سگریٹ لگاتا ہوں اور کش لگاتے ہوئے معاً یہ خیال آجاتا ہے کہ اس لڑکی کو میرے اسکیچ پسند ہیں۔ اس کا مذاق بڑا آرٹسٹک ہے۔ مجھے اس سے پھر ملنا چاہئے۔ مجھے اس کی ضرورت ہے اور یہ کونے والی میز پر بیٹھا ہوا شاعر جو اپنے سر کے لمبے، بڑے بالوں پر بار، بار ہاتھ پھیر رہا ہے اور سامنے بیٹھی ہوئی لڑکیوں کو دیر سے کوئی طویل نظم سنا رہا ہے، سراسر خود فریبی میں مبتلا ہے۔ یہ لڑکیاں اس کی نظم پر مطلق توجہ نہیں دے رہی ہیں، وہ بیزار اور اکتائی ہوئی نظر آرہی ہیں۔ یہ شاعر خواہ مخواہ اپنی شاعری سے ان کو مرعوب کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ ان ڈی جنریٹ فنکاروں میں سے ہے، جنھیں ننگے بھوکے انسانوں سے ہمدردی ہے، جو ان کے دکھوں سے اپنے فن میں زندگی کی ہلچل اور گہما گہمی بھرتے ہیں۔ اپنی شہرت کو فروغ دیتے ہیں۔ عزت اور ہر دل عزیزی حاصل کرتے ہیں۔ اپنے خوش ذوق اور خوش حال قدر دانوں کے بل پر شراب پیتے ہیں۔ قہقہہ لگاتے ہیں۔ اور لڑکیوں سے فلرٹ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر ایک روز حکومت ان کو خرید

لیتی ہے۔ ننگے بھوکے انسانوں کی ہمدردی خرید لیتی ہے۔ پھر یہ حکومت کی قصیدہ خوانی شروع کر دیتے ہیں۔ پھر یہ حکومت کے اشاروں پر ناچنے لگتے ہیں۔

یہ سوچتے سوچتے دفعتاً میں چونک پڑتا ہوں۔ سوچتا ہوں، یہ امریکن جرنلسٹ میرے فن پر کوئی فیچر، کوئی مضمون نہیں لکھ سکتا۔ وہ ایسا کبھی نہیں کر سکتا۔ جب چارلی چپلن پر مقدمہ چلتا ہے تو وہ حکومت کو سخت گیر ہونے کا مشورہ دیتا ہے۔ جب ہاورڈ فاسٹ کو جیل خانہ بھیجا جاتا ہے تو وہ حکومت کو مبارکباد دیتا ہے۔ جب مزدوروں کے خلاف ٹافٹ ہارٹلے ایکٹ پاس ہوتا ہے تو وہ حکومت کی تائید کرتا ہے۔ وہ اپنے سیاہ فام ہم وطنوں کی زبوں حالی پر ذرا بھی متاثر نہیں۔ حکومت ان کا بے دردی سے استحصال کرتی ہے۔ کوکلکس کلان کے فاشسٹ ان پر ظلم و ستم ڈھاتے ہیں۔ وہ سب کچھ دیکھتا ہے۔ مگر زبان تک نہیں ہلاتا۔ اس لئے کہ اس کا احساس مر چکا ہے۔ اس کی انسانیت مر چکی ہے۔ اس لئے کہ وہ امریکی حکومت کا آلۂ کار ہے۔ اسے اس ملک کے تباہ حال انسانوں سے کوئی ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ وہ صرف امریکی سامراج کا زر خرید کارندہ ہے اور اس انٹلکچوئل قسم کی لڑکی کا بذاتِ مطلق آرٹسٹک نہیں۔ وہ میرے آرٹ کی تعریف میں محض مجلسی تکلف برتتی ہے۔ اسے فن مصوری سے کوئی لگاؤ نہیں۔ وہ خوشحال متوسط طبقے کی ان لڑکیوں کی طرح ہے جو ہالی وڈ کی فلموں اور فیشن میگزینوں کو دیکھ کر یکایک زندگی کو بڑا رومان انگیز محسوس کرتی ہیں۔ پھر ان کا جی چاہتا ہے کہ اپنے حسن کو اور نکھاریں، بہترین لباس پہنیں۔ اپنی سماجی شخصیت کو ممتاز کریں۔ پھر بال روم کے ہنگامے ہوتے ہیں۔ کلب کی رومانی ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ چمکتی دمکتی کاروں میں پُراسرار سرگوشیاں ہوتی ہیں اور ہنستی مسکراتی چاندنی راتوں میں بے باک قہقہے گونجتے ہیں۔ لیکن زندگی کو اس قدر حسین بنانے کے لئے انھیں جو راہ اختیار کرنا پڑی ہے۔ قدامت پسند اسے آوارگی اور بدچلنی سے تعبیر کرتے ہیں اور روشن خیال لوگ سماجی اور اخلاقی اقدار کی شکست و ریخت کہتے ہیں۔

مجھے ان لڑکیوں سے کوئی بغض نہیں۔ آخر انھیں قابلِ نفرت کیوں قرار دیا جاتا ہے۔ ان کا جرم صرف اسی قدر تو ہے کہ یہ سماجی برتری کی خواہاں ہیں اور سماجی برتری کا یہ احساس اتنی شدت سے بڑھتا جا رہا ہے کہ زندگی پر ملمع کی تہہ چڑھتی جا رہی ہے۔ خود میں نے اسکیچنگ کو محض تفریحی مشغلہ کے طور پر شروع کیا

تھا اور جب مجھے داد ملنے لگی۔ مجھے آرٹسٹ سمجھا جانے لگا تو اچانک یہ محسوس ہوا کہ میرا بھی وجود ہے۔ میری بھی کوئی شخصیت ہے اور اب میں اپنی شخصیت کو فروغ دے رہا ہوں۔ اپنے فن کو شہرت دے رہا ہوں۔

میں انڈیا کافی ہاؤس میں بھی بیٹھا کرتا ہوں اور اکثر میز پر تنہا بیٹھا سگریٹ پیا کرتا ہوں۔ کافی پیا کرتا ہوں۔ پورٹ فولیو سے کاغذ نکالتا ہوں۔ پنسل نکالتا ہوں پھر کسی قریب کی میز پہ بیٹھے ہوئے شخص کے خدوخال بنانا شروع کر دیتا ہوں۔ میں اس کی طرف گہری نظروں سے بار، بار دیکھتا ہوں۔ اس رویہ پر وہ مشتبہ ہو کر میری میز کے پاس سے گزرتا ہے۔ پھر آہستہ سے نزدیک آکر پوچھتا ہے۔

"یہ تو شاید آپ نے میری ہی شکل بنادی؟"

میں بے تکلفی سے مسکرا کر کہتا ہوں۔ "شاید آپ ہی ہوں۔ پہچان لیجئے؟"

وہ کرسی کھسکا کر مسکراتا ہوا میرے قریب بیٹھ جاتا ہے۔ مجھے سگریٹ پلاتا ہے۔ کافی پلاتا ہے۔ اپنے ملنے والوں سے میرا تعارف کراتا ہے۔ میرے آرٹ کی خوب تعریف کرتا ہے۔ اس طرح میری شخصیت سے متاثر ہونے والے روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں۔ میری شہرت اور میرے فن کی قدردانی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ بیوپار یہاں ہر فن کار کرتا ہے۔ ادیب بھی اور شاعر بھی۔ جرنلسٹ بھی اور مقرر بھی۔ یہاں پبلسٹی کے لئے دلالوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔

میری شخصیت میں جلد ہی جذب ہو جانے والے نیو انڈیا کافی ہاؤس میں بہت ملتے ہیں۔ ان میں وہ اسٹوڈنٹ زیادہ ہیں، جو کسی آرٹسٹ کی صحبت میں بیٹھنا باعث فخر سمجھتے ہیں۔ یہ مجھے اصرار کر کے کافی پلاتے ہیں، سگریٹ پلاتے ہیں، سینما دکھاتے ہیں اور کبھی، کبھی شراب بھی پلا دیتے ہیں۔ یہ جلد ہی بے تکلف ہو جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ذرا، ذرا سی بات پر بحث کرتے ہیں اور اپنی تائید میں کسی بڑے آدمی کا مقولہ سند کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ بالوں کو بار، بار سنوارتے ہیں، پھر زینہ پر لگے ہوئے "صرف فیملیز" والے بورڈ کو دیکھتے ہیں۔ یہ بورڈ ان کے اور اوپر گیلری میں بیٹھی ہوئی لڑکیوں اور نوجوان عورتوں کے درمیان ایک دیوار کی طرح حائل ہے۔ اس دیوار کو کافی ہاؤس کے مینجر نے نہیں کھڑا کیا۔ یہ دیوار صدیوں سے یونہی کھڑی ہے۔ یہ دیوار عورت اور مرد کے درمیان ایک حد بندی ہے، ایک فاصلہ ہے۔

یہ نوجوان گیلری میں بیٹھی ہوئی لڑکیوں اور نوجوان عورتوں کو صرف دیکھا کرتے ہیں۔ ٹائی کی گرہ درست کیا کرتے ہیں، بال سنوارا کرتے ہیں۔ ان کو اس عالم میں دیکھ کر مجھے چوک کے وہ چائے خانے یاد آجاتے ہیں، جہاں میں اکثر بیٹھا کرتا ہوں۔ یہاں آتے ہوئے مجھے اجنبیت محسوس ہوتی ہے۔ دراصل یہ بازار آج بھی وہیں ہے جہاں نصف صدی پہلے تھا۔ زندگی کا قافلہ منزلوں آگے نکل چکا ہے اور یہاں صرف جرسِ کارواں کی صدائے بازگشت ہے۔ یہاں ہر چیز قدیم ہے۔ وہی دھنسی ہوئی دو کانیں۔ وہی تنگ بازار۔ وہی اکبری دروازہ۔ وہی حیدر حسین خان کا پھاٹک اور اس کے پہلو میں وہی منشی نثار حسین کی دوکان ہے۔ کتابوں کی اسی دوکان سے رسالہ "پیام یار" نکلتا تھا۔ اسی دوکان پر عبدالحلیم شرر، رتن ناتھ سرشار اور ریاض خیرآبادی کی ہر شام کو نشستیں ہوتی تھیں۔ قیام ندوۃ العلماء کے بعد شبلی نعمانی بھی ان بے تکلف صحبتوں میں شرکت کیا کرتے تھے۔ حیدر حسین خان کے پھاٹک سے متصل ابھی تک وہ بالاخانہ موجود ہے، جس میں نوبہار رہتی تھی۔ جس کے متعلق مشہور ہے کہ سرشار اور ریاض دونوں اسکی بانکی چتونوں کے گھائل تھے۔

اس بالاخانے پر آج بھی طوائفیں رہتی ہیں اور ہر شام کو بن سنور کر کسی کو تیرِ نظر سے گھائل کرنے کے لئے بیٹھتی ہیں۔ نیچے سڑک پر گزرنے والے ان کو دیکھتے ہیں۔ اشارے کرتے ہیں، مسکراتے ہیں اور چائے خانے میں میرے برابر والی میز پر بیٹھے ہوئے نوجوان اپنے ریشمی اسکارف درست کرتے ہیں، سگریٹ سے دھوئیں کے دائرے بناتے ہیں اور ٹھہر ٹھہر کر بے چینی سے سامنے والے چھجے کی طرف دیکھتے ہیں۔ پھر کوئی الھڑ اور شوخ طوائف اپنی نتھ کا موتی درست کرتی ہوئی آتی ہے۔ نیچے تنبولی سے چیخ کر کہتی ہے۔ "اے چھبیلے، دس گلوریاں اوپر بھجوا دو، جلدی سے۔" پھر ایک نگاہِ غلط انداز سے اِدھر اُدھر دیکھ کر بے باکی سے مُسکرا دیتی ہے۔ یہ مسکراہٹ عشوہ سازی ہے۔ لگاوٹ ہے۔ ایک پیام ہے۔ میرے نزدیک بیٹھے ہوئے ان نوجوانوں کے لئے، ان کے ایسے لاتعداد نوجوانوں کے لئے جن کے واسطے نیو انڈیا کافی ہاؤس میں "صرف فیملیز" والا بورڈ آویزاں ہے۔ وہ دیوار کھڑی ہے جو صدیوں سے عورت اور مرد کے درمیان حائل ہے اور یہ بازار اس دیوار کو عبور کرنے کا چور دروازہ ہے۔

وہ الھڑ لڑکی اپنی نتھ کا موتی درست کرتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ نوجوان اپنے اسکارف درست کرتے رہ

جاتے ہیں۔ سگریٹ کے دھوئیں کے دائرے بناتے رہ جاتے ہیں۔ وہ اپنی جگہ پر بیٹھے رہتے ہیں۔ وہ اوپر بالاخانے پر نہیں جاسکتے۔ اس لئے کہ ان کی اماں جانی کا وثیقہ فروخت ہو چکا ہے۔ نہ ان کا صاحب جائیداد کوئی لاولد چچا ہے اور نہ ان کے کسی بڑے بھائی یا بہنوئی نے جنگ کے دوران میں سرکاری ٹھیکوں سے تگڑی کمائی کی ہے۔ یہ بگڑے ہوئے نوابوں کے صاحب زادے ہیں۔ یہ دیوالئے رئیسوں کے برخوردار ہیں۔ ان کی جیبیں خالی ہیں اور چائے خانے کا مالک خواجہ، خالص کاروباری آدمی ہے۔ وہ ان کی طرف گھور گھور کر دیکھ رہا ہے۔ لہٰذا ان کو ایک کپ چائے اور پینا چاہئے۔ ورنہ یہاں سے اُٹھ جانا چاہئے۔ خواہ مخواہ کرسیاں گھیرے ہوئے ہیں۔ یہ گاہکوں کے ہجوم کا وقت ہے۔ آفتاب غروب ہو رہا ہے اور شام اودھ طلوع ہو رہی ہے۔

وہ بوڑھے کی تیکھی نظروں کا مقصد سمجھتے ہوئے بھی انجان بنے ہوئے ہیں۔ ان کو ابھی یہاں کچھ دیر اور بیٹھنا ہے۔ انھیں ابھی بہت سی باتیں کرنا ہیں اور یہ باتیں کیا ہوں گی یہی کہ نکہت کا آج ریڈیو پروگرام ہے۔ زہرا کو مجرے پر سندیلہ جانا ہے۔ اللہ رکھی کے یہاں دہلی سے سیٹھ چنی لال آیا ہوا ہے۔ وہ اللہ رکھی کو ایک ہزار روپیہ ماہوار دیتا ہے اور شہر یار پھوکٹ میں بسم اللہ پر حکومت چلاتا ہے۔ وہ کچھ بھی نہیں دیتا بلکہ اور اینٹھ کر لے جاتا ہے۔ وہ چوک کی ہر طوائف کے متعلق اس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ ان کے پاس ہر طوائف کے متعلق پوری اطلاعات ہیں۔ وہ ان کا ہر پروگرام جانتے ہیں۔ طوائفوں کا نام بڑے احترام سے لیتے ہیں۔ ان کی شخصیت کا پورا لحاظ رکھتے ہیں۔ وہ ان کم سن نوچیوں میں گہری دلچسپی لیتے ہیں جو ابھی تک نتھ پہنتی ہیں اور جن پر نائیکائیں کڑی نگرانی رکھتی ہیں۔ یہ ان کے معاشقوں پر بجھے ہوئے لہجہ میں یوں تبصرہ کرتے ہیں۔

"اماں! یہ انوری کو کیا ہو گیا ہے۔ اس اُلّو کے پٹھے رحمان پر ریجھی ہوئی ہے۔"

"یہ رحمان وہی صادق پہلوان کا پٹھا ہے نا؟"

"جی ہاں، وہی مچھیل۔ کیا حلیہ ہے کمبخت کا۔ خدا جانے انوری کو اسکی کون سی ادا بھا گئی۔ سُنا ہے، اس پر ہار پھینکے جاتے ہیں۔ اپنے ہاتھوں کی بنی ہوئی گلوریاں بھیجی جاتی ہیں۔ دیکھئے ابھی اور کیا ہوتا ہے۔"

"بات دراصل یہ ہے کہ صاحب عورت تو مرد کے بدن پر مرتی ہے اور رحمان کا بدن ٹھہرا کسرتی۔ اس نے ہاتھ پاؤں بھی کیا اچھے نکالے ہیں۔"

"اسی لئے تو بزرگوں نے کہا ہے کہ رنڈی سو سے کھاتی ہے، ایک کو کھلاتی ہے۔"

یہ نوجوان یونہی بیٹھے رہتے ہیں۔ باتیں کرتے رہتے ہیں۔ خواجہ ان کو گھورتا رہتا ہے، جھنجلاتا رہتا ہے۔ اور یہ انتظار کرتے رہتے ہیں کہ ابھی سامنے چھجے پر وہ الھڑ طوائف آئے گی۔ اپنی نتھ کا موتی درست کرے گی۔ پھر ان کی طرف دیکھ کر مسکرا دے گی۔ پھر کسی روز انوری کی طرح ان پہ ہار پھینکے گی۔ انھیں اپنے ہاتھوں کی بنی ہوئی گلوریاں بھیجے گی وہ شیفتگی کے عالم میں سوچتے رہتے ہیں۔ یکایک خواجہ ان کے پاس آکر کہتا ہے۔

"کرسیاں کچھ کم پڑ رہی ہیں۔ گاہک لوٹ، لوٹ کر جا رہے ہیں۔ ذرا بازار کا ایک چکر ہی لگا لیجئے۔ معاف کیجئے گا۔ اس گستاخی کو۔"

نوجوان سٹ پٹا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ گھبرائے ہوئے لہجہ میں اظہار معذرت کرتے ہیں۔

"جی کوئی بات نہیں۔"

وہ دوکان سے نکل کر سڑک پہ پہنچ جاتے ہیں۔ ان کے جاتے ہی نوابو مرزا پان کی پیک تھوک کر کہتے ہیں۔

"واللہ! الیے ڈھیٹ تو دیکھے ہی نہیں۔ نہ کوئی شرم ہے، نہ لحاظ۔ دوسرے کے نقصان کا بھی کچھ خیال نہیں۔"

وہ آہ سرد کھینچتے ہیں۔ "ہائے، ہائے! کیا زمانہ آگیا ہے۔" میں نے اکثر غور کیا ہے کہ نوابو مرزا ہر موقع پہ زمانہ کو ضرور کوستے ہیں۔ ان کو اس دور کی ہر ایک چیز سے بغض ہے۔ عداوت ہے۔

نوابو مرزا اس چائے خانہ میں بڑی پابندی سے آتے ہیں۔ آتے ہی ایک کپ چائے ضرور پیتے ہیں اور چائے میں نمک ڈالنا کبھی نہیں بھولتے۔ قبلہ کے رُخ کبھی پشت نہیں کرتے۔ اگر کبھی ایسا اتفاق ہوتا ہے تو ہمیشہ کھڑے رہتے ہیں۔ ان کے ہر انداز میں ایک انفرادیت ہے۔ ایک خاص وضعداری ہے۔ ایک خاص آن بان ہے اور اسی آن بان کی خاطر انھوں نے سب کچھ کھو دیا۔ خواجہ ان کو برسوں سے جانتا ہے وہ بتاتا ہے کہ ایک زمانہ تھا جب نوابو مرزا کا چوک کے بالاخانوں میں بڑا شہرہ تھا۔ طوائفیں ان کیلئے آنکھیں بچھاتی تھیں۔ دوکاندار جھک جھک کر آداب بجالاتے تھے۔ مگر ان کے پاس اب کچھ نہیں رہا۔ صرف پرانی آن بان رہ گئی ہے۔ رسی جل گئی، بل باقی ہے۔

لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے کہ چور چوری سے جائے، مگر ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ یہ کہاوت نوابو مرزا پر

پوری طرح صادق آتی ہے۔ وہ ہر شام کو کھڑے گھاٹ کا دُھلا ہوا اُجلا لباس پہنے، چاندی کی موٹھ کی چھڑی کے سہارے سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے ہوئے خراماں، خراماں اس بازار میں آتے ہیں، جس کی شام سے شام اودھ موسوم ہے۔ نوابو مرزا بازار سے گزر کر خواجہ کے چائے خانے میں داخل ہوتے ہیں۔ خواجہ سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہیں۔ چائے کی پیالی اٹھا کر گھونٹ بھرتے ہیں۔ بالا خانوں میں گھنگھرو چھنکتے ہیں۔ طبلہ پر تھاپ پڑتی ہے۔ گانوں کی آوازیں آتی ہیں۔ نوابو مرزا گانا سنتے، سنتے تڑپ کر کہتے ہیں۔

"لاحول ولاقوۃ! کیا بے سرا الاپ رہی ہے۔ طبلہ کہاں جا رہا ہے۔ سارنگی کدھر ہے۔ کمبخت کو کچھ ہوش ہی نہیں۔ اور بھئی سچ تو یہ ہے کہ اب وہ گانے والیاں بھی نہیں رہیں۔ اب تو ڈومنیاں رہ گئی ہیں۔ ڈومنیاں۔ واللہ وہ بات ہی نہیں رہی۔ گانے والی تو صاحب صرف ایک دیکھی، نور پور والی شریفن۔ یہی سبزی منڈی کے سامنے اس کا کوٹھا تھا۔ ظالم نے کیا غضب کا گلا پایا تھا۔ بھئی میں نے تو کلکتہ والی گوہر کو بھی سنا اور آگرہ کی اچھن بائی کو بھی۔ مگر شریفن کی آواز میں جو رس تھا وہ کہیں بھی نہ ملا ہے، بے کیا قیامت کی آواز تھی۔ پھر صاحب طبیعت بھی اتنی اچھی کہ کبھی اس کے ہاں نہیں گیا تو گھنٹوں شکایت کرتی تھی۔ جیسا مزاج پایا تھا اللہ میاں نے ویسا ہی حسن بھی دیا تھا۔"

نوابو مرزا کہتے رہتے ہیں اور خواجہ کسی گاہک کی جانب متوجہ ہو جاتا ہے۔ نوابو مرزا گہری سانس بھر کے یادوں میں کھو جاتے ہیں۔ ان کے چہرے پہ یاس انگیز خاموشی چھا جاتی ہے۔ ان کو ایسے عالم میں دیکھ کر میں نے ان کے کتنے ہی اسکیچ بنا ڈالے ہیں۔

نوابو مرزا لکھنو کے اس تنزل پذیر تمدن کی یادگار ہیں جو جان عالم واجد علی شاہ کے دورِ حکومت میں اودھ کی معاشرت میں پوری طرح رچا ہوا تھا اور امانت اور رنگین کی شاعری جس سے مستعار ہے۔ یہ زندگی کی وہ سرحد ہے، جہاں موت کی پرچھائیاں لہراتی ہیں۔

چوک سے آگے جس قدر بڑھتا جاتا ہوں، مجھے نوابو مرزا کی قبیل کے لوگ قدم قدم پر ملتے ہیں۔ یہاں تنگ و تاریک گلیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ کہن سال بوسیدہ مکان نظر آتے ہیں، چھوٹے چھوٹے چائے خانے ملتے ہیں، جن میں بیٹھنے والے لوگ، انگریز افسروں کا نام پورے ادب سے لیتے ہیں۔ اپنے خاندان پر ان کی نوازشوں کو بڑے فخر سے بیان کرتے ہیں۔ ان کے انتظامِ حکومت کی اب تک تعریف کرتے ہیں۔ ان کے ذہن میں زندگی کا کوئی

بھی واضح تصور نہیں۔ یہ ان انسانوں میں سے ہیں جو مستقبل میں اندھیرا ہی اندھیرا دیکھتے اور جو خودکشی کر لیتے ہیں یا اپنے ماضی کی طرف پلٹ جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کی نئی سرگرمیوں سے بچھڑ کر یتیم ہو گئے ہیں اور اپنے مردہ وجود پر خود ہی سوگ منا رہے ہیں۔ یہاں ایسے لوگ بھی ملتے ہیں جنہیں جرأت اور انشاء کی پوری، پوری غزلیں یاد ہیں اور جنہوں نے اختر شیرانی اور فیض احمد فیض کا کبھی نام نہیں سُنا۔

ان کوچہ و بازار میں انیس اور آتش کی رُوح آج بھی جھلکتی ہے۔ یہاں گفتگو میں آج بھی مُجھو بیگ ستم ظریف کا طنز ملتا ہے اور سرشار کا روزمرہ اور محاورہ آج بھی یہاں مرزا محمد عسکری کی بیٹھک میں ایک ایک شعر پر مہینوں بحث چلتی ہے۔ یہاں آج بھی جعفر علی خان اثر اپنے دیوان خانے میں نہایت اہتمام سے اپنا کلام بلاغت نظام سناتے ہیں اور اکثر شام سے صبح تک سناتے ہیں۔

شاعروں کی صحبتیں میں نخاس کے چائے خانوں میں بہت دیکھتا ہوں۔ یہ نہایت مرصع غزلیں کہتے ہیں۔ شعروں کو نوک پلک سے درست رکھتے ہیں۔ فنی قاعدوں کو پورے اہتمام سے برتتے ہیں۔ معمولی شعر کو خالص تغزل کہہ کر سنا دیتے ہیں۔ اور اچھے شعروں کو صرف الیطاء جلی کی خاطر مسترد کر دیتے ہیں۔ میں یہاں ٹی ہاؤس میں بیٹھتا ہوں۔ شعر و ادب کی ان محفلوں سے لُطف اٹھاتا ہوں۔ یہ شاعر پان کھلاتے ہیں۔ سگریٹ پلاتے ہیں۔ چائے پلاتے ہیں۔ پھر بڑے تکلف سے کہتے ہیں۔

"کل شب کو کچھ شعر ہو گئے تھے۔ کہئے تو حاضر کروں"۔ پھر بیس پچیس شعروں کی غزل سنا ڈالتے ہیں۔ اور سخن فہم جی کھول کر داد دیتے ہیں۔

"واللہ کیا مطلع کہا ہے۔ دوسرا کہے تو خون تھوک دے"۔

"واہ! واہ! کیا تیور ہیں۔ ہے، ہے قیامت کر دی آپ نے منظر صاحب"۔

تعریفیں ہوتی رہتی ہیں اور منظر صاحب گریبان و دامن کی دھجیاں اڑاتے رہتے ہیں۔ معشوق کی ستم شعاریوں کا رونا روتے ہیں۔ اس کے دشنام کو سراہتے ہیں۔ رقیب روسیاہ کو کوستے ہیں۔ فلکِ کج رفتار کی دہائی دیتے ہیں اور سننے والے جھوم، جھوم کر داد دیتے ہیں۔ پھر خود ہی چائے کا آرڈر دیتے ہیں۔ پان اور سگریٹ کا آرڈر دیتے ہیں۔ واہ، واہ، سبحان اللہ کا شور گونجتا رہتا ہے۔ پھر غزل ختم ہو جاتی ہے۔ منظر صاحب

جُھک، جھک کر آداب کرتے ہیں۔ کچھ انکساری برتتے ہیں۔ اس عرصے میں ان کی چائے ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ وہ چائے کی دوسری پیالی پیتے ہیں۔ ان کا حساب بڑھتا جاتا ہے۔ چائے خانے کا مالک ٹوکنے لگتا ہے۔ یہ کسی دوسرے چائے خانہ میں اڈا جما دیتے ہیں۔ ٹی ہاؤس کے سامنے سے گزرتے ہوئے کتراتے ہیں۔ قرض ان پر روحانی اذیت کی طرح طاری رہتا ہے۔ ان کی مفلسی ان کے لئے عذاب ہے۔ یہ خود اپنے وجود پر لعنت ہیں۔ یہ شاعر نہیں بھکاری ہیں۔ یہ کاسۂ شاعری لے کر بھیک مانگتے ہیں۔ یہ سخن شناسوں کو ڈھونڈھتے ہیں۔ اپنے ایکسپلائٹ کرنیوالوں کو ڈھونڈتے ہیں۔ یہ فن کار نہیں اندھے ہیں۔ انھوں نے زندگی کی اعلیٰ قدروں کی طرف سے آنکھیں پھیر لی ہیں۔ یہ وہ شاعر ہیں جنھیں سوائے طوائف اور بیویوں کے کسی کا قرب حاصل نہیں ہوا۔ ان کی شاعری میں محبوبہ کا تصور آج بھی طوائف ہی کے روپ میں ملتا ہے۔

ٹی ہاؤس میں سکریٹریٹ کا ایک کلرک بھی آتا ہے۔ وہ صرف ایک کپ چائے پیتا ہے۔ تازہ اخبار، جسے شاعر نظر انداز کر دیتے ہیں، بڑے انہماک سے پڑھتا ہے۔ وہ شاعروں سے علیحدہ ہی رہتا ہے۔ اس لئے کہ اس کے پاس وقت کم ہے۔ اسے ابھی دفتر جانا ہے اور اخبار بھی پڑھنا ہے۔ کلرک اور اسی قسم کے متوسط طبقے کے دوسرے لوگ مجھے ہر چائے خانہ میں ملتے ہیں۔ لیکن یہ مولوی گنج اور امین آباد کے چائے خانوں میں زیادہ نظر آتے ہیں۔ ان چائے خانوں میں ریڈیو بھی ہوتا ہے۔ یہ لوگ ریڈیو پر خاص طور سے خبریں سنتے ہیں۔ پھر قومی سیاست سے بین الاقوامی سیاست تک ہر مسئلے پر تبصرہ شروع کر دیتے ہیں۔ یہ ہمیشہ کسی نئی جنگ کی پیش گوئی کرتے ہیں۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی کا رونا روتے ہیں۔ اشیائے صرف کی قلت پر بھنجلاتے ہیں۔ رشوت کے نت نئے ذرائع پر غور کرتے ہیں۔ بدعنوانیوں کو بڑھاتے ہیں۔ بلیک مارکیٹ کو فروغ دیتے ہیں۔ حکومت کو صرف برا بھلا کہتے ہیں۔ سیاسی پیچیدگیوں کو خالص فرقہ وارانہ زاویۂ نظر سے دیکھتے ہیں اور فسادات کی خبروں پر پورے تعصب کا اظہار کرتے ہیں۔

یہ لوگ چھوٹے، چھوٹے تنگ مکانوں میں رہتے ہیں، جس کے ایک ہی کمرہ میں خاندان کے کئی افراد کی رہائش ہوتی ہے۔ یہ چائے خانہ میں اس وقت تک بیٹھتے ہیں، جب تک گھر پر سناٹا نہ چھا جائے۔ سب لوگ سو نہ جائیں۔ تاکہ یہ بیوی سے اطمینان سے باتیں کر سکیں۔ خلوت سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکیں اور خلوت میں بیوی سے باتیں کرنا ان کے لئے ضروری ہے۔ یہ جنسی بھوک کے مارے ہوئے ہیں۔ سڑک پر گزرنے والی جوان عورتوں

کو ہمیشہ نظر بچا کر دیکھتے ہیں۔ پڑوس میں رہنے والی عورتوں کی آشنائی مزے لے، لے کر سناتے ہیں۔ کسی اغوا کی داستان کو توجہ سے سنتے ہیں۔ پھر عورتوں کی بے راہ روی پر کڑھتے ہیں۔ نئی تہذیب پر لعنت بھیجتے ہیں۔

میں خاموش بیٹھا غور کرتا رہتا ہوں کہ اپنی پارسائی کو برقرار رکھنے والے یہ ناصح مشفق کس طرح جنسی تسکین حاصل کرتے ہیں۔ رند کے رند رہتے ہیں اور ہاتھ سے جنت بھی نہیں جانے دیتے۔ انھیں اپنی خاندانی وجاہت پر بڑا ناز ہے۔ ہمیشہ اپنا سلسلہ نسب ان جاگیرداروں سے ملاتے ہیں جنھوں نے ۱۸۵۷ کے غدر میں انگریزوں کو پناہ دی، چوری چھپے مدد کی۔ اپنی بڑھتی ہوئی اقتصادی بدحالی کو یہ سات پردوں میں چھپاتے ہیں۔ زندگی کو ملمع کر کے پیش کرتے ہیں۔ ان کے رہن سہن، نشست برخاست، لب ولہجہ، غرضیکہ ہر انداز میں تصنع ہی تصنع ہے اور یہ تصنع ہی ان کے لئے سب کچھ ہے۔ یہ خود اپنے وجود کے لئے بھی مخلص نہیں۔

میں اسی طرح چائے خانوں میں بیٹھا ہوا ہر وضع قطع کے لوگوں کو دیکھا کرتا ہوں۔ ان کے اسکیچ بنایا کرتا ہوں۔ میں روز نئی، نئی شخصیتوں کو دیکھتا ہوں۔ ہر طبقہ کی زندگی کا ہر رُخ سے مطالعہ کرتا ہوں۔ رات ڈھلتی جاتی ہے۔ بازاروں کی رونق اجڑتی جاتی ہے۔ سڑکیں سنسان ہوتی جاتی ہیں۔ دوکانیں بند ہونے لگتی ہیں۔ چائے خانے بھی بند ہونے لگتے ہیں۔ لیکن امین آباد کے کچھ چائے خانے رات گئے تک کھلے رہتے ہیں۔ رات جس قدر ڈھلتی جاتی ہے، یہاں وہی لوگ نظر آتے ہیں۔ جو میری ہی طرح بوہیمین ہیں۔ پھر امین آباد، امین آباد نہیں رہتا پیرس کا لیٹین کوارٹر بن جاتا ہے۔ ان میں بیشتر تعداد ان نوجوانوں کی ہے جو زندگی کے ہر مسئلہ کے بارے میں ایک واضح نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ سیاسی اور سماجی امور پر بڑی کھری تنقید کرتے ہیں۔ رات گزرتی جاتی ہے۔ یہ باتیں کرتے رہتے ہیں۔ چائے پیتے رہتے ہیں۔ سگریٹ کے کش پر کش لگاتے ہیں۔ نیند کے متعلق یہ بالکل نہیں سوچتے۔ اس لئے کہ ان کے انتظار میں کوئی بے چینی سے کروٹیں بدلنے والا نہیں۔ لیکن ان کے رویہ میں جنسی بھوک کی شدت بھی نہیں۔ ان کی زندگی صرف باتیں ہیں۔ چائے ہے اور سگریٹ ہے۔ یہ بجھے بجھے رہتے ہیں۔ کھوئے، کھوئے سے رہتے ہیں۔ جیسے انھیں کوئی جستجو ہے، کوئی ذہنی خلش ہے۔

رات اور ڈھل جاتی ہے۔ چائے خانے بند ہو جاتے ہیں۔ ستاروں کی جبینیں دھندلی پڑ جاتی ہیں۔ میں چونک کر سوچتا ہوں کہ رات گزر چکی ہے۔ اب مجھے گھر جانا چاہئے۔ لیکن میں گھر نہیں جاتا۔ بلکہ کسی دوکان کے تختہ

پر بیٹھ کر صبح کا انتظار کرنے لگتا ہوں اور انتظار کرتے، کرتے نیند سے شکست کھا کر میری آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ میں وہیں سو جاتا ہوں۔ پھر کوئی پہرے دار آکر مجھے جھنجھوڑتا ہے۔ میں گھبرا کر پوچھتا ہوں۔

"کیا ہے؟"

وہ ذرا سختی سے کہتا ہے۔ "یہ سونے کی جگہ نہیں۔ آپ کہاں رہتے ہیں؟"

میں تلملا کر پوچھتا ہوں۔ "کیا مطلب ہے تمھارا؟"

"مطلب یہ ہے کہ آج کل دوکانوں کے تالے ٹوٹ رہے ہیں۔ آپ یہاں نہیں سو سکتے۔"

میں بگڑ کر کہتا ہوں۔ "ذرا آدمی دیکھ کر بات کیا کرو۔"

مگر وہ میرے سوٹ اور کیلی فورنین ٹائی سے مطلق مرعوب نہیں ہوتا۔ اسی طرح بدتمیزی سے کہتا ہے۔ "اجی بہت دیکھے ہیں آدمی۔ آج کل سوٹ بوٹ پہن کر ہی تو چوری کی جاتی ہے۔"

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہوں۔ میں خاموش بیٹھا ہوا پیچ و تاب کھاتا رہتا ہوں۔ پھر وہ خود ہی ذرا نرم ہو کر کہتا ہے۔ "دیکھئے اگر کوئی تالا ٹوٹ گیا تو آپ کا کچھ نہیں جائے گا۔ میری نوکری پر بن جائے گی۔"

اس گفتگو میں میری نیند اچاٹ ہو جاتی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ اب اسٹیشن جانا چاہئے۔ وہاں مسافر خانے میں چائے بھی مل جائے گی۔ ویٹنگ روم میں یا پلیٹ فارم کی کسی بنچ پر ذرا آرام کرنے کے لئے جگہ بھی مل جائے گی۔ میں اسٹیشن کی طرف چل دیتا ہوں۔ سڑکوں پر گھومنے والے آوارہ کتے مجھے دیکھ کر بھونکنے لگتے ہیں۔ اور گشت کرنے والے کانسٹیبل زور سے کھنکارتے ہیں۔

جھیلوں کی سرزمین پر

کنوار کا مہینہ لگ چکا تھا۔ اندھیری راتوں کی کالی چھایا دھندلی پڑ گئی تھی۔ اب بھیگی ہوئی ہوائیں نہیں چلتیں۔

آسمان پر بھورے، بھورے بادلوں کا غبار چھایا تھا۔ جن کے پیچھے دوپہر کا تیز الاؤ دہک رہا تھا۔ میلی دھوپ میں پالی کسان جڑ ہن دھان کی بوائی کر رہے تھے۔ ان کے پیر ٹخنوں، ٹخنوں تک پانی میں ڈوبے ہوئے تھے، سروں پر سینھڑ کی چھال سے بنی ہوئی چھتری نما ٹوپیاں تھیں۔ پھر بھی پسینہ نہیں تھمتا۔ ان کے ہاتھوں میں دھان کے کومل پودے دبے تھے۔ وہ پودوں کو سنبھل، سنبھل کر پانی کے نیچے مٹی میں لگاتے جا رہے تھے۔ ان کی جھکی ہوئی پیٹھ پر دھوپ کی تیزی سے خارش کے سے بھورے، بھورے دھبے پڑ گئے تھے۔ جب سورج بادلوں کی اوٹ سے اچانک نکل پڑتا تو جھکی ہوئی پیٹھ کی دھبوں والی کھال سلگنے لگتی۔ کڑیل جسموں والے کسان پھر بھی اپنے کام میں جتے ہوئے تھے۔ البتہ کوئی بوڑھا کسان بے ہوش ہونے کی سی حالت میں لڑکھڑاتا ہوا قریب کے پیڑوں تلے جا کر لیٹ جاتا۔ ہوا کا کوئی بھولا بھٹکا جھونکا آتا۔ بوڑھا کسان اٹھ کر بیٹھ جاتا۔ سوکھے تمباکو کا چرٹ بنا کر لمبا کش لگاتا۔ کھانسی کے ساتھ دھوئیں کے بادل چھوڑتے ہوئے اپنے کھیت کی سمت دیکھتا۔ جھکی ہوئی گردنوں والے کسان بوائی میں جتے تھے۔ بوڑھا کسان درخت کے نیچے بیٹھے، بیٹھے اونچی آواز میں ہدایتیں دیتا رہتا۔

"ہے! باڑھ چھوڑ کر۔"

"کیا کرتا ہے دھیرو؟ کالی پتی پھینک دے۔"

دھیرو دھان کے اس پودے کو کھیتوں کی مینڈھ پر پھینک دیتا، جس کی لانبی پتیاں چھیدری پڑ گئی

تھیں۔ رنگ گہرا ہو گیا تھا۔

میلی دھوپ بجھتی ہوئی چتا کی راکھ کی طرح دہک رہی تھی۔ ہوا دم سادھے ہوئے تھی۔ پالی کسان ننگی پیٹھوں کے بل جھکے ہوئے پانی سے لبریز کھیتوں میں دھان کے پودے لگا رہے تھے۔ ان کا لمبا چھریرا جسم مٹیالا پڑتا جا رہا تھا۔ ٹانگوں پر زور دیکر کام کرنے سے پنڈلیوں کی ابھری ہوئی نسیں مکڑی کے جالوں کی طرح الجھ گئی تھیں، کڑی محنت سے بنے ہوئے گوشت کے پٹھے اوپر تن گئے تھے۔ اب چاہے کیسی ہی دھوپ پڑے یا اوپر سے آگ برسے کھیتوں کی بوائی تو کرنا ہی پڑے گی۔ کام کسی طرح نہیں رک سکتا۔

سامنے کھیتوں کی آخری سرحد پر گاؤں تھا۔ یہ لکڑی کے تختوں اور پھوس سے بنے ہوئے بے ڈھنگ مکانوں کا بے ترتیب سلسلہ تھا۔ دوپہر کو یہاں سناٹا چھایا رہتا۔ سنسان گلیوں میں کبھی، کبھی گندے اور نیم برہنہ بچے شور مچا کر لڑنے جھگڑنے لگتے۔ کوئی بیمار بوڑھا جھکی ہوئی چھت کے نیچے زور، زور سے کھانسنا شروع کر دیتا۔ ان اچانک آوازوں سے گہرا سناٹا آن کی آن میں درہم برہم ہو جاتا۔ اور پھر وہی تھکی، تھکی سی خاموشی۔

سویرے بہت تڑکے بستی کے سارے مرد کھیتوں کی طرف چلے جاتے۔ عورتیں پالتو مرغیوں اور بطخوں کو مضبوط جالوں میں بھرتیں اور بینگیوں میں آگے پیچھے لٹکا دیتیں۔ ابھی رات کی سیاہی پوری طرح چھٹنے بھی نہ پاتی، وہ تاروں کی چھاؤں میں آبی پرندوں کی مانند لمبی، لمبی قطاریں بنا کر گھروں سے نکلتیں۔ کندھوں پر بینگیوں کو اٹھائے پتھریلے راستوں پر ان کے سُتواں جسم ہولے، ہولے لچکتے اور چوڑے، چوڑے برہنہ پیر تیزی سے گردش کرتے۔ سارے بدن کو ایک جھٹکے سے خم دیکر وہ ایک کندھے سے دوسرے کندھے پر بینگی کا بوجھ بدل لیتیں۔ اسی طرح پوری قطار لہراتی، بل کھاتی، نشیب کی جھیلوں پر پہنچ جاتی۔

مُرغیاں اور بطخیں، تمام دن جھیلوں کے کنارے دانے دنکے کی تلاش میں گھومتی پھرتیں۔ دوپہر کے سناٹے میں سن رسیدہ عورتیں جگالی کرتے ہوئے مویشیوں کی طرح چپا، چپا کر باتیں کرتیں اور وہ کنواریاں، جو ناک میں کوئی زیور نہیں پہنتیں اور جن کا بیاہ اب ہو جانا چاہیئے، دُور کسی ڈھلوان پر بیٹھی پرانے جالوں کو درست کرتی رہتیں۔ ان کے کانوں میں چاندی کے بڑے، بڑے بالے پڑے ہوئے تھے۔ گلے میں سُرخ مونگوں کا کنٹھا جھولتا ہوتا۔ مضبوطی سے گندھے ہوئے سر کے بال پیچھے کی طرف ابھر کر اونچے ہو جاتے۔ بالوں پر شوخ رنگ کا کپڑا لپٹا

ہوتا اور اس کی گرہ ٹھوڑی کے نیچے بندھی ہوتی۔

دوپہر کی خاموشی میں بانسری کی مدھر آواز یکایک دُور سے ابھری۔ پھر پتھریلی پگڈنڈی پر کوہستانی خچّر کے بُوجھل کھُروں کی رگڑ سے کھڑکھڑاہٹ پیدا ہوئی۔ کوئی پالی کسان آدار پور کے بازار سے لوٹ رہا تھا۔ بانسری کی آواز رفتہ رفتہ قریب آتی جا رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک تھکا ہوا خچر نمودار ہوا اور ایک ڈھلوان کے پاس آکر ٹھہر گیا۔ خچّر کی پُشت پر مٹیالے جسم والا کسان بیٹھا تھا۔ اس کے کندھے گوشت سے بھرے تھے۔ بازوؤں کی مچھلیاں ابھری ہوئی تھیں۔ چوڑے چہرے پر گرد جمی تھی۔ وہ آدا پور کے بازار سے آ رہا تھا۔ کسان چنچل نگاہوں سے ایک ٹک سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی کو دیکھتا رہا، جو خاموشی سے اپنے جالوں کو درست کر رہی تھی۔ اس کی ناک میں کوئی زیور نہیں تھا۔ مٹیالے جسم والے نوجوان کسان نے خچر کی پیٹھ پر آگے جھک کر پوچھا۔

"ہے بالا یہ جال تو بہت پرانا پڑ گیا ہے۔"

بالا بغیر اس کی طرف دیکھے ہوئے بولی "ابھی کام چل سکتا ہے۔ نیا جال کیوں خریدا جائے۔"

"اس میں روز محنت جو کرنا پڑتی ہے۔"

"ہاں محنت تو کرنا پڑتی ہے۔"

وہ خچر سے اتر کر بالا کے پاس چلا گیا۔ "تو اتنی محنت کیوں کرتی ہے؟ پہلے ناک میں پھول ڈال لے۔"

لڑکی بیٹھی ہوئی جالوں کو درست کرتی رہی۔

"کیا کہتی ہے؟"

اس دفعہ پرانے جالوں کو درست کرتے ہوئے بالا نے اسے بھرپور نظروں سے دیکھا۔ وہ آنکھیں چُرا کر ہنسنے لگا۔

"اب کے فصل اچھی جائے گی۔ کھیتوں میں پانی بھرا ہے۔"

"ہاں فصل اچھی جائے گی۔ سب ایسا ہی سوچ رہے ہیں۔"

"تو کیا کہتی ہے؟"

بالا ذرا دیر خاموش بیٹھی رہی، پھر اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ سر پر لپٹا ہوا گہرے سُرخ رنگ کا کپڑا ٹھوڑی کے نیچے سے کھولا اور جلدی سے ایک سرا پھاڑ کر پاس کھڑے ہوئے کسان کے اوپر پھینک دیا اور تیز قدموں سے چلتی ہوئی بھورے

ٹیلوں کے اس پار چلی گئی۔ کسان نے اسے گردن میں باندھا اور بیوقوفوں کی طرح دانت نکال کر ہنسنے لگا۔ پھر خچر پر سوار ہو کر پتھریلی پگڈنڈی پر چلنے لگا۔ خچر اچھل اچھل کر بھاگ رہا تھا۔ آدا پور کے بازار میں لگوائی ہوئی خچر کے کھروں کی نئی نعلیں پتھروں پر جھنکار رہی تھیں۔ گرد آلود چہرے والے پالی کسان کی گردن میں بندھا ہوا شوخ رنگ کا کپڑا ہوا سے لہرا رہا تھا۔ اگر یہ کپڑا بالا اسے نہ دیتی تو خچر دھیرے دھیرے چلتا اور کسان تھکے ہوئے انداز میں بنسری بجاتا ہوتا۔ لیکن اب وہ پتھریلے راستوں پر تیزی سے گزر رہا تھا۔ اسے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھ کر قریب کے کھیت سے ایک پالی کسان نے پکارا۔

"ہے بنسی!"

بنسی نے چیخ کر جواب دیا۔ "کیا ہے گردھر؟"

"بازار کیسی جا رہی ہے۔ ڈھور کیسے آئے ہیں؟"

"بہت سارے ہیں، جا دیکھ آ۔"

بنسی بغیر رکے ہوئے اپنے کھیتوں کی طرف بڑھتا رہا۔ قریب پہنچا تو بوڑھے کسان نے بازار کا حال پوچھا۔ بات کرتے کرتے وہ اچانک ٹھٹکا۔ اس کی نظر بنسی کے گلے میں بندھے ہوئے کپڑے پر پہنچ گئی۔ وہ تیکھی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر رسان سے دریافت کیا۔

"کون ہے وہ؟"

بنسی نے معصوم سی شکل بنا کر کہا۔ "سنگرام کی بالا۔"

بوڑھا کسان ذرا دیر خاموش رہا، پھر ڈپٹ کر بولا۔ "اتی دیر کر دی۔ جا کھیت کو دیکھ۔ چھوٹا دیر سے اکیلا ہی کام کر رہا ہے۔"

بنسی کے جاتے ہی بوڑھا کسان غور کرنے لگا۔ سنگرام کی بالا کا بدن خچر کی طرح مضبوط ہے۔ وہ پگڈنڈی پر بھاری بوجھ اٹھا کر پھرتی سے چل سکتی ہے۔ اس کی چھاتیاں بھری ہوئی ہیں۔ کولہے چوڑے ہیں۔ سال لگتے ہی بچہ ہوگا اور خوب موٹا تازہ ہوگا۔ سنگرام کے پاس بیس بیگھہ کھیتی ہے۔ چار خچر ہیں۔ بہت سی مرغیاں ہیں۔ بطخیں ہیں۔ اس کے سات بیٹے ہیں۔ سب کے سب کڑی محنت کرنے والے ہیں۔ یہ سوچ کر بوڑھے نے طے

کر لیا کہ وہ رات کو سنگرام کے گھر جائے گا۔

شام کا اندھیرا پھیلتے ہی بوڑھے کسان نے اُجلی دھوتی کا پھنیا کس کے باندھا اور جوانوں کی طرح اکڑتا ہوا گھر سے نکلا۔ اس کی بیوی اپنے سارے ہی زیور پہنے ہوئے تھی۔ اس نے سر پہ تیل چپڑ کر بالوں کو پیچھے کی طرف گوندھ لیا تھا۔ وہ بوڑھے کسان کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ سنگرام کے گھر والوں کو ان کا انتظار تھا۔ دروازے کی دہلیز پر پیر دھرتے ہی اندر آنگن میں بیٹھی ہوئی عورتوں نے گالیاں دینا شروع کر دیں۔ بوڑھے کسان نے کسی ناراضگی کا اظہار نہیں کیا اور نہ اس کی بیوی کے ماتھے پر بل پڑے۔ کوئی پالی کسان اس موقع پر بُرا نہیں مانتا۔ یہی ریت ہے۔ یہی رواج ہے۔ پالی کسان، ان وحشی خانہ بدوش قبائل کی نسل سے ہیں جو اپنی لڑکی کو بیاہنا ذِلّت سمجھتے تھے۔ ذِلّت کا یہ احساس پالی کسانوں میں اب بھی پایا جاتا ہے۔ وہ گالیوں سے اس کا تدارک کرتے ہیں۔ آخر گالیوں کی بوچھاڑ رُک گئی۔ دونوں کو سینٹھ کے دودھ کی بنائی ہوئی تیز شراب پیش کی گئی۔ بیوی نے بیاہ کا ذکر چھیڑا۔ شوہر نے ہاں میں ہاں ملائی۔ آخر بیاہ کی بات پکی ہو گئی۔ اب فصل کٹتے ہی پوری رسم ادا ہو جائے گی۔

۲

جڑہن دھان کے پودے کاتک کے آخر تک پوری طرح بڑھ گئے تھے۔ تیز ہوا سے دھان کی بالیاں جھومنے لگتیں۔ لمبی، لمبی پتیوں کے درمیان دھیمی، دھیمی سیٹیاں بجتی تھیں۔ جھیلوں کی سرزمین پر بہار آ گئی تھی۔ ہلکی، ہلکی مہک ہر طرف رچی تھی۔ جھیلوں کا پانی گہرا نیلگوں ہو گیا تھا۔ ڈھلوان پر ہلکے نارنجی پھول کوسوں تک بچھے ہوئے تھے۔ اکتوبر کی سنہری دھوپ میں ان کا رنگ اور نکھر تا جا رہا تھا۔ ہوا کے یکسار جھونکے چلتے تھے۔ پھولوں سے لدی ہوئی شاخیں جھومتی تھیں۔ تیز خوشبو میں بکھر جاتیں۔ مرغیاں اور بطخیں کثرت سے انڈے دیتی تھیں۔ عورتیں اب جالوں میں نہیں اُلجھی رہتیں۔ بلکہ لمبی گھاس کے اندر انڈوں کو تلاش کر کے اکٹھا کرتی رہتیں۔

دھان کے پودوں کا رنگ سنہری پڑتے ہی آس پاس کے شہروں کے آڑھتی اور بیوپاری پالی کسانوں کی بستیوں میں منڈلانا شروع کر دیتے۔ اس دفعہ پستہ قد کا ایک نیا آدمی بھی آیا۔ اس کے چہرے پر گھنی مونچھیں

تھیں، جنہیں انگلیوں سے ہٹ کر اس نے اوپر چڑھا لیا تھا۔ اس کے ایک دانت پر سونا چڑھا تھا۔ بات بات پر وہ ہنستا، سونے سے منڈھا ہوا دانت ہر بار جھلملاتا۔ پالی کسان اس کے چاروں طرف اکٹھا ہو گئے تھے۔ ان کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ وہ جانوروں کی طرح گردن اٹھا، اٹھا کر اسے دیکھ رہے تھے۔ اجنبی نے ذرا دیر خاموش رہ کر ان کی طرف گہری نظروں سے دیکھا، پھر کھیتوں کی طرف انگلی اٹھا کر بولا۔

"فصل تو اچھی معلوم پڑتی ہے۔"

پالی کسان کچھ نہ سمجھنے کے سے انداز میں ہنس دیئے۔

"کچھ سودا ودا بھی کیا؟"

اس بار کسانوں نے انکار میں گردن ہلا دی۔

ان کے انکار پر وہ مسکرا دیا، سونے سے منڈھا ہوا دانت جھلکنے لگا۔ پھر ایک دم سنجیدہ ہو کر کہنے لگا۔

"اچھا بتاؤ کیا طے کرتے ہو؟ ساری فصل کی بات کرو۔"

سب کسان خاموش کھڑے ہوئے سوچتے رہے۔ ان کے جسموں سے تیز بو اٹھ رہی تھی۔ اجنبی انکو حقارت سے دیکھتا ہوا ذرا پیچھے ہٹ گیا۔ کسان آپس میں باتیں کرنے لگے۔

"ہاں! کریں گے، کیا کہتا ہے، ہارو؟"

"ہاں دھان تو بیچنا ہی ہے۔"

"پر پوری فصل کون لے سکتا ہے۔"

"ہاں پوری فصل کون لے گا۔"

اتنا بڑا سودا انھوں نے اب تک نہیں کیا تھا۔ لہٰذا انہیں اجنبی کی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ سونے سے منڈھے ہوئے دانت والے آدمی نے یہ بات سُن لی۔ وہ اکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ مونچھوں کو مروڑتے ہوئے بولا۔

"ہم خریدیں گے اور کون خریدے گا۔ سودا بعد میں کرو پہلے روپیہ لے لو۔ بولو اب کیا کہتے ہو؟"

پالی کسان ایک دم تیار ہو گئے۔ ایک من دھان کے اٹھارہ روپے پر دا طے ہو گیا۔

سونے سے منڈھے ہوئے دانت والا اجنبی رام دھیرج تھا۔ وہ کلکتہ کے مارواڑی آڑھتیوں کی سنڈیکیٹ

کا ایجنٹ تھا۔ اس نے سب کسانوں کو بیعانہ دے دیا اور کاغذ پر انگوٹھے کے نشان لگوا لئے۔ اب پوری فصل کا دھان کسی اور کے ہاتھ نہیں بک سکتا۔ جو کوئی معاہدہ توڑے گا سنڈیکیٹ اس سے ہرجانہ لے گی۔ رام دھیرج نے کسانوں کو جو کچھ بتا دیا وہی انھوں نے مان لیا۔ انھیں نہیں معلوم کہ معاہدہ کیا ہوتا ہے اور ہرجانہ کیا ہے۔ انھوں نے پیشگی کے روپے لے لئے اور کاغذ پر روشنائی لگا کر انگوٹھا جما دیا۔

بھیری ہوئی ہوائیں چل رہی تھیں۔ دھان کی فصلیں کھڑ کھڑا رہی تھیں۔ شرد پورنیما کی رات تھی۔ چاند سے امرت برس رہا تھا، جس میں کرشن بھگوان اشنان کرتے ہیں۔ ان کی مورتی کو اجلی کرنوں تلے رکھ دیا جاتا۔ آج کی رات گوکل اور بندرابن کے مندروں میں بھجن گائے جا رہے تھے۔ صندل کی لکڑیاں سلگ رہی تھیں۔ عود کے دھوئیں لہرا رہے تھے۔ ہر طرف گہری خوشبو پھیلی تھی۔ اس مقدس شب کو جب دیوتاؤں کی سرزمین میں جشن منایا جاتا ہے، پالی کسان ستی نارائن کی سمادھی پر اکٹھا ہوتے اور سینٹھر کی تیز شراب پی کر رات بھر ناچتے۔

ناچ کی تیاریاں شام ہی سے شروع ہو جاتی تھیں۔ بستی میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔ رات کے ایک پہر تک ۱۵۰ لڑکیاں سجتی رہتیں، جن کی جوانی اچھوتی تھی اور جن کے جسم پانی کی تہ میں رہنے والی مچھلیوں کی طرح سڈول تھے۔ مضبوطی سے گندے ہوئے بالوں میں سفید پھول سجا کر اور کانوں میں نوکیلی کلیاں لٹکا کر، یہ کنواریاں سمادھی کے سامنے پہنچ جاتیں۔ ڈھول ایک بار زور سے گونجتا، رقص شروع ہو جاتا۔ ابلاؤں کے گرد سارے مرد اور عورتیں ایک بڑے دائرے میں گردش کرنے لگتے۔ ساری رات اسی طرح ناچتے گاتے شور مچاتے گزر جاتی۔ چاند کا رنگ پھیکا پڑ جاتا۔ ہواؤں میں خنکی آجاتی۔ پالی کسان اب تھک چکے تھے۔ شراب کا نشہ اتر رہا تھا۔ گیتوں کے بول مدھم پڑ گئے۔ جسموں کی گردش سست پڑ گئی۔ ناچ ختم ہو گیا۔ خاموشی چھا گئی۔ سب لوگ لکڑی اور پھوس کے بنے ہوئے اپنے، اپنے گھروں کی جانب چل دیئے۔ کل صبح سے فصل کی کٹائی شروع ہو جائے گی۔

دھان کی فصلیں تیزی سے کٹ رہی تھیں۔ بستی کے سارے کسان بہت تڑکے ہی اٹھ کر باسی منہ کھیتوں پر پہنچ جاتے۔ دن بھر کٹائی کا کام ہوتا۔ دھان کے سنہری پودے کھیتوں کے اندر بکھرتے جا رہے تھے۔ دن کی آخری روشنی کے ساتھ پالی کسان کام چھوڑ دیتے۔ تھکے ہوئے جسموں کو لئے ہوئے اونچے ٹیلوں پر چڑھ جاتے اور پچھم کی اور خوابناک نظروں سے دیکھنے لگتے۔

جھیلوں پر گئی ہوئی عورتیں دن ڈھلتے ہی مرغیوں اور بطخوں کو شور مچا، مچا کر اکٹھا کرنا شروع کر دیتی تھیں پھر ان کو جالوں میں بھر کر بستی کی طرف چل دیتیں۔ شام کی ڈوبتی ہوئی روشنی میں وہ بھی اونچے ٹیلوں پر [illegible] سامنے گاندھر کا پٹھار ہے۔ جھکی ہوئی نیلگوں چٹانوں کا رنگ گہرا اودا ہو گیا تھا۔ ان کے پیچھے پچھم میں لالی [illegible] جا رہی تھی۔ گھاگھرا ندی کی بپھری ہوئی لہروں میں آگ سی لگ گئی تھی۔ ہر طرف لالی ہی لالی تھی۔ ندی کی [illegible] چکلی چھاتی پر جھومتے ہوئے درختوں کی پھنگیوں پر ماہی گیروں کے پھڑپھڑاتے ہوئے بادبانوں پر ماہی گیر جو پرانے گھاٹ کی طرف جا رہے تھے۔ ان کی بستی کے اونچے مکان دور سے دھبوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ سامنے ریت کے نارنجی ٹیلوں کے پاس آٹھ کشتیاں کھڑی تھیں۔ ان کے پال ابھی کھولے نہیں گئے۔ یہ سنڈیکیٹ کی کشتیاں تھیں جو دھان کی بوریوں کو لاد کر پورب کے دیسوں کو چلی جائیں گی۔

سنڈیکیٹ کی طرف سے گھاگھرا ندی پر ایک اور گھاٹ بن گیا تھا۔ اوپر گھنے پیڑوں تلے لکڑی کی خوبصورت عمارت تھی، جس میں سنڈیکیٹ کا دفتر تھا۔ اس کے قریب ہی ٹین کے سائبانوں والے گودام تھے، جن میں دھان بھرتا جا رہا تھا۔ بان کسانوں کے علاوہ گرد و نواح کی بستیوں کے دوسرے کسان بھی خچروں پر دھان لاد کر لاتے، لکڑی کی خوبصورت عمارت کے پاس بیٹھ کر سوکھی تمباکو کے چرٹ پہ لمبے، لمبے کش لگاتے۔ دن چڑھے تول کرنے والا بابو آتا اور پورب کے دیسوں سے آئی ہوئی مشین پر دھان تلنا شروع ہو جاتا۔ تول والا بابو وزن کا اندازہ کر کے پکارتا جاتا۔

"چھتیس سیر دس چھٹانک۔"

"ایک من پندرہ سیر۔"

"ساڑھے تیس سیر۔"

"ایک من دس سیر تین چھٹانک۔"

وہ اسی طرح آواز لگاتا جا رہا تھا۔ پاس ہی میز پر ایک اور منشی بیٹھا تھا۔ وہ وزن کے ساتھ ہی جھٹ سے قیمت بھی نکال لیتا۔ ہر کسان کو وزن اور قیمت کا پرچہ دیدیا جاتا۔ ساڑھے تین بجے کے بعد تول بند ہو جاتی۔ اس وقت کسان جلدی تلوانے کے لئے چیخ، چیخ کر آپس میں لڑنے لگتے۔ ان کے گلوں کی رگیں چلانے کی وجہ سے پھول

جاتیں۔ وہ ایک دوسرے پر مٹھیاں تان کر جھپٹتے۔ تیز ناخونوں سے ان کے جسموں پر گہری خراشیں پڑ جاتیں۔ خون بہہ بہہ کر وہیں جم جاتا۔ جلدی میں اس پر کوئی غور بھی نہیں کرنے پاتا۔ ایک بار بند ہو جانے کے بعد دوبارہ تول نہیں ہوتی۔ دفتر کا یہی قاعدہ ہے۔ کسان گڑگڑاتے۔ خوشامد کرتے، مگر تول بابو کچھ بھی نہیں مانتا۔ وہ چپ چاپ کاغذوں کو سنبھال کر اندر دفتر میں چلا جاتا۔

جن کسانوں کا دھان تُل جاتا۔ انھیں اپنے دھان کی قیمت مل جاتی۔ وہ اپنی بستیوں کو جانے کی تیاری کرنے لگتے۔ لیکن جن کسانوں کا دھان نہیں تُل سکا، وہ واپس جانے والے کو افسردہ نظروں سے دیکھتے۔ کوئی بجھے ہوئے لہجے میں پوچھتا

"کیوں بھائی کتنے کا سودا ہوا؟"

"اٹھاون روپے گیارہ آنے۔"

"چل بھائی تو بہت اچھا رہا۔ اپنے کو تو رات یہیں کاٹنا ہے۔"

"کل تیری ہی بازار ہو گی۔"

بستیوں کو جانے والے کسان، باتیں کرتے جاتے۔ خچروں پر سامان لادتے جاتے۔ اندھیرا بڑھ چکا تھا۔ اب جلد ہی بستیوں کو پہنچ جانا چاہئے۔ پاس روپیہ موجود ہے اور راستہ خطرناک ہے۔ کہیں اندھیرے میں لٹیروں نے گھیر لیا گیا تو جان بھی نہ بچے گی۔

جن کسانوں کو رات یہیں بسر کرنا تھی، انھوں نے خچروں کو درختوں کے ساتھ مضبوطی سے باندھ دیا اور دھان کی بوریوں پر بیٹھ کر سوچ رہے تھے کہ ابھی کھانا تیار کرنا پڑے گا اور رات بھر الاؤ کے پاس بیٹھ کر سردی سے سکڑنا پڑے گا۔ رات کی گہری تاریکی پھیلتے ہی گاندھر کے پٹھار کی جھکی ہوئی چٹانیں سرد پڑ جاتی ہیں۔ سارے علاقے میں خنکی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ تیز ہوائیں بدن کو چھیدنے لگتی ہیں۔

کشتیوں میں دھان کی بوریاں لد رہی تھیں۔ گودام کے اندر سے پلّے دار دھان کی بوریاں لاد، لاد کر کشتیوں تک لے جاتے۔ ایک کشتی میں دو سو بوریاں تک جا سکتی تھیں۔ تین کشتیاں کنارے چھوڑ چکی تھیں۔ آگے والی دو کشتیوں کے بادبان تیز ہوا میں پھڑپھڑا رہے تھے۔ کشتیاں تیزی سے بڑھتی جا رہی تھیں۔ اگر ہوا ایسی

ہی موافق ملی تو دونوں کشتیاں تیرھویں روز کملا گھاٹ پہنچ جائیں گی۔ وہاں سے دھان کی بوریاں لاریوں میں لد کر کلکتہ چلی جائیں گی۔

راستے میں کشتیوں کو کئی جگہ رکنا پڑتا۔ اندھیرا پھیلتے ہی وہ کسی گھاٹ کے کنارے ٹھہر جاتیں۔ بادبانوں کو لپیٹ دیا جاتا اور اونچے بانس پر دھندلی سی لالٹین لٹکا دی جاتی، جس کی دھیمی روشنی کہرے کے دھندلکے میں دور سے دکھائی پڑتی۔ کشتیوں پر سنڈیکیٹ کے دو پہریدار چوکس بیٹھے رہتے۔ ان کے پاس بندوقیں تھیں جن میں کارتوس بھرے ہوئے تھے۔ کملا گھاٹ تک پہریدار کشتیوں پر موجود رہیں گے۔ راستے میں کشتیوں کے لٹ جانے کا زبردست خطرہ رہتا۔ لوٹ مار کرنے والے چھوٹی چھوٹی ڈونگیوں پر بیٹھ کر آتے۔ قریب پہنچ کر تیز بھالے تانے ہوئے کشتی پر کودنا شروع کر دیتے۔ ان کی ڈونگیاں لہروں پر بڑی تیزی دوڑتیں اور کہرے کے گہرے دھندلکوں میں غائب ہو جاتیں۔

جو کشتی پیچھے رہ جاتی، اس کے پال بوڑھے رخساروں کی طرح لٹکے ہوتے۔ کشتی ابھی ہوا کے رخ پر نہیں آئی۔ لہٰذا کچھ ملاح پیچھے بندھی ہوئی ڈونگی میں اترتے۔ ان کے ہاتھوں میں مضبوط رسیاں دبی ہوتیں۔ وہ ڈونگی کو کھیتے ہوئے کنارے پر لے جاتے۔ رسیاں بادبانوں کے مستولوں سے بندھی ہوتیں۔ ملاح رسیوں کے سہارے کشتی کو آگے کی طرف کھینچتے۔ اس طرح زور دے کر چلنے سے ان کا بدن خم کھا کر دوہرا ہو جاتا۔ گیلی ریت پر ان کے قدموں کے گہرے نشان بکھرتے جاتے۔

یہ ملاح پورب سے آئے تھے۔ ان کے جسم سیاہ تھے اور کڑی محنت سے بازوؤں کی مچھلیاں خم دار ہو گئی تھیں۔ رسیوں کو پوری قوت سے کھینچتے ہوئے وہ اونچی آواز سے چلاتے۔ یہ ملی جلی انسانی آوازیں ایک تیز لے میں ابھرتیں۔ ملاح اس وقت تک اسی طرح شور مچاتے رہیں گے اور جسم پر زور دے کر آگے بڑھتے رہیں گے جب تک بادبانوں میں پوری طرح ہوا نہ بھر جائے گی۔ پھر کشتی بپھری ہوئی لہروں پر تیزی سے بڑھنے لگے گی۔ بادبان راج ہنس کے سفید پروں کی طرح پھڑپھڑانے لگیں گے۔

۲

باقی کسانوں کے کھلیانوں میں دھان پڑا ہے۔ ابھی سنڈیکیٹ نے تھوڑا تھوڑا دھان خریدا ہے۔

کسانوں کو دھان کے جلدی بکنے کی فکر نہیں ہے۔ جو دھان بک چکا ہے، اس کے روپئے ان کے پاس موجود ہیں، ہر کسان کے چہرے پر ہلکی، ہلکی شگفتگی جھلکنے لگی ہے۔ کل آدا پور کا بازار ہے۔ سویرا ہوتے ہی عورتوں نے بالوں کو گوندھ کر تیل پیڑ لیا ہے۔ گلٹ کے زیور پہن لئے ہیں۔ مرد اونچی آواز میں باتیں کر رہے ہیں۔ بچے چیخ، چیخ کر مچل رہے ہیں۔ بازار جانے کے لئے ہر ایک آمادہ ہے۔

لیکن دن کی روشنی ابھی پورے طور پر پھیلنے بھی نہیں پائی کہ بستی میں ایک سرکاری ہرکارہ آگیا۔ اس کے سر پر پگڑی تھی۔ وہ خاکی کوٹ پہنے ہوئے تھا اور گھوڑے پر سوار تھا۔ اس کے گلے میں ڈھول لٹکا ہوا تھا۔ اس نے ڈھول کو زور سے بجایا۔ پالی کسان گھبرائے ہوئے گھروں سے نکل کر اس کے گرد اکٹھا ہو گئے۔ ان کی آنکھوں سے گھبراہٹ جھلک رہی تھی۔ وہ جانوروں کی طرح گردن اٹھا کر اُسے اچنبھے سے دیکھ رہے تھے۔ عورتیں جھکی ہوئی چھتوں کے نیچے سے جھانک رہی تھیں۔ بچوں نے شور مچانا بند کر دیا۔ لکڑی کے بے ڈھنگے مکانوں والی بستی پر خاموشی چھا گئی۔ اس گہرے سکوت میں گھوڑے پر بیٹھا ہوا ہرکارہ اونچی آواز میں اعلان کرنے لگا۔

"دیش میں بہت بڑا کال آنے والا ہے۔ اس کال میں سب کچھ ناش ہو جائے گا۔ سرکار نے اسے روکنے کے لئے یہ فیصلہ کیا ہے کہ جو لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ ان کو اپنی زمین کے لگان کے حساب سے سرکار کو گیہوں دینا پڑے گا چاہے کوئی جوار بوتا ہو یا باجرہ۔ چاہے دھان بوتا ہو یا مکئی گیہوں سب کو دینا پڑے گا۔ سرکار اس گیہوں کے دام من بھر کے لئے تیرہ روپے تک دے گی۔ جو کسان اس حکم کو نہیں مانیں گے اور سرکاری آدمیوں کو ستائیں گے ان کا گھر بار ضبط کر لیا جائے گا اور کڑی سزا بھگتنا پڑے گی۔"

ہرکارے نے تیکھی نظروں سے سب کسانوں کو دیکھا۔ گلے میں لٹکے ہوئے ڈھول کو ایک بار پھر زور زور سے پیٹا۔ گھوڑے کو ایڑ لگائی اور بستی سے چلا گیا۔ پتھریلے راستوں پر اس کا گھوڑا دیر تک ٹاپیں دیر تک گونجتی رہیں۔ کسان ذرا دیر تک حیرت زدہ سے کھڑے رہے۔ پھر انھوں نے اونچی آواز میں باتیں کرنا شروع کر دیں۔

"اب گیہوں کہاں سے لایا جائے؟"

"ہاں ہم گیہوں تو بوتے نہیں!"

"ہم گیہوں بوتے نہیں پھر ہم گیہوں کیوں دیں؟"

"پر سرکاری حکم جو ہے۔ سرکار کی بات تو ماننا ہی پڑے گی۔"

"ہاں سرکاری حکم تو ماننا ہی پڑے گا۔ نہیں تو کڑی سزا بھگتنا پڑے گی۔"

کڑی سزا کے تصور سے کسانوں کی تیز آوازیں دھیمی پڑ گئیں۔ اب آداپور کے بازار میں کچھ اور نہیں خریدا جا سکتا۔ اب گلٹ کا زیور پہنے ہوئے کسان عورتیں بازار میں نظر نہ آئیں گی اور گھر کے آنگن میں بچے چیخ چیخ کر روتے رہیں گے۔

آداپور اس علاقے میں غلہ کی سب سے بڑی منڈی تھی۔ ہفتہ میں یہاں دو بار بازار لگتا تھا۔ دور دور کی بستیوں کے کسان ہر منگل اور سینچر کو یہاں اکٹھے ہوتے۔ آداپور کے بازار میں ہر چیز کا بیوپار ہوتا تھا۔ نیم پختہ سڑک پر دھول کے بادل منڈلاتے۔ درختوں کے نیچے بندھے ہوئے خچر زور زور سے ہنہناتے اور بازار میں گونجتی ہوئی آوازوں کا شور نہر کے پل پر سے صاف سنائی دیتا۔ گیہوں کے بورے کھلتے۔ دھوپ میں ان کا رنگ سنہری معلوم ہوتا۔ بیس روپے پاس ہوں تو من بھر گیہوں مل سکتا تھا۔

"گیہوں خریدنا ہو تو خریدو، نہیں تو راستہ دیکھو۔ جو بھاؤ بتا دیا، اس میں کمی نہیں ہو سکتی۔" گیہوں کے ڈھیروں کے پاس بیٹھا ہوا ساہو ایک ہی بار دام بتاتا۔ دوسری بار پوچھنے پر تیزی سے کہتا۔

"گیہوں لینا ہو تو لو، بات مت کرو۔"

"جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔ بھاؤ کی بات بار بار مت پوچھو۔"

[illegible] کسان گیہوں کے ڈھیروں کے پاس منڈلاتے۔ بیس روپے میں چالیس سیر گیہوں وہ نہیں خرید سکتے اور [illegible] ہوئے جو بھاؤ بتا [illegible]۔ بازار میں دیر تک ٹہلنے کے بعد کسان کسی اونچی جگہ پر جا کر بیٹھ جاتے۔ ہر چہرے پر دھند چھائی تھی۔ چپ چاپ سوچتے، سوچتے وہ باتیں کرنے لگتے۔ کچھ کسان گیہوں خریدنے کا ارادہ کر رہے تھے، لیکن جنہوں نے گیہوں کے خریدنے کی بات کی، ان پر کٹے تان کر دوسرے کسان چلانے لگے۔

"ہم بیس روپے کا چالیس سیر گیہوں کیوں لیں؟"

"بیس روپے کا گیہوں لے کر تیرہ روپے میں کیسے دیا جا سکتا ہے؟"

"کیا تم چاہتے ہو سات روپے گھاٹا دیا جائے؟"

"ہاں! سات روپے گھاٹا کون دے سکتا ہے؟"

پالی کسانوں کی آوازیں اونچی ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ گلا پھاڑ، پھاڑ کر چیخ رہے تھے۔ جن لوگوں نے گیہوں خریدنے کی بات کی تھی، خوف زدہ اور سہمے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

دن ڈھلے تک پالی کسان بازار میں گھومتے رہے۔ وہ کسی سے کچھ کہتے سنتے نہیں۔ اب دکانیں اٹھنے لگی تھیں۔ لوگ خچروں پر سوار ہو کر اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ بازار میں سناٹا پڑتا جا رہا تھا۔ پالی کسان کچھ بھی طے نہ کر سکے اور اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہی بستی کی طرف چل دیئے۔ دن بھر کی تھکن سے ان کے ٹھوس جسم نڈھال پڑ گئے تھے۔ ان کے چہروں پر جھنجھلاہٹ تھی۔ اداسی تھی۔ وہ اب گیہوں نہیں خریدیں گے۔ کوئی کسان گیہوں نہیں خریدے گا۔ بیس روپے کا گیہوں خرید کر تیرہ روپے کے بھاؤ کیوں دیا جائے۔

رات ابھی زیادہ نہیں گزری ہے، پالی کسانوں کی بستیوں پر ویرانی چھائی تھی۔ حالانکہ ابھی وہ سوئے نہیں تھے۔ کسی کو نیند ہی نہیں آ رہی تھی۔ کوئی کسی سے بات نہیں کر رہا تھا۔ کسی گہری سوچ میں سب ہی ڈوبے ہوئے تھے۔ ناگاہ ہارو نے گردھر کے دروازے پر ہانک لگائی۔ "گردھر، او گردھر۔ کیا سو گیا؟" ہارو کی آواز گہرے سناٹے میں زور سے گونجی۔ کچھ کسان گھروں سے نکل کر گردھر کے مکان کے سامنے اکٹھے ہو گئے۔ پوچھنے پر ہارو جلدی، جلدی بتانے لگا۔

"ابھی، ابھی آدا پور کا گرد اور کہہ رہا تھا، سادھن نے پانچ من گیہوں خریدا ہے۔ گیہوں اس نے آدا پور میں کہیں رکھ دیا ہے۔ کیا اسے ایسی بات کرنی چاہئے۔ اس نے ایسا کیوں کیا؟"

ہارو کی بات سن کر کسان زور، زور سے باتیں کرنے لگے۔ باتوں کی آواز سن کر بستی کے سارے کسان گھروں سے نکل، نکل کر وہاں اکٹھا ہو گئے۔ سادھن بھی وہاں آ گیا۔ اسے دیکھتے ہی سب نے چیخ، چیخ کر پوچھنا شروع کر دیا۔

"تم نے گیہوں کیوں خریدا؟"

"ہاں تم نے ایسی بات کیوں کی؟"

"مانو کوئی بات ہو تو تم اکیلے ہی بھگتو گے؟"

"سب کی بات ہے، سب ہی پر پڑے گی، تم ایسا کیوں کرتے ہو؟"

سادھن خاموش کھڑا رہا۔ جیسا سب نے کہا، اس نے گردن ہلا کر مان لیا۔ مکّے تان کر چلانے والے کسان چُپ ہو گئے۔

لیکن سویرے تاروں کی چھاؤں میں سادھن گھر سے چپ چاپ نکل کر کچہری کی طرف چل دیا۔ اس کے پاس سو بیگھہ سے اُوپر قابل کاشت زمین تھی۔ اس کے کھیتوں میں کرائے کے آدمی کام کرتے تھے۔ اس کے باڑے میں بہت سے مویشی تھے۔ اس کا لڑکا قصبے کے اسکول روز صبح خچر پر سوار ہو کر جاتا تھا۔ سادھن چاہتا تھا کہ اپنے لڑکے کو پٹواری بنا دے۔ اس لئے تحصیلدار کو وہ ناراض نہیں کر سکتا۔ جب وہ سرکاری گیہوں آسانی سے خرید کر دے سکتا تھا تو تحصیلدار کی مخالفت کیوں مول لے۔ اپنا گھر بار کیوں ضبط کرائے۔ کیوں کڑی سزا بھگتے۔ اس نے تحصیلدار کے پاس جا کر رات کی ساری باتیں بتا دیں۔ جو لوگ مکّے تان کر غصّے سے اس پر چلّا رہے تھے، ان سب کے نام بتا دیئے۔

دسویں میں ابھی پوری تیزی بھی نہیں آئی تھی کہ پالی کسانوں کی بستی میں ٹیڑھی ناک والا حوالدار بہت سے کانسٹبلوں کی ہیبت کے ساتھ پہنچ گیا اور آٹھ پالی کسانوں کو گرفتار کر کے تھانے میں لے گیا۔ تھانیدار نے اپنے کھپریل کی چھت والے دفتر سے ان کو جھانک کر دیکھا اور دیکھتے ہی اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ چہرے پر خشونت چھا گئی۔ وہ باہر آ کر کھڑا ہو گیا۔ سب کسانوں کی گردنیں تھکے ہوئے خچروں کی طرح جھکی ہوئی تھیں۔ وہ بہت کچھ سوچنے کے باوجود کچھ نہیں سوچ رہے تھے۔ ہارو نے سہمی ہوئی نظروں سے گردن اٹھا کر تھانیدار کو دیکھا۔ وہ ایک دم بپھر گیا۔

"سالا آنکھ ملا کر دیکھتا ہے۔"

اس نے بڑھ کر ہارو کے منہ پر تڑاخ سے تھپڑ مارا۔ زور سے کمر پر لات ماردی۔ اس کے پیر میں بھاری، بھاری جوتے تھے، جن میں لوہے کے گوکھرو جڑے تھے۔ چوٹ کھا کر ہارو دوہرا ہو گیا۔ گھٹنوں کے بل زمین پر جھک

گیا. تھانیدار نے گھوم کر پیچھے دیکھا. پانچ چاق و چوبند کانسٹیبل مستعدی سے کھڑے تھے. ان کے کندھے چوڑے تھے. بازو تنے ہوئے تھے. تھانیدار نے چلا کر ان سے کہا.

"لے جاؤ ان بدمعاشوں کو"

اور اس "لے جاؤ" کا مطلب تھا کہ پانچوں کانسٹیبل پالی کسانوں کی مرمت شروع کر دیں گے. ان کے وزنی جوتوں کی ٹھوکروں سے کسان پتھریلے فرش پر گر پڑیں گے اور منہ سے بے ڈھنگی آوازیں نکالیں گے. پھٹی ہوئی گندی صدریوں پر خون کے گہرے سرخی مائل دھبے پڑ جائیں گے. پھر ان کو حوالات کے اندر ڈھکیل کر لوہے کا مضبوط دروازہ بند کر دیا جائے گا اور اس میں تالا ڈال دیا جائے گا.

بستی پر تھکی ہوئی خاموشی چھائی تھی. مرغیاں اور بطخیں باڑھ کے اندر پروں کو پھڑپھڑا رہی تھیں. مضمحل خاموشی میں کسی مرغ کی تیز آواز ابھری. سناٹا لمحہ بھر کے لئے درہم برہم ہوا. پھر وہی سکوت وہی ویرانی! آٹھوں کسان آج ہی تھانہ سے واپس آئے تھے. ان کے جسم مٹیالے پڑ گئے تھے. پھٹی ہوئی صدریوں پر خون کے گہرے دھبے سیاہ پڑ گئے تھے. وہ کسی سے کچھ کہتے سنتے نہیں. چپ چاپ لکڑی کی بھوری دیواروں کو دیکھ رہے تھے. کسی کی طرف انکی آنکھ نہیں اٹھتی. بستی کے کسانوں نے ان کو دیکھا. ان کے چہروں کے نقوش سخت ہوتے جا رہے تھے. وہ بات، بات، پر شور مچاتے رہے، پھر جھنجھلا کر آپس میں جھگڑنے لگے. مگر اب گیہوں خرید کر سرکار کو دینا ہی پڑے گا، یہ بات سب ہی نے طے کر لی.

بازار کا دن تھا. پالی کسان گھبرائے ہوئے گیہوں کے ڈھیروں کے سامنے کھڑے تھے. اب گیہوں کا بھاؤ اور چڑھ گیا. بازار میں گیہوں کم تھا. ہولی سے پہلے نئی فصل کا گیہوں نہیں آئے گا. لہٰذا گیہوں کا بھاؤ برابر بڑھتا ہی جائے گا. بیس روپے کے بجائے اب من بھر گیہوں کے لئے ستائیس روپے دینا ہوں گے. بہت سے کسان اسی بھاؤ سے گیہوں خرید رہے تھے. کچھ کسان ابھی تک سوچ رہے تھے کہ اتنا مہنگا گیہوں کیسے خریدا جا سکتا ہے. سرکار ہم سے گیہوں کیوں مانگتی ہے. بازار میں اتنا مہنگا گیہوں بیچنے والوں سے کیوں نہیں خرید لیا جاتا. دن اسی طرح گزرتا جا رہا تھا. بازار کا ہجوم کم ہوتا جا رہا تھا. کوئی کسان ٹھہر ٹھہر کر چلتا ہوا گیہوں کے ڈھیر کے سامنے جاتا اور ہاتھوں میں دبے ہوئے نوٹوں کو ساہو کے سامنے پھینک کر گیہوں

بورے میں ڈالوا کر چلا جاتا۔ کسانوں نے بازار میں رام دھیرج کو بھی دیکھا جو گیہوں کے بیوپاریوں سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی، شگفتگی تھی۔ کسان تھکے تھکے نظر آرہے تھے

۴

سنڈیکیٹ کے دفتر کے سامنے پالی کسان بیٹھے سوکھی تمباکو کے چرٹ پر کش لگا رہے تھے۔ درختوں سے بندھے ہوئے خچر ہنہنا رہے تھے۔ دھوپ ٹیلوں پر پھیلتی جا رہی تھی۔ دن آہستہ آہستہ گزرتا جا رہا تھا۔ مگر دوپہر تک بھی تول بابو نہیں آیا۔ کسی کا دھان ابھی تک نہیں تولا گیا۔ دھان کے بورے دفتر کے سامنے پتھریلی زمین پر بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ کسانوں نے پریشان ہو کر لکڑی کے دروازے کے سامنے چلانا شروع کر دیا۔

"یہ اب تک تول نہیں لگی؟"

"ہاں یہ دیری کیوں ہو رہی ہے؟"

"تول بابو کو بلاؤ، تول بابو کو بلاؤ۔"

کسانوں کے اس طرح شور مچانے پر دفتر کا دروازہ کھلا۔ مگر یہ تول بابو نہیں تھا۔ گودام کا بوڑھا چوکیدار تھا۔ اس نے باہر آکر سب کو دیکھا اور کہنے لگا۔

"تول آج نہیں لگے گی۔"

کسان چیخ اٹھے۔ "یہ تول کیوں نہیں ہو گی؟"

چوکیدار نے ان کو بتایا "بات یہ ہے کہ تول بابو کی طبیعت خراب ہے۔"

لیکن تول بابو اندر کمرے میں بیٹھا ہوا تاش کھیل رہا تھا۔ کسان گھروں کو واپس جانے کے لئے خچروں پر دھان کی بوریاں لاد رہے تھے۔

پالی کسان روز اسی طرح سنڈیکیٹ کے دفتر کے سامنے اکٹھا ہوتے۔ مگر تول شروع نہیں ہوتی۔ تول بابو کی طبیعت ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئی تھی۔ کسان جھنجھلا کر چیختے چلاتے ہوئے بستی کو لوٹ جاتے۔ تول بابو دفتر کے پچھلے کمرے میں بیٹھا ہوا تاش کھیلتا رہتا۔ ہنس، ہنس کر باتیں کرتا۔

انھی دنوں ضلع کا کلکٹر بھی آیا۔ علاقہ کا دورہ کرتا ہوا وہ ایک روز پالی کسانوں کی بستی سے گزرا۔ اس نے

لکڑی کے بے ڈھنگے مکانوں کو دیکھا۔ گندے پالی کسانوں کو دیکھا اور نشیب کی جھیلوں کی طرف شکار کے لئے چلا گیا۔ اس کے ہمراہ نیا تحصیلدار تھا۔ ہکلا کر بولنے والے کنور جی تھے، جن کو بوڑھے چھترو نشی نے زمینداری کی دیکھ بھال سونپ دی تھی۔ اس روز تمام دن جھیلوں پر بندوقوں کی آوازیں گونجتی رہیں۔ آبی پرندے اپنے پروں کو پھٹپھٹاتے ہوئے چیختے رہے۔ میدان میں دانے کی تلاش میں گھومتی ہوئی مرغیاں اور بطخیں شور مچاتی ہوئی دور ڈھلوانوں پر نکل گئیں۔ کسان عورتیں حلق سے تیز آوازیں نکال کر ٹیلوں پر بے تحاشا دوڑتی پھر رہی تھیں۔ کنور جی ان کو دیکھ کر ہکلانے لگتے۔ کلکٹر کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر جاتی۔ دن اسی طرح گزرتا جا رہا تھا۔ سائے طویل ہو گئے تھے۔

رام دھیرج نے کلکٹر کے اعزاز میں شام کو ٹی پارٹی کا اہتمام کیا تھا۔ سنڈیکیٹ کی خوبصورت عمارت کے برآمدے میں دفتر کی لمبی میز کے گرد کرسیاں رکھی تھیں۔ کلکٹر اور اس کے ہمراہیوں کے علاوہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیئرمین اور آواپور کے کچھ معزز بیوپاری بھی موجود تھے۔ کچہری کی دیوار والے برآمدے میں ملی جلی آوازوں کا ہلکا، ہلکا شور ابھر رہا تھا۔ کلکٹر نے دوران گفتگو ربیع کی فصل کے پروکیورمنٹ کی بات چھیڑ دی۔ سب کے چہروں پر اچانک سنجیدگی چھا گئی۔ ملی جلی آوازوں کے شور میں ٹھہراؤ پیدا ہو گیا۔ لمبی میز کے گرد بیٹھے ہوئے لوگوں کو باتیں کرتے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سنڈیکیٹ کے ڈائرکٹروں کی کوئی اہم میٹنگ ہو رہی ہو۔

کلکٹر اپنا دورہ ختم کر کے واپس چلا گیا۔ اس نے گیہوں کی وصولی کے لئے تحصیلدار کو حکم دیا کہ پروکیورمنٹ اسکیم کو ہر قیمت پر کامیاب بنایا جائے۔

کلکٹر کے حکم کے چند ہی روز بعد پالی کسانوں کی بستی میں علاقہ کے پٹواری کے ساتھ ایک سرکاری اہل کار بھی آیا۔ اس کے پاس لمبا رجسٹر تھا۔ وہ ہر مکان پر جاتا۔ لگان پوچھتا۔ اور رجسٹر میں دیکھ کر بتاتا کہ کتنا گیہوں دینا پڑے گا۔ اسی طرح دونوں شام تک بستی میں دروازے، دروازے گھومتے رہے۔ کسان خوفزدہ نظروں سے انھیں دیکھتے تھے۔ آپس میں سرگوشیاں کرتے تھے۔ جب دونوں بستی سے چلے گئے تو پالی کسان انھیں دور تک دیکھتے رہے۔

سردی دفعتاً بڑھ گئی تھی۔ آسمان پر بھورے، بھورے بادل بکھرے ہوئے تھے۔ راہل کے دروازے کے سامنے شام ہی سے الاؤ دھک رہا تھا۔ ابھی رات کا اندھیرا پوری طرح نہیں پھیلا تھا۔ پالی کسان الاؤ کے گرد اکٹھا ہونے

لگے۔ سب خاموش بیٹھے تھے۔ لہراتے ہوئے شعلوں کی جھلملاہٹ میں ان کے چہرے سوچتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ ہوا کے تیز جھکڑ چلتے تو پتھریلے راستوں پر خشک پتے کھڑکھڑاتے۔ بستی کا سناٹا آسیبی معلوم ہو رہا تھا۔ اچانک پگڈنڈی پر بھاری، بھاری قدموں کی آہٹ ابھرنے لگی۔ کسان حیرت زدہ نظروں سے اس طرف دیکھنے لگے۔

رام دھیرج اندھیرے سے نکل کر الاؤ کی روشنی میں آگیا۔ اس نے کسی سے کچھ نہ کہا۔ وہ چپ چاپ الاؤ کے پاس کھڑے ہو کر سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے ہاتھوں کو تیز آنچ کے اوپر پھیلا کر گرم کرنے لگا۔ کسان اسے حیرت سے کچھ دیر دیکھتے رہے، پھر دریافت کیا،

"یہ تول کب لگے گی ؟"

"ہاں یہ تول کیوں روک دی گئی ؟"

رام دھیرج نے اپنے ہاتھوں کو سمیٹ کر اوور کوٹ کی جیبوں میں ٹھونس لیا۔ پھر اس نے سب کسانوں کو بھرپور نظروں سے دیکھا۔ کہنے لگا،

"تول اب شروع نہیں ہوگی۔"

کسان ایک دم چلا کر بولے، "کیا کہتے ہو؟"

رام دھیرج مسکرانے لگا۔ اس کا سونے سے منڈھا ہوا دانت الاؤ کی تیز آنچ میں چمکنے لگا۔ "بات یہ ہے کہ کلکتہ کے بڑے دفتر سے حکم آیا ہے کہ دھان نہ خریدا جائے۔ ہم کو دوسری جگہ بارہ روپے کا چالیس سیر دھان مل رہا ہے۔ سنڈیکیٹ اتنا نقصان نہیں اٹھا سکتی۔"

"تو پھر تول نہ لگے گی ؟"

رام دھیرج الاؤ پر جھکا ہوا کھڑا تھا۔ کسانوں کی بات سن کر ایک دم تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی گھنی مونچھوں کو انگلیوں سے بٹتے ہوئے کہا،

"تول شروع ہو سکتی ہے۔ ہاں اگر تم لوگ بھی اسی بھاؤ پر دو۔ بارہ روپے میں چالیس سیر۔ بولو کیا کہتے ہو ؟"

سب کسان ایک دم بگڑ گئے۔ "تم کیا بات کرتے ہو؟"

"ہاں اتنا سستا دھان کیسے بک سکتا ہے؟"

کسان اونچی آواز میں چلا چلا کر باتیں کرنے لگے۔ رام دھیرج کا خاموش چہرہ الاؤ کی تیز روشنی میں جھلک رہا تھا۔ اس کا بے ہنگم سایہ سامنے دیوار پر جھوم رہا تھا۔ وہ دیر تک اسی طرح کھڑا رہا، پھر اس نے گردن گھما کر کسانوں کی طرف دیکھا۔

"اچھا ہم تمھارے لئے من بھر کے پندرہ روپے کر دیں گے، خوب سوچ لو۔ جی میں آئے تو کل سویرے دھان لے آنا۔ تول شروع ہو جائے گی۔"

وہ لمبے، لمبے ڈگ بھرتا ہوا گہرے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ اس کے بوجھل جوتوں کی آواز پتھریلی پگڈنڈی پر دیر تک ابھرتی رہی۔ الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے کسان چیخ چیخ کر باتیں کرنے لگے۔ وہ بہت جھنجھلائے ہوئے تھے۔ ان کے چہروں پر درشتگی چھا گئی تھی۔ انھوں نے طے کیا کہ کل سویرے دھان لے کر سنڈیکیٹ کے دفتر نہیں جائیں گے۔ وہ اچھے داموں میں اپنا دھان بازار میں بیچ سکتے تھے۔ پھر وہ سنڈیکیٹ کو سستے بھاؤ سے دھان کیوں دیں؟

لیکن بازار میں دھان کے ڈھیروں کے پاس کوئی نہیں ٹھہرتا۔ بن بیوپاریوں نے دھان اٹھا کر دیکھا، وہ بارہ روپے سے بھی کم بھاؤ میں چالیس سیر دھان خریدنا چاہتے تھے۔ شام تک دھان کے بورے بازار میں پڑے رہے۔ چند پالی کسانوں نے تھوڑا سا دھان بیچا تھا۔ جس سے بورے کا ایک کونہ بھی خالی نہیں ہوا۔

سنڈیکیٹ کی لکڑی کی عمارت کے سامنے پالی کسان آج پھر اکٹھا ہوئے تھے۔ دن چڑھ چکا تھا۔ مگر تول بابو نہیں آیا۔ بہت دیر بعد رام دھیرج ان کے پاس آیا۔ اس کے ماتھے پر بل پڑے تھے۔ آنکھوں میں تیز چمک تھی۔ کسان اسے دیکھتے ہی اونچی آواز میں بولے۔

"تم نے کہا تھا۔ اب ہم دھان لے آئے ہیں۔"

"چلو تمھارا ہی بھاؤ ٹھیک ہے۔"

رام دھیرج تیزی سے بولا۔ "جب کہا تھا، تب تم کب آئے۔ جاؤ، ادالپور کے بازار میں دھان بیچو۔ یہاں تول نہیں لگے گی۔"

کسان گھبرا کر کہنے لگے۔ "تم کیا چاہتے ہو؟"

"ہاں بتاؤ ہم کیا کریں۔ تم نے تو ساری فصل کی بات کی تھی۔"

رام دھیرج کے چہرے کی سختی کم ہو گئی۔ وہ آہستہ سے بولا۔ "اچھا اب ہم دس روپے کے بھاؤ دھان لے سکتے ہیں۔ دینا ہو تو دھان تول دو اور اپنے دام لے جاؤ۔"

مگر کسانوں نے اس کی بات نہ مانی۔ وہ اس قدر سستے داموں میں دھان نہیں بیچ سکتے۔ جب گیہوں تیس روپے کا چالیس سیر ملتا ہے تو دھان دس روپے کے بھاؤ کیسے بیچا جا سکتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح سوچتے ہوئے کسان اپنے گھر کو لوٹنے لگے۔ رام دھیرج دفتر میں چلا گیا۔ تول بابو اس کے پاس آ کر کہنے لگا۔

"کسان واپس جا رہے ہیں۔ کیا تول نہ لگے گی؟ یہ تو بہت برا ہو گا۔ ہیڈ آفس سے برابر یہی کہا جا رہا ہے کہ خریداری نہ روکو۔ دھان کی سخت ضرورت ہے۔ یہاں گودام خالی ہو چکے ہیں۔"

رام دھیرج نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھا اور پھر سامنے رکھی ہوئی میز پر گھونسا مار کر بولا۔ "میں جو کچھ کر رہا ہوں، وہ ٹھیک ہے۔ ہیڈ آفس والے یہاں کی بات کیا جانیں۔ جو کچھ کر رہا ہوں وہ کنڈیکٹ ہی کے فائدے کیلئے تو کر رہا ہوں۔ اپنے لئے نہیں۔"

تول بابو نے پھر کچھ نہ کہا۔ وہ چپ چاپ اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

پالی کسانوں نے سرکاری گیہوں دینا شروع کر دیا تھا۔ وہ گیہوں کی بوریاں خچروں پر لاد کر کچہری کے احاطہ میں جاتے۔ چھریرے جسم والا انسپکٹر ہر ڈھیر کے سامنے آ کر ٹھہر جاتا۔ اندر ہاتھ ڈال کر گیہوں نکالتا۔ پھر ان کو دھیرے، دھیرے چھوڑنے لگتا۔ ہوا چلتی۔ گیہوں میں سے دھول اڑتی۔ انسپکٹر پاس کھڑے ہوئے کسان کو گھور کر دیکھتا۔

"مٹی ملا کر لائے ہو؟ جانتے ہو اس کی قیمت کم لگے گی۔ یہ اے کلاس نہیں ہے۔"

کسان گھبرا کر کہتا۔ "یہ مٹی ہم نے نہیں ملائی۔ یہ تو باپ دادے سے ایسا ہی ملا تھا۔"

پاس کھڑے ہوئے دوسرے کسان بھی کہتے "ہاں گیہوں بازار سے ایسا ہی ملا تھا۔"

"بازار سے جیسا ملا ہے، وہ لے آئے ہیں، پھر اس کا دام کم کیوں لگے گا۔"

دبلا پتلا انسپکٹر ان کی باتوں سے غضب ناک ہو گیا۔ چیخ کر بولا "بکو مت۔ جیسا گیہوں ہو گا، ویسا ہی دام ملے گا۔" وہ آگے بڑھ کر دوسرے ڈھیروں پر پہنچ گیا۔ ایک بار جو وہ طے کر لیتا، اس سے ذرا بھی نہیں ہٹتا۔ کسان گڑگڑاتے، اونچی آواز میں باتیں کر کے شور مچاتے۔ لیکن وہ کچھ نہیں سنتا۔ البتہ وہ ان کسانوں کی بات پر توجہ دیتا جو اسے نذرانہ دے سکتے تھے۔ ایک من پر انسپکٹر ڈیڑھ روپیہ تک رشوت لیتا اور مٹی ملا ہوا گیہوں "اے" کلاس میں درج کر دیا جاتا۔

پالی کسان سرکاری دفتر میں گیہوں تلوانے اور تھکے ہوئے بستی کو لوٹ آتے۔

سردی تیزی سے بڑھتی جا رہی تھی۔ گاندھر پٹھار کے اتر میں بھورے دھبوں کی طرح جو کوہستانی سلسلہ دکھائی پڑتا ہے، ادھر یخ بستہ ہوائیں چلتی تھیں۔ سردی کی اس لہر میں دھوپ کی گرمی ماند پڑ گئی تھی۔ پالی کسانوں نے بے ڈھنگی اونی ٹوپیوں سے گردن تک جسم کے اوپری حصے کو چھپا رکھا تھا۔ ان کے برہنہ پیروں کی کھال پھٹتی جا رہی تھی۔ جن کسانوں نے ابھی تک سرکاری گیہوں نہیں دیا، ان کے مکانوں پر سرکاری کارندے آتے اور پکڑ کر لے جاتے۔ تحصیلدار کے سامنے ان کی پیشی ہوتی۔ وہ ان پر ناراض ہوتا۔ اس کے حکم پر کسانوں کو لوہے کی مضبوط حوالات میں بند کر دیا جاتا، سزا بھگت کر جب وہ گھروں کو لوٹتے تو ان کے چہرے بیماروں کی طرح زرد دکھائی پڑتے۔ پھٹی ہوئی بوداز صدریوں پر خون کے گہرے دھبے جمے ہوتے۔ ان کے چہروں پر رد کھاپن ہوتا۔ آنکھوں میں شکاری درندوں کی سی تیز چمک جھلکتی۔

سنڈیکیٹ والوں نے ابھی تک دھان کی خریداری شروع نہیں کی اور بازار میں بھی کوئی دھان کو پوچھتا نہیں۔ گیہوں کا بھاؤ البتہ اور چڑھ گیا تھا۔

چھوٹے کسانوں کا دھان بغیر بیچے ہوئے بھی کھلیانوں میں ختم ہونے لگا۔ کسی انجانے خوف سے ان کے چہروں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ عورتیں پیٹھ پر انڈوں سے بھری ہوئی ٹوکریاں لاد کر آدالپور کے بازار میں بیچتی پھرتیں۔ تین کوس پتھریلی پگڈنڈیوں پر پیدل سفر کرنے سے ان کے پیروں میں زخم پڑ گئے تھے۔ وہ اب پیر پر زور دیکر

انگڑاتی ہوئی چلتی تھیں۔

چھتر دنشی نے ہمیر گڑھ میں نئی حویلی بنوانا شروع کر دی تھی۔ جس کے لئے زمینداری میں بسنے والے پالی کسان اپنے خچروں پر گاندھری وادیوں سے پتھر لاد کر لاتے۔ اس کام کی ان کو کوئی اجرت نہیں ملتی۔ وہ اس کے لئے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا۔

ہمیر گڑھ سے آدالپور تک سڑک بھی بنوائی جا رہی تھی، جو پالی کسانوں کے کھیتوں سے گذرتی تھی۔ ڈسٹرکٹ بورڈ نے سب کو نوٹس دیدیا تھا۔ پالی کسان یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں کی تیز چمک اور بھیانک ہوتی جا رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ آپس میں باتیں بھی کر لیتے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"دیس میں کال پڑ رہا ہے۔ یہ کیسا کال ہے؟"

"کیا یہ سب لوگ ہم کو دکھ پہنچانا چاہتے ہیں؟"

پھر وہ زور، زور سے چلانے لگتے۔ ان کے گلوں کی رگیں پھول جاتیں۔ پھر بے خوف نظر آتے۔

۵

سویرے ہی سویرے دبلا پتلا فوڈ انسپکٹر بستی میں آ گیا۔ اس کے ہمراہ خاکی وردی والے پولیس کے آدمی تھے۔ آدالپور کے غلہ کے بیوپاری تھے۔ سنڈیکیٹ کا رام دھیرج تھا۔ جن کسانوں نے اب تک گیہوں نہیں دیا تھا ان کے خچروں کو ایک جگہ اکٹھا کر لیا گیا۔ مرغیاں اور بطخیں بید کی بنی ہوئی لمبی لمبی ٹوکریوں میں بھروا دی گئیں۔ لکڑی کے تختوں والے مکانوں کے اندر سے دھان نکلوا کر دروازوں کے سامنے ڈھیریاں لگوا دی گئیں۔

فوڈ انسپکٹر دھان کے ڈھیر کے پاس کھڑے ہو کر چھڑی مارتا اور پھر بیوپاریوں کی طرف دیکھتا۔

"بیس من سے اوپر دھان ہے۔ اس کی کیا بولی بولتے ہو؟"

وہ بار، بار آواز لگاتا۔ "بیس من دھان، بیس من دھان۔"

کوئی بیوپاری درمیان میں بولا، "اٹھارہ یا اسی روپے۔"

انسپکٹر پھر آواز لگاتا۔ "اسی روپے، اسی روپے، اس بیس من دھان لے لئے۔"

اس کی اونچی آواز گونجتی رہتی۔ پالی کسان سہمے ہوئے دھان کے گرد اکٹھا ہو گئے۔ ان کے چہروں پر دکھا پن بھلا آنکھوں میں شکاری درندوں کی سی تیز چمک تھی۔ وہ جانوروں کی طرح منہ اٹھا، اٹھا کر سب کو دیکھ رہے تھے۔

کوئی بیوپاری بول اٹھتا۔ "پچاسی روپے"۔

پھر کئی آوازیں جلدی، جلدی ابھرتیں۔

"اٹھاسی روپے"۔

"چلو نوے روپے"۔

"میرے پچانوے روپے"۔

رام دھیرج نے ایک بار مسکرا کر انسپکٹر کی طرف دیکھا اور بڑے اطمینان سے بولا۔ "اچھا تو پورے سو کر لیجیے"۔

تیزی سے بولی بڑھاتے ہوئے بیوپاری رک جاتے۔ انسپکٹر اونچی آواز سے کہتا۔ "سو روپے، سو روپے، اس بیس من دھان کے لئے"۔

اسی طرح آواز لگاتے، لگاتے وہ رام دھیرج کی طرف دیکھتا۔ "کچھ اور بڑھائیے اب سرکاری رقم کے لئے بھی اتنا سوچنا پڑے گا"۔ رام دھیرج کھل کر مسکرانے لگا۔ اس کا سونے سے منڈھا ہوا دانت جھلکنے لگتا۔ وہ عیاری سے آنکھ مار کر کہتا۔

"چلئے آپ ہی کی بات رہی۔ ایک سو دس کر لیجئے۔ مگر اب اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں"۔

انسپکٹر پھر آواز لگانے لگا۔ "اس بیس من دھان کے لئے ایک سو دس روپے۔ ایک سو دس ایک، ایک سو دس دو"۔ پھر اس نے مجمع پر ایک چھلتی ہوئی نظر ڈال کر رام دھیرج سے کہا۔

"سنبھالئے اپنا دھان اور جا کر روپے جمع کرا دیجئے"۔

دھان بوریوں میں بھرنا شروع ہو گیا۔ کسان سنگین مجسموں کی طرح اپنے بدن کو ہلائے بغیر سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ گردھر چپ چاپ کسانوں کے مجمع سے نکل کر اپنے مکان کی طرف چلا گیا۔ وہ کڑی محنت سے

پیدا کئے ہوئے اپنے دھان کو اس طرح نیلام ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ وہ لکڑی کی دیوار سے ماتھا ٹکا کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ اس کی بیوی دونوں بچوں کو سنبھالے ہوئے کھڑی تھی۔ اس نے گردھر کو روتے دیکھا، لیکن کچھ بھی نہیں بولی۔ گردھر کا بوڑھا باپ سیاہ چھت کے نیچے لیٹا کھانس رہا تھا۔ اس نے گردھر کو دیکھا، خاموش کھڑی ہوئی بہو کو دیکھا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔

وہ گھر سے نکل کر سیدھا دھان کے ڈھیر کے پاس پہنچ گیا۔ دھان بوریوں میں بھرا جا رہا تھا۔ بوڑھا ایکدم سے چلانے لگا۔ "یہ دھان کس نے بیچا ہے؟ اس دھان کو کوئی نہیں بیچ سکتا۔ یہ دھان ہمارا ہے۔" چیخ، چیخ کر بولنے سے اس کا بوڑھا کبڑا جسم کانپنے لگا۔ وہ آگے بڑھا اور دھان کے ڈھیر پر اپنا پورا جسم پھیلا کر لیٹ گیا۔ دھان بوریوں میں بھرنے والے گھبرا گئے۔ فوڈ انسپکٹر بھی وہاں پہنچ گیا۔ بوڑھا برابر کہے جا رہا تھا۔

"یہ دھان ہمارا ہے۔ یہ دھان ہمارا ہے۔"

"اس کو کوئی نہیں لے جا سکتا۔"

فوڈ انسپکٹر پاس کھڑے ہوئے کسانوں کو تیکھی نظروں سے دیکھ کر حقارت سے بولا۔ "اے! اس بوڑھے کو اٹھا لے جاؤ۔ تم نے اسے یہاں کیوں آنے دیا۔" مگر کسان خاموش کھڑے رہے۔ بوڑھا کسان یکایک زور زور سے کھانسنے لگا۔

خاکی وردی پہنے ہوئے پولیس والے آگے بڑھے اور بوڑھے کو زبردستی گھسیٹنے لگے۔ بوڑھا بار بار پولیس والوں کی گرفت سے نکل جاتا اور دھان کی ڈھیری پر لیٹ جاتا۔ زور، زور سے کھانستا اور ہانپنے لگتا۔ پولیس والے کسی نہ کسی طرح اسے کھینچتے ہوئے دور لے گئے۔ اس کی بوڑھی کھال جگہ جگہ سے چھل گئی تھی۔ اور اس سے خون رس رہا تھا۔ بوڑھا پتھریلے فرش پر بے سدھ پڑا تھا۔ اور رک رک کر سانس بھر رہا تھا۔

دھان پھر بوریوں میں بھرا جانے لگا۔ پالی کسان خاموش کھڑے گردھر کے باپ کو دیکھ رہے تھے۔ بوروں میں بھرتے ہوئے دھان کو دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر نہ اداسی تھی، اور نہ وہ سوچتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ ان کے رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیوں کے اوپر دھنسی ہوئی آنکھیں تیزی سے چمک رہی تھیں۔ دبلا پتلا انسپکٹر دھان کے دوسرے ڈھیروں پر کھڑا نیلام کی بولی، بول رہا تھا۔ رام دھیرج ہنس، ہنس کر بیوپاریوں سے باتیں

کر رہا تھا۔ اچانک بوڑھا کسان لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور دھان کے ڈھیری کی جانب بڑھا۔ لیکن پولس والوں نے جھٹ اسے دبوچ لیا اور آگے جانے نہیں دیا۔ وہ بھنّا کر پولس والوں کو گالیاں دینے لگا۔

انسپکٹر دھان کے ایک ڈھیر کے پاس کھڑا آواز لگا رہا تھا۔ "اس تیرہ من دھان کے لئے بائیس روپے، بائیس روپے۔"

"بائیس روپے، بائیس روپے۔"

بوڑھا کسان برابر گالیاں دے رہا تھا۔ اس کی آواز اونچی ہوتی جا رہی تھی۔ دبلا پتلا انسپکٹر جھنجھلایا ہوا اس کے پاس آگیا اور بوڑھے کسان کو ڈانٹنے لگا۔ مگر بوڑھا کسی کی نہیں سنتا۔ وہ پاگلوں کی طرح چیخ رہا تھا۔ پھر ایک پولس والے نے اس کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا۔ چیخ کر بولا۔

"سالا برابر گالیاں دے رہا ہے۔"

"سالا چپ ہی نہیں ہوتا۔"

پھر ایک اور کانسٹیبل نے اس کے منہ پر زور سے گھونسا مارا۔ ڈپٹ کر کہا۔ "چپ بوڑھے کھوسٹ۔"

بوڑھا کسان لمبی، لمبی سانسیں بھرتا ہوا زمین پر جھک گیا۔ اس نے پتھریلے فرش پر زور سے سر دے مارا۔ تڑپ کر چیخا۔ "لو اور مارو، جان سے مار ڈالو۔" اس کے ماتھے سے خون بہنے لگا۔ مگر وہ برابر اپنا سر پتھروں پر ٹپک رہا تھا۔ اس کی دھنسی ہوئی آنکھیں خون میں ڈوب گئی تھیں۔ ناک سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ گندی سفید ڈاڑھی پر خون کے قطرے جمتے جا رہے تھے۔ خون کے ان سُرخ لوتھڑوں سے بھرا ہوا اس کا چہرہ بڑا بھیانک دکھائی دے رہا تھا۔ وہ برابر چیخ رہا تھا۔

"مار ڈالو، جان سے مار ڈالو۔"

دیکھتے ہی دیکھتے پالی کسانوں کے چہروں کی کھال تن گئی۔ کان اوپر کھنچ گئے اور آنکھیں شکار پر جھپٹنے والے درندوں کی طرح وحشتناک ہو گئیں۔ انھوں نے مٹھیاں بھینچ کر چلانا شروع کر دیا اور اچانک سب پر ٹوٹ پڑے۔ وہ زور، زور سے چلا رہے تھے۔

"سالا مارتا ہے۔ ہمارا دھان چھینتا ہے۔"

"ہاں سالا کیوں مارتا ہے۔"

"کیوں دھان چھینتا ہے۔"

ان کے بیچ میں گھرے ہوئے فوڈ انسپکٹر نے چیخ کر دھمکی دی۔ "کیا تم سرکاری آدمیوں کو مارو گے؟ یاد رکھو جیل میں سڑا دوں گا۔"

مگر گاندھر کے پالی کسانوں نے اس کی دھمکی سنی ہی نہیں۔ اب وہ کسی کی نہیں سن سکتے۔ وہ برابر مٹھیاں تان تان کر چلا رہے تھے۔ بیوپاری ان کو غیظ و غضب کے عالم میں دیکھ کر پہلے ہی بھاگ گئے تھے۔

آگ بگولہ کسان ان پر ٹوٹ پڑے۔ پولس والے بدحواس ہو کر سنگلاخ گھاٹی میں کودنے لگے۔ انسپکٹر کا موٹے شیشوں کا چشمہ ٹوٹ کر گر گیا تھا اور وہ پتھروں پر بے حال پڑا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر دبی، دبی کراہ تھی۔ رام دھیرج کی آنکھ سیاہ پڑ گئی تھی۔ اس سے خون رس رہا تھا۔ سر کے بال الجھ کر سوکھی جھاڑیوں کی طرح اٹھ گئے تھے۔ نتھنوں سے بہتا ہوا سیاہی مائل خون کیچڑ کی طرح غلیظ نظر آ رہا تھا۔

پالی کسان الجھی ہوئی سانسیں بھر بھر کر بوجھ سے لدے ہوئے خچروں کی طرح ہانپ رہے تھے۔ وہ اپنے گھروں کے اندر نہیں گئے۔ انھیں معلوم تھا کہ ابھی بہت سے پولس والے آئیں گے۔ کسانوں کی مٹھیاں ابھی تک تنی ہوئی تھیں۔ ان کے چہرے خونخوار نظر آ رہے تھے۔ کچھ کسان پتھریلے راستوں پر کھڑے ہو گئے۔ ان کے ہاتھوں میں نکیلے پتھر دبے ہوئے تھے۔ نیچے راستہ پر آہٹ ہوتی، وہ نکیلے پتھروں کو مضبوطی سے تھام کر ہاتھوں کو تان لیتے۔ کسان عورتیں بید کی ٹوکریوں میں دھان نہیں پتھر بھر بھر کر اوپر چٹانوں پر سے لا رہی تھیں۔ بستی کے سامنے پتھروں کے ڈھیر لگتے جا رہے تھے۔

رات کا اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ نیلگوں دھند کے لچھے امنڈ رہے تھے۔ گھاٹ پر سنڈیکیٹ کی ایک کشتی کھڑی تھی۔ اوپر بلندی پر دھندلی لالٹین لٹک رہی تھی۔ تیز ہوائیں چیختی ہوئی چل رہی تھیں۔ دھندلی لالٹین جھومنے لگتی۔ دھند کے غبار میں ہلکی سی روشنی کی لکیر مچلنے لگتی۔ کشتی پر پھوس کی چھتوں تلے ملاح تیز سردی سے بچنے کے لئے سکڑے ہوئے تھے۔ وہ آج ہی شام کو یہاں پہنچے تھے۔

ان کے ہمراہ سنڈیکیٹ کے بڑے دفتر سے جے دت بھی آیا تھا۔ وہ اڈھیر عمر کا آدمی تھا۔ اس کے سر کے بال

اڑے ہوئے تھے۔ وہ سنڈیکیٹ کا پرانا ملازم تھا اور اپنے ساتھ کلکتہ سے یہ آرڈر لایا تھا کہ دھان کی خریداری فوراً شروع کر دی جائے۔ راشننگ ہونے والی ہے۔ اس لئے جتنا بھی دھان مل سکے وہ بیچ دیا جائے۔ اب رام دھیرج کے بجائے اس دفتر کا انچارج جے دت ہوگا۔ سنڈیکیٹ نے رام دھیرج کو برخاست کر دیا تھا۔ اس کے کام پر ڈائرکٹروں کو سخت اعتراض تھا۔

رام دھیرج دفتر کے اندر لیٹا ہوا زخموں کی تکلیف سے کراہ رہا تھا۔ باہر نیلگوں دھند گہری ہوتی جا رہی تھی۔ گاندھر کے پٹھار کی سمت سے تیز یخ بستہ ہوا کے جھکڑ آ رہے تھے۔ شب کا سناٹا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ سارے علاقہ پر خاموشی چھائی تھی۔ یکایک خاموشی کا طلسم ٹوٹ گیا۔ پالی کسانوں کی بستی میں ملی جلی انسانی آوازوں کا شور ابھرنے لگا۔

اس شور و غل میں ناگاہ بندوقوں کی آوازیں ابھریں۔ گاندھر کے پٹھار کی سرد چٹانیں گونجنے لگیں۔ پالی کسانوں کی بستی میں گونجتی ہوئی بندوقوں کی آوازیں سن کر رام دھیرج چونکا۔ گھبرا کر اٹھا اور اپنے بستر پر بیٹھ گیا۔ پھر اپنی آنکھ کو دونوں ہاتھوں سے دبا کر پاگلوں کی طرح چلانے لگا۔

"مار ڈالو۔ ان کو جان سے مار ڈالو۔"

"ان کو گولیوں سے اڑا دو۔"

چلاتے، چلاتے وہ بستر پر بے سدھ ہو کر گر پڑا۔ اس کی آنکھ کی ٹیس بڑھ گئی اور خون بہنا شروع ہو گیا۔

ہوا بہت تیز ہے۔ دھندلی لالٹین کشتی کے اوپر کہر کے دھندلکوں میں اِدھر اُدھر جھول رہی ہے۔ روشنی کبھی تیز ہو جاتی ہے اور کبھی مدھم۔ بھوس کی نیچی چھتوں کے نیچے بیٹھے ہوئے ملّاح خوفزدہ ہو کر، پالی کسانوں کی بستی کی طرف دیکھتے ہیں۔ جہاں بندوقوں سے نکلتی ہوئی گولیاں تڑتڑا رہی ہیں اور ملی جلی انسانی چیخوں کا شور بڑھتا جا رہا ہے۔

غمِ دل اگر نہ ہوتا

شام ہی سے تیکھی ہوائیں چل رہی تھیں۔ آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے منڈلا رہے تھے۔ ابھی رات زیادہ نہ گزری تھی کہ اچانک تیز بارش شروع ہو گئی اور اس سُنسان سڑک پر جو سول لائن کو جاتی ہے بھیگتے ہوئے اکادکا راہگیروں کی طرح رندھیر بھی گھبرایا ہوا سا چل رہا تھا۔ سردی کی شدت سے اس کا جسم ٹھٹھرنے لگا تھا۔ بارش برابر بڑھتی جا رہی تھی۔ بپھری ہوئی طوفانی ہوائیں درختوں میں چیخ رہی تھیں۔ یکایک بجلی کی تمام روشنیاں بجھ گئیں۔ اور جھومتی ہوئی پرچھائیاں گہری تاریکی میں ڈوب گئیں۔ گھٹاٹوپ اندھیرے میں ہواؤں کا شور آسیب زدہ معلوم ہونے لگا۔ سول لائن جانے والی سڑک نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ رندھیر کے قدم خود بخود سُست پڑ گئے۔ اس کے چاروں طرف اندھیرے کا جال پھیلا ہوا تھا۔ بارش تیز ہوتی جا رہی تھی۔ سردی اتنی شدّت اختیار کرتی جا رہی تھی کہ اب وہ کہیں نہ کہیں ٹھہر جانا چاہتا تھا۔

گہری تاریکی میں ڈوبی ہوئی ویران سڑک پر رندھیر سنبھل، سنبھل کر قدم رکھتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ ایک موڑ پر اندھیرے میں دُور سے روشنی ٹمٹماتی ہوئی نظر آئی۔ وہ اسی طرف مڑ گیا۔ سامنے درختوں کے جھنڈ کے پیچھے ایک کوٹھی تھی، جس پر گہرا سکوت طاری تھا۔ وہ بلا جھجک کوٹھی کی جانب بڑھا۔ قریب پہنچا تو اس نے دیکھا کوٹھی کے ارد گرد پختہ چار دیواری تھی۔ چار دیواری کا پھاٹک بند نہیں تھا۔ وہ پھاٹک سے گزر کر اندر چلا گیا۔ بارش اور تیز ہو گئی تھی۔ وہ بارش کے موٹے، موٹے قطروں سے بچنے کے لئے لمبے، لمبے ڈگ بھرنے لگا۔ لان سے گزر کر برساتی کے نیچے پہنچا۔ مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ اندھیرا تھا اور خاموشی تھی۔

برساتی کے پیچھے طویل برآمدہ تھا۔ وہ سیڑھیاں طے کر کے برآمدے میں پہنچ گیا۔ دائیں ہاتھ کو ایک کھڑکی تھی، جس کے شیشوں پر ہلکی، ہلکی روشنی جھلملا رہی تھی۔ رندھیر نے اندھیرے اور خاموشی سے گھبرا کر کھڑکی کی طرف قدم بڑھائے اور دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ اندر کمرے میں آہستہ آہستہ پیانو بج رہا تھا۔ اندھیری رات میں اس کے مدھم سروں کی آواز ہولے ہولے ابھر رہی تھی۔ رندھیر کا جسم بارش سے بھیگا ہوا تھا۔ اور سردی سے کپکپا رہا تھا۔ برآمدے میں بھی وہ بارش سے محفوظ نہ تھا۔ ہوا کے تیز جھونکوں سے مینہ کی بوچھاڑ برآمدے میں آ رہی تھی۔

رندھیر بوچھاڑ سے بھیگتا رہا اور سردی سے کپکپاتا رہا۔ اندر پیانو مدھم سروں میں بجتا رہا۔ ہلکی ہلکی روشنی لان میں کھلنے والی کھڑکی کے شیشوں پر جھلملاتی رہی۔ اسی اثنا میں بارش سے بھیگا ہوا ایک کتا رندھیر کے برابر سے اپنے کان پھٹپھٹاتا ہوا گزرا۔ لمبے اوورکوٹ میں سمٹا سمٹایا اور اندھیرے میں دیوار کے ساتھ کھڑا ہوا رندھیر بڑا پراسرار نظر آ رہا تھا۔ کتا اسے دیکھ کر ٹھٹکا اور زور، زور سے بھونکنے لگا۔ رندھیر بدحواس ہو کر دیوار سے چمٹ گیا۔ کتا مسلسل بھونکتا رہا۔ گہری خاموشی میں کتے کی آواز بڑی خوفناک معلوم ہو رہی تھی۔ یکایک کمرے کا دروازہ کھلا۔ کسی نے دروازے کی آڑ سے جھانک کر دیکھا اور جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"کون ہے؟"

رندھیر کچھ نہ بولا۔ دم بخود کھڑا رہا۔

اس دفعہ ذرا اونچی آواز سے پوچھا گیا۔ "یہ اندھیرے میں کون کھڑا ہے۔ بولتے کیوں نہیں؟"

رندھیر بجائے کچھ کہنے کے اس کے پاس چلا گیا۔ یہ کوٹھی کا کوئی ملازم تھا۔ اور دروازے کی دہلیز پر سکڑ سکڑایا کھڑا تھا۔ اندر کمرے میں دھندلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ آتشدان میں انگارے دہک رہے تھے۔ رندھیر نے اپنے ٹھٹھرتے ہوئے جسم میں حرارت محسوس کی۔ اس نے قدم بڑھائے اور کمرے میں چلا گیا۔ کمرے کی فضا میں گرمی تھی، سکون تھا۔ ادھر کھڑکی کے پاس پیانو رکھا تھا۔ جس پر ایک موم بتی جل رہی تھی۔ پیانو کے سامنے ایک لڑکی خاموش بیٹھی تھی۔ اس نے پیانو بجانا بند کر دیا تھا۔ دھندلی روشنی میں اس کا چہرہ بیماروں کی طرح مضمحل نظر آ رہا تھا۔ رندھیر نے آتشدان کے برابر جا کر فوراً اپنا بھیگا ہوا اوورکوٹ اتارا۔ قریب رکھی ہوئی کرسی پر پھیلایا اور ایک لمبی کرسی کھسکا کر اطمینان سے بیٹھ گیا۔ دروازے کے قریب کھڑے ہوئے ملازم نے اسے حیرت سے دیکھا اور تیکھے لہجے میں

پوچھا۔

"آپ اندر کیوں آگئے؟"

رندھیر نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ "ذرا باہر بارش میں کھڑے ہو کر دیکھو تو تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ میں یہاں کیوں آگیا؟" وہ بے نیازی سے مسکرا دیا۔ "یار اتم پریشان نہ ہو۔ میں چور اُچکا نہیں ہوں۔ بارش رکتے ہی چلا جاؤں گا۔ مجھے رات بھر یہاں ٹھہرنا نہیں ہے۔"

اس دفعہ پیانو کے قریب بیٹھی ہوئی لڑکی کمودنی نے آہستہ سے کہا۔ "گردھر دروازہ بند کر دو۔ بہت ہوا آرہی ہے۔"

گردھر نے دروازہ بند کیا اور کوٹھی کے اندر چلا گیا۔ رندھیر آتشدان پر جھک کر آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ "اگر مجھے یہ آگ نہ ملتی تو میں آج سردی سے اکڑ کر رہ جاتا۔ باہر کتنی تیز بارش ہو رہی ہے۔ پھر ہوا کے یہ جھکڑ! اور اس طوفان میں بجلی کو بھی فیل ہو جانا تھا۔ کتنا گہرا اندھیرا ہر طرف چھایا ہے۔" کمرے کی خاموشی میں اسکی تھرتھراتی ہوئی آواز اس طرح ابھرتی رہی۔ جیسے کوئی خواب کے عالم میں بڑبڑا رہا ہو۔

اداس چہرے والی کمودنی پیانو کے قریب اسی طرح خاموش بیٹھی رہی۔ موم بتی کی زرد روشنی اس کے اداس چہرے پر لہراتی رہی۔ باہر بپھری ہوئی ہوائیں چیخ رہی تھیں۔ بارش کے قطرے کھڑکی کے شیشوں پر جل ترنگ بجا رہے تھے۔ رندھیر نے کونے میں رکھا ہوا پوکر اٹھایا اور آتشدان کے اندر سلگتے ہوئے کوئلوں کو کریدنے لگا۔ انگاروں سے چنگاریاں اُڑ اُڑ کر بکھرنے لگیں۔

ذرا دیر بعد سردی سے کپکپاتا ہوا گردھر پھر کمرے کے اندر آگیا اور کمودنی سے کہنے لگا۔

"کھانا کھا لیجئے۔ اب روشنی نہ جانے کب آئے گی۔ رات زیادہ ہو چکی ہے۔"

وہ آہستہ سے بولی۔ "نہیں میں کچھ بھی نہیں کھاؤں گی۔ تم مجھے صرف ایک کپ کافی پلا دو اور دیکھو دودھ کم ڈالنا۔"

اس کے ساتھ ہی رندھیر نے بھی کہدیا۔ "ایک کپ کافی اور لیتے آنا۔ میں اس قدر بھیگ گیا ہوں کہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں نمونیہ نہ ہو جائے۔" کافی کے لئے اس طرح فرمائش کرتے ہوئے رندھیر کو معاً خیال آیا کہ وہ بہت بے تکلفی برت رہا ہے۔ لیکن انگاروں پر ہاتھ پھیلا کر تاپتے ہوئے فوراً مسکرا بھی دیا کہ یہ بدتمیزی ہے اور کوئی بُرا مانتا ہے، تو برا مانا کرے۔ اُسے اب یہاں دوبارہ تو آنا نہیں۔ پھر ضرورت کے لئے جھجک کیسی۔

گردھر نے اس کی طرف بیزاری سے دیکھا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ مگر جب وہ واپس آیا تو ٹرے میں دو کپ موجود تھے۔ نیم روشن کمرے کی گرم فضا میں کافی کی ہلکی ہلکی بھاپ سے ابھرنے والی تیز مہک ہر طرف بکھر رہی تھی۔

رندھیر نے ٹرے سے کافی کی پیالی اٹھائی اور رُک رُک کر گھونٹ بھرنے لگا۔

اس نے کافی پینے کے بعد اوورکوٹ کا رُخ بدل دیا اور خالی پیالی ایک طرف رکھ دی۔ آتشدان کے اندر سلگتے ہوئے انگاروں کو وہ پوکر اٹھا کر آہستہ آہستہ کریدنے لگا۔ کوئلوں کے چٹخنے سے کمرے کی خاموشی دم بھر کے لئے درہم برہم ہو جاتی۔ رندھیر کا تھکا ہوا چہرہ تیز آنچ میں دہکنے لگا تھا۔ کمودنی اسی طرح خاموش بیٹھی رہی۔ مدھم روشنی میں اس کا دھندلا سا یہ فرش پر لہراتا رہا۔ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ ایک دوسرے سے بے نیاز۔ باہر درختوں میں تیز ہوا سیٹیاں بجاتی رہی۔ البتہ بارش رُک گئی تھی۔ بکھرے ہوئے بادل تیزی سے پرواز کر رہے تھے۔ بادلوں کی اوٹ سے جھانکتا ہوا گہرا نیلا آسمان ستاروں کی روشنی میں نکھرا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔

رندھیر نے اپنا اوورکوٹ اٹھایا۔ آگے بڑھا اور دروازہ کھول کر باہر جانے لگا۔ اس نے کمودنی کی طرف بغیر دیکھے ہوئے آہستہ سے کہا "دروازہ بند کر لیجئے۔ اندر ٹھنڈی ہوا آئے گی" وہ باہر چلا گیا۔

اس کے ہلکے سے طنز پر کمودنی نے کوئی توجہ نہ دی۔ پیانو کے قریب خاموش بیٹھی رہی اور جب رندھیر کے قدموں کی آہٹ سنسان سڑک پر مدھم پڑ گئی تو اس نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔ زمستانی ہوا میں اس کا جسم تیز سردی سے تھرتھرانے لگا تھا۔ اس نے کمرے میں بچھا ہوا قیمتی قالین دیکھا۔ جس پر کیچڑ کے بدنما نشان پڑے ہوئے تھے۔ اس نے بے زاری سے مُنہ بگاڑا اور آتشدان کے پاس کسی مجروح پرندے کی طرح تھکی ہوئی سی اس کرسی پر دراز ہو گئی جس پر کچھ دیر پہلے رندھیر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اجنبی نوجوان، جو اپنے بوسیدہ اوورکوٹ اور ڈھیلے ڈھالے لباس میں کسی کمپنی کا ایجنٹ معلوم ہوتا تھا۔ جس نے فرش پر بچھے ہوئے قالین کا ستیاناس کر دیا تھا۔ جو آتشدان کے پاس بیٹھا بڑے ٹھاٹھ سے کافی پی رہا تھا اور آتشدان کے دہکتے ہوئے انگاروں سے اپنے جسم کو گرمی پہنچا رہا تھا۔

کمودنی سوچنے لگی کہ اگر بارش سے بھیگا ہوا نہ ہوتا تو وہ اسے کمرے کے اندر نہ آنے دیتی۔ اس نے یہاں آکر خواہ مخواہ موڈ خراب کر دیا تھا۔ ایسی طوفانی رات میں جب تیز ہوائیں پھڑپھڑاتی ہوئی چل رہی ہوں۔ گرجتے ہوئے بادلوں سے لگاتار بارش ہو رہی ہو۔ روشنیاں ایک دم بجھ جائیں اور آتشدان میں سُرخ سُرخ انگارے دہک رہے ہوں تو کمرے کی گرم فضا میں بیٹھ کر مدھم سروں میں پیانو بجانا کتنا رومانٹک معلوم ہوتا ہے اور جب طبیعت بھی اداس ہو اور بادل روتے ہوئے معلوم ہوں اور چیختی ہوئی ہوائیں انجانے درد سے کراہتی ہوں تو پیانو کے سروں سے ابھرتے ہوئے غم زدہ نغمے سہانے خوابوں کا جال بُن دیتے ہیں۔ ان خوابناک جالوں سے باہر نکلنے کو کبھی دل نہیں چاہتا۔ لیکن جس طرح دلیپ نے اپنی کمپنی کے چیئرمین کی بیٹی، انورادھا سے اس لئے سگائی کر لی کہ وہ پھیچر کلرک کے بجائے ایگزیکٹو بننا چاہتا تھا، ٹھیک اسی طرح اس اجنبی نوجوان نے اس کے خوابوں کو درہم برہم کر دیا۔ اس لئے کہ وہ بارش سے بھیگا ہوا تھا۔ شدید سردی سے اس کا جسم کپکپا رہا تھا۔ اسے گرمی کی ضرورت تھی۔ وہ بارش میں نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ کتنے بے رحم ہوتے ہیں یہ لوگ جو اپنی کامناؤں کے لئے کسی کے دکھ کا ذرا بھی خیال نہیں کرتے۔

کمودنی کرسی پر نیم دراز پڑی ہوئی جھنجھلاتی رہی۔ آتشدان میں کوئلے چٹختے رہے۔ باہر ہوائیں پھڑپھڑاتی رہیں۔ موم بتی ایکبارگی زور سے بھڑک کر بجھ گئی۔ کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ دہکتے ہوئے انگاروں کی تیز آنچ میں کمودنی کا دھندلا چہرہ اور بیمار نظر آنے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ اس تاریکی میں پیانو پر زور سے سر پٹخ کر رونے لگے۔

رات آہستہ آہستہ گزر گئی۔ بادلوں کا ہجوم جس طرح تیز ہواؤں کے ساتھ آیا تھا، اسی طرح کسی اور سمت پرواز کر گیا۔ صبح ہو گئی پہاڑوں کی بسنتی دھوپ ہر طرف بکھر گئی۔ خوبصورت عمارتوں پر جن کے ڈرائنگ روموں میں ہر موضوع پر باتیں کرنے میں لطف آتا ہے۔ جہاں سنسان راتوں میں آتشدان کے پاس بیٹھنا بڑا رومانٹک معلوم ہوتا ہے۔ بھورے کارخانوں پر، جن کی فلک بوس چمنیاں دھواں اگلتی ہیں، جہاں مشینوں کی گڑگڑاہٹ میں مزدوروں کا شور گونجتا ہے۔ تنگ و تاریک کوچوں پر جن میں دھوپ چوروں کی طرح داخل ہوتی ہے۔ جہاں بدصورت عورتیں چیخ چیخ کر باتیں کرتی ہیں۔ اور ننگ دھڑنگ مریل بچوں کو فحش گالیاں دیتی ہیں۔

کمودنی اپنی کوٹھی کے لان پر چمکیلی دھوپ میں تھکی ہوئی سی بیٹھی تھی۔ ادھر کچھ عرصہ سے وہ بیمار تھی۔ ڈاکٹر نے

اسے مکمل آرام کرنے کی ہدایت کی تھی۔ سامنے سڑک پر ایک جھلکتی ہوئی کار سنسناتی ہوئی گزر رہی تھی اور ایک گھبرایا ہوا راہگیر اسے احمقوں کی طرح گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔

جب دن کے سایے ڈھلنے لگے تو کمودنی اور مضمحل ہو گئی۔ تنہائی سے اس کا جی گھبرانے لگا۔ پھر ذرا دل بہلانے کے خیال سے وہ نیو مارکیٹ، شاپنگ کے لئے چلی گئی۔ جہاں سڑک کے نکڑ پر راہگیروں کا ہجوم تھا۔ ان کے درمیان چند نوجوان لڑکے کھڑے تھے، جن کے لباس کھدر یا ایسے ہی کسی اور موٹے کپڑے کے تھے۔ چہروں پر رکھا پن چھایا ہوا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر اخبار بیچ رہے تھے۔

"چین میں سُرخ فوجوں کی فتح، جنتا کی فتح ہے۔ ساری دنیا کے محنت کشوں کی فتح ہے۔"

"بمبئی کے پانچ ملوں میں ہڑتال سرمایہ داروں کی رکشا کے لئے ملوں کے پھاٹک پر مسلح پولیس کا پہرہ۔ مزدور اپنی مانگیں منوا کے رہیں گے۔ مزدوروں کی آواز کو بندوق اور لاٹھی سے نہیں کچلا جا سکتا۔"

"پنڈت نہرو ڈالر کے دیس امریکہ میں۔ امریکہ کے پونجی پتیوں سے ہندوستان کے سودے کا بھاؤ تاؤ۔"

"کمیونسٹ پارٹی کا اخبار 'کراس روڈز' پڑھئے، جو جنتا کا اخبار ہے، جو آپ کا اخبار ہے۔ جو ہندوستان کے محنت کشوں کا اخبار ہے۔ جو عوام کی لڑائیوں کے حق کے لئے لڑتا ہے۔ جو بھوک اور غلامی کے خلاف آواز اٹھاتا ہے۔"

"کمیونسٹ پارٹی کا اخبار 'کراس روڈز' پڑھئے۔"

کمودنی نے ان آوازوں کو سنا اور راہگیروں کی بھیڑ سے ذرا ہٹ کر ٹھہر گئی۔ ان بے ترتیب لباس والے نوجوانوں میں اسے رندھیر بھی نظر آیا، جو گلا پھاڑ پھاڑ کر اخبار فروخت کر رہا تھا۔ کمودنی نے اسے پہچان لیا اور اس کے قریب جا کر ایک اخبار مانگا۔ اسی طرح جس طرح سینما دیکھنے کے لئے ٹکٹ خریدا جاتا ہے۔ یا شاید وہ رندھیر کو بتا دینا چاہتی تھی کہ کامریڈ! تم جو اس رات میرے کمرے میں بلا اجازت داخل ہو کر ٹھاٹھ سے آتشدان کے سامنے بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ تمھاری اوقات بس اتنی ہے کہ میں صرف چار آنہ خرچ کر کے تم پر احسان کر سکتی ہوں۔ اس لئے کہ مجھے اس اخبار سے کوئی دلچسپی نہیں، اس لئے کہ یہ اخبار محنت کشوں کا ہے۔ اور میرے ذرا سے حکم کے لئے درجنوں ملازم مستعد رہتے ہیں۔ لیکن رندھیر نے اخبار دے کر بلا جھجک کئی بک لٹ اور پمفلٹ

بھی اس کی طرف بڑھا دیئے۔

"یہ پمفلٹ نئے ہیں ان کو بھی پڑھئے۔"

کمودنی نے ان کو بھی خرید لیا۔ رندھیر نے کہا۔ "آپ پارٹی کا اور لٹریچر لینا چاہیں تو میں کسی وقت وہ بھی دے سکتا ہوں۔" اس نے مسکرا کر کمودنی کی جانب دیکھا۔ "ویسے آپ نے چوکھی پر پیپلز بک ہاؤس تو دیکھا ہی ہوگا۔ وہاں پارٹی کا ہر قسم کا لٹریچر ملتا ہے۔"

وہ بالکل کاروباری انداز میں باتیں کر رہا تھا۔ کمودنی نے سوچا کہ شاید اس نے ابھی اسے پہچانا نہیں۔ کہنے لگی۔ "جی ہاں میں آپ کا لٹریچر پڑھنا چاہتی ہوں۔ کسی دن کوٹھی پر آئیے، میری کوٹھی تو شاید آپ نے دیکھی ہے۔"

رندھیر ہنسنے لگا۔ "جی ہاں اس روز رات کو میں بارش میں آپ کے یہاں جا چکا ہوں۔ میں آپ کی کوٹھی پر ضرور آؤں گا۔"

باتیں ختم ہو گئیں۔ رندھیر پھر چلا چلا کر اخبار بیچنے لگا۔

کمودنی گھر واپس آ گئی۔ سورج اب غروب ہو چکا تھا۔ کمودنی نڈھال اور دل گرفتہ ہو رہی تھی۔ وہ کھڑکی کی چوکھٹ کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔ اور باہر دیکھنے لگی۔ اس اداس شام کو جب کہر کا دھندلکا گہرے خوابوں کی طرح پھیلتا جا رہا تھا۔ شہر کا دبا دبا شور کہیں دور سسکیوں کی طرح گونج رہا تھا اور نزدیک کسی درخت پر ایک چیل اپنے پروں کو پھٹپھٹاتی ہوئی چیخ رہی تھی، کمودنی خاموش کھڑی سوچ رہی تھی کہ اسکی زندگی بھی تو اس اداس شام کی طرح تھکی تھکی سی ہے۔ جس میں شہر کے دبے دبے شور کی طرح سسکیاں ہیں یا پھر اس پھڑپھڑاتی ہوئی چیل کی طرح تیز چیخیں۔ آخر وہ ان الجھے ہوئے جالوں سے کب رہائی پائے گی۔ کس طرح اور کیسے؟ سچ مچ اب تو زندگی بہت بور ہو گئی ہے۔ وہ اسی طرح کھوئی کھوئی کھڑکی پر کھڑی رہی۔ شام کے کہر بار دھندلکے اور تاریک ہو گئے۔ سڑک پر راہگیروں کے قدموں کی آہٹ کم ہوتی گئی۔ سناٹا پھیلتا گیا۔

ہفتہ بھر بھی نہ گزرا تھا کہ ایک روز دن ڈھلے اس کی کوٹھی پر رندھیر آ گیا۔ اس کے چہرے پر گرد کا غبار چھایا ہوا تھا۔ بال الجھے ہوئے تھے۔ ہاتھوں میں کھادی کا ایک تھیلا دبا تھا جس میں کتابیں بھری تھیں۔ وہ بہت تھکا ہوا نظر

آرہا تھا۔ مگر اس نے بیٹھتے ہی تھیلے کے اندر سے کتابیں نکالیں اور کمودنی کے سامنے میز پر پھیلانا شروع کر دیں۔

کمودنی بولی "میں نے آپ کا اخبار پڑھا تھا۔ پر مجھے اس کی خبریں پڑھ کر بہت اچنبھا ہوا۔ ہمارے یہاں کئی اخبار آتے ہیں۔ ان کی ایسی خبریں نہیں ہوتیں۔ آپ لوگ ایسی خبریں کہاں سے لاتے ہیں؟"

"ہم خبریں لائیں گے کہاں سے۔ ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے" رندھیر نے مسکرا کر جواب دیا "یہ بات دوسری ہے۔ کہ نیشنلسٹ پریس میں آپ کو یہ خبریں نہیں دکھائی دیتیں۔ یہ خبریں وہ بھی جانتے ہیں اور اگر نہیں جانتے تو جاننے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔ کیونکہ اس میں سرمایہ داروں کے نقصان کا سوال ہے۔ کئی اخباروں کے تو وہ مالک بھی ہیں۔ ویسے بھی اخبار ان کے اشتہاروں سے چلتے ہیں"

"ہاں، یہ تو میں نے بھی غور کیا کہ آپ کے اخبار میں کوئی اشتہار نہیں"

رندھیر نے بات کو طول دینے کی کوشش نہ کی۔ کمودنی کو میز پر بکھری ہوئی کتابوں کے بارے میں بتانے لگا۔ کمودنی نے پینتیس روپے سے اوپر کی کتابیں خریدیں۔ رندھیر بقیہ کتابیں سمیٹ کر تھیلے میں بھرنے لگا۔ کمودنی نے کتابوں کی قیمت ادا کرتے ہوئے مسکرا کر رندھیر سے پوچھا۔

"آپ کو اس میں سے کمیشن کتنا ملے گا؟"

"کمیشن!" رندھیر نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا "آپ نے میرے بارے میں غلط اندازہ لگایا۔ میں سیلز مین یا ایجنٹ نہیں ہوں۔ مجھے کوئی کمیشن نہیں ملتا۔ میں پارٹی کا ہول ٹائم ممبر ہوں"

"اوہ! آئی ایم ویری سوری" کمودنی نے خفیف ہو کر صفائی پیش کی "وشواس کیجیے، مجھے آپ کی پارٹی کے بارے میں کچھ اتا پتا نہیں۔ پر یہ ہول ٹائم ممبر سے آپ کا کیا مطلب ہے؟"

"مطلب یہ کہ میرا سارا وقت پارٹی ہی کے لئے ہوتا ہے" رندھیر نے اسے بتایا "میں کوئی اور کام دھندا نہیں کرتا"

"کوئی نوکری چاکری بھی نہیں کرتے۔ پھر آپ کا کام کیسے چلتا ہے؟"

"مجھے بھی پارٹی وتیہ ملتی ہے۔ وہی جو ہر ہول ٹائمر کو دی جاتی ہے" رندھیر نے مسکرا کر جواب دیا۔

"کتنی پارٹی وتیہ ملتی ہے؟" کمودنی نے کرید کر پوچھا۔

"بیس روپئے مہینہ"

"صرف بیس روپئے مہینہ!" کمودنی نے حیران و پریشان ہو کر کہا۔ "بھلا اس میں کیا ہوتا ہوگا۔"

"اس میں سب ہی کچھ ہو جاتا ہے۔" رندھیر نے مسکرا کر بتایا۔ "گیارہ روپئے کمیون میں دے دیتا ہوں۔ میں کمیون ہی میں رہتا ہوں۔ وہاں میرے پاس ایک کمرہ ہے۔ جس میں ایک اور کامریڈ بھی رہتے ہیں۔ صبح شام کی چائے کے علاوہ دونوں وقت کا کھانا ہمیں کمیون ہی سے ملتا ہے۔ پارٹی ورک سے جو نو روپے باقی بچتے ہیں اس سے عیش کرتا ہوں۔" وہ بے تکلفی سے کھل کھلا کر ہنسا۔ "مطلب یہ کہ کرایہ بھاڑا، چائے سگریٹ کا خرچ اسی سے پورا ہوتا ہے۔"

کمودنی ششدر رہ گئی۔ اس سے کچھ بھی نہ کہا گیا۔ رندھیر نے کتابیں اپنے تھیلے میں رکھیں اور چلنے کیلئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کمودنی نے اُسے ٹوکا۔ "آپ بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہیں۔ چائے پی لیجئے۔ میں تو آپ سے ابھی اور بہت سی باتیں کرنا چاہتی تھی۔"

رندھیر چائے پینے کے لئے ٹھہر گیا۔ وہ لگ بھگ چار میل پیدل چل کر آیا تھا۔ تھیلے میں بھری ہوئی کتابوں کا وزن بھی کم نہ تھا۔ ویسے اسے چائے کی طلب بھی محسوس ہو رہی تھی۔ کمودنی نے ملازم کو بلا کر چائے لانے کے لئے کہا۔

کچھ دیر بعد چائے آگئی۔ چائے کے ساتھ کھانے پینے کا بھی سامان تھا۔ دونوں چائے پینے لگے۔ کمودنی نے چائے کا گھونٹ بھر کر اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ "دیکھئے ادھر میں نہ جانے کیسا محسوس کر رہی ہوں۔ کچھ اچھا ہی نہیں لگتا۔ ڈاکٹر کا خیال ہے کہ میں بیمار ہوں۔ پر میں سوچتی ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔ مجھے تو ایسا جان پڑتا ہے کہ میں جیسے تھک گئی ہوں۔ میں اپنے جیون میں کچھ تبدیلی چاہتی ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ کچھ کروں۔"

رندھیر اس کی بات کا مطلب بخوبی سمجھ گیا تھا۔ مگر وہ خاموشی سے چائے پیتا رہا اور سوچتا رہا کہ مس کمودنی تم کچھ نہیں بلکہ بہت کچھ کر سکتی ہو۔ باپ کی کوئی بڑے نیتا شہر میں آئیں تو ان کے آنر میں ایک عدد ریسپشن دیدو۔ اس طرح تم کو سوسائٹی میں پاپولر ہونے کا موقعہ مل جائے گا۔ پھر تم کو جلسوں کی صدارت کے لئے بلوایا جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ نئے الیکشن کے لئے تم کو کانگریس کا ٹکٹ بھی مل جائے اور ایم، ایل، اے بھی ہو جاؤ۔ یا پھر عورتوں

کی ایک ایسوسی ایشن بنا ڈالو۔ اس میں عورتوں کے حقوق پہ زوردار تقریریں کرو۔ پریس کانفرنس بلاؤ۔ اس طرح اخباروں میں تمھارے لمبے چوڑے اسٹیٹمنٹس شائع ہونے لگیں گے۔ تمھارے آٹوگراف لئے جائیں گے۔ یا پھر تم اعلیٰ نسل کے کتے پالنے شروع کردو۔ ان کو ڈاگس شو میں ضرور لے جاؤ۔ اس طرح کم از کم "آن لکر" یا "السٹریٹڈ ویکلی" میں تمھاری شاندار سی تصویر ہی چھپ جائے گی۔ یا پھر۔!! سوچتے سوچتے اس کی نظر کمودنی کی جانب اٹھ گئی، جو ابھی تک اپنے جواب کی منتظر تھی۔ رندھیر مسکرا کر بولا۔

"اگر فیشن میگزینوں اور جاسوسی ناولوں سے آپ کچھ وقت بچا سکیں تو ان کتابوں کو ضرور پڑھئے اور ہو سکے تو ہر ہفتہ کراس روڈ ضرور دیکھ لیا کیجئے۔" رندھیر کو اچانک چائے کی میز کا خیال آیا جس پر کھانے پینے کا سامان ختم ہو چکا تھا۔ اسے ہنسی آگئی۔ کہنے لگا۔ "میں نے تو ساری پلیٹیں ختم کر دیں۔ بات یہ ہے کہ میں بہت سویرے ہی ٹیکسٹائل مل چلا گیا تھا۔ وہاں سے لوٹتے ہوئے کمیون بھی نہیں جا سکا۔ سیدھا یہیں چلا آیا۔ نہیں تو آج بھی نہ آ سکتا۔"

کمودنی نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "تو کچھ اور کھا لیجئے۔"

نہیں! اب کچھ نہیں کھاؤں گا۔" رندھیر مزید ٹھہرنے پہ آمادہ نہ ہوا۔ "اب میں کمیون جاؤں گا۔" اس نے اپنے بلگجے لباس پر نظر ڈالی۔ "کمیون میں جا کر کپڑے دھونا ہیں۔ بہت میلے ہو گئے ہیں۔ کمرے کی صفائی بھی کرنا ہے اور بھی کئی ضروری کام کرنا ہیں۔"

رندھیر نے کتابوں سے بھرا ہوا تھیلا سنبھالا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

رندھیر کے جانے کے بعد کمودنی اسی طرح نڈھال اور بے زار، بے زاری بیٹھی رہی۔ دن ڈھل رہا تھا۔ سائے طویل ہو کر پھیلتے جا رہے تھے۔ ڈوبتے سورج کی روشنی مغرب کے غاروں میں روپوش ہوتی جا رہی تھی۔ کمودنی بہت اداس تھی۔ سوچ رہی تھی کہ آخر کوئی اس سے ہمدردی کیوں نہیں کرتا۔ ایک ماں جی ہیں، وہ خود بیمار ہیں۔ جب سے ان پر فالج گرا ہے، ہر وقت خاموش پڑی رہتی ہیں۔ وہ خود اس کی محتاج ہیں اور ڈاکٹر کہتا ہے کہ خوش رہو، خوب قہقہے لگاؤ۔ کلاس فیلو ملتی ہیں تو کہتی ہیں کہ تم فلاسفر ہوتی جا رہی ہو۔ بالکل اسمارٹ نہیں رہی ہو اور یہ فلرٹ ٹائپ کے لڑکے تو بس اسی قدر سوچ سکتے ہیں کہ وہ ٹمپسٹ کی میرانڈا معلوم ہوتی ہے۔ ٹینی سن کی لوٹس ایٹر

لگتی ہے۔ کچھ اور زیادہ سویٹ، کچھ اور زیادہ لولی، اور یہ کامریڈ صرف اپنے لٹریچر کی بات کرتا ہے۔ مزدوروں اور کسانوں کی بات کرتا ہے۔ آجڈ کہیں کا۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ کیا ہے کس باپ کی بیٹی ہے؟ اس باپ کی جس کے مرنے پر صوبے کے انگریز گورنر نے پرسے کا تار بھیجا تھا۔ اسکولوں اور سرکاری دفتروں میں آدھے دن کی چھٹی ہو گئی تھی اور یونین جیک سرنگوں کر دیا گیا تھا۔ اس کا بھائی کیمبرج میں پڑھتا ہے اور آٹھ سال سے لندن میں مقیم ہے۔ اس کی کوٹھی اتنی خوبصورت ہے کہ جب نئی، نئی بنی تھی تو اس کی تصویر آرکیٹیکچر کے مشہور میگزین "دی بلڈر" میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے ڈرائنگ روم میں اپالو کا جو مجسمہ ہے، چار برس میں تیار ہوا تھا اور اس نے ابھی بیوک کا نیا ماڈل خریدا ہے۔ وہ اسی طرح صوفے پر نڈھال پڑی رہی۔ ڈاکٹر کی سخت ہدایت کے باوجود مسلسل سوچتی رہی۔

جب اندھیرا بڑھنے لگا تو وہ اٹھی۔ کتابیں اٹھا کر لائبریری میں گئی اور انکو ساگوانکی بنی ہوئی خوبصورت الماری میں ترتیب سے لگا دیا۔ کچھ بک لٹ اور پمفلٹ پڑھنے کے لئے میز پر رکھ دیئے۔ حالانکہ وہ ان کو توجہ سے نہ پڑھ سکی۔ مگر ان سے اتنا تو ضرور ہوا کہ ملنے جلنے والی لڑکیوں میں چرچا ہونے لگا کہ بھئی کمودنی تو کامریڈ ہو گئی ہے۔ وہ تو آج کل کمیونزم پر یہ موٹی موٹی کتابیں پڑھتی ہے۔ اور پھر اُسے باقاعدہ کامریڈ کہا جانے لگا۔ کمودنی نے سوچا کہ یہ تھرل بُرا تو نہیں۔ اس طرح خاصا رعب پڑ رہا ہے۔ وہ خود کو کمیونسٹ پوز کرنے بھی لگی اور شاید اسی لئے اس نے رندھیر سے خریدے ہوئے لٹریچر کو خواہش نہ ہونے کے باوجود کورس کی کتابوں کی طرح پڑھنا شروع کر دیا۔

کچھ عرصہ بعد رندھیر پھر اس کے یہاں آیا۔ اس دفعہ وہ پیس کانفرنس کے لئے چندہ لینے آیا تھا۔ کمودنی نے فنڈ کے لئے اسے صرف پانچ روپئے دیئے۔ ان روپیوں کو جیب میں رکھتے ہوئے رندھیر نے سوچا کہ اگر اس لڑکی کو یہ یقین ہوتا کہ چندہ دینے والوں کا نام اخبار میں چھپے گا تو بلا شبہ وہ سو روپئے تک دیتی۔ لیکن یہی کیا کم ہے کہ اس نے کچھ تو دیا۔ دوسرے لوگوں کی طرح خواہ مخواہ دماغ نہیں چاٹا۔

کمودنی کہنے لگی "دیکھئے میں نے آپ کی کتابیں بڑی باقاعدگی سے پڑھنا شروع کر دی ہیں۔ کچھ اور لٹریچر ہو سکے تو کبھی لیتے آیئے۔" رندھیر نے وعدہ بھی کر لیا۔

ذرا دیر رُک کر وہ بولی "ان کتابوں کے پڑھنے سے مجھ میں کچھ تبدیلی تو ہو رہی ہے۔ لیکن میں اپنی زندگی میں

بہت بڑی تبدیلی چاہتی ہوں۔ سوچتی ہوں کہ ہمارا سوشل سٹ اَپ ہی غلط ہے۔ اس سماج کو بدل جانا چاہیئے جس میں لوگ مہنگائی سے بھوکے مرتے ہوں۔ مزدوروں کا کڑی محنت کر کے بھی گزارہ نہیں ہوتا۔ جہاں عہدوں کے لالچ میں محبتوں کو ٹھکرا دیا جائے۔" شاید یہ آخری بات کہنے ہی کے لئے اس نے اور بھی سب کچھ کہا تھا۔ جو اس نے صرف پڑھا تھا۔ محسوس نہیں کیا تھا۔ پھر اس نے جھجکتے ہوئے آہستہ سے کہہ ہی دیا۔

"دراصل میں کمیونسٹ بن جانا چاہتی ہوں۔ میں پارٹی میں کچھ کام کرنا چاہتی ہوں۔"

رندھیر کھلکھلا کر ہنس دیا۔ "سُنئے مس کمودنی، کمیونسٹ پارٹی کوئی ایسا ہسپتال تو ہے نہیں جہاں عشق کے مریضوں کا علاج ہوتا ہو۔ وہ مزدوروں اور کسانوں کی جماعت ہے۔ مزدوروں اور کسانوں کی۔"

وہ بولی۔ "اگر میں کچھ کرنا چاہتی ہوں تو آپ مجھے اس طرح تراش کیوں کرنا چاہتے ہیں۔ میں مزدوروں اور کسانوں کی مدد ہی تو کرنا چاہتی ہوں۔"

رندھیر سنجیدہ ہو گیا۔ "ہمارے لئے آپ کی ہمدردی ہی بہت ہے۔ آپ پارٹی فنڈ کے لئے کچھ نہ کچھ دیتی رہیں۔ یہ بھی کم مدد نہ ہوگی۔ آپ اسے چھوٹی مدد کیوں سمجھتی ہیں۔"

کمودنی نے دل برداشتہ ہو کر کہا۔ "یہ تو ٹھیک ہے۔ پر میں اپنے جیون میں تبدیلی چاہتی ہوں۔ بہت بڑی تبدیلی۔ دیکھئے نا، میں کتنی اداس اور تھکی ہوئی رہتی ہوں۔"

رندھیر اور سنجیدہ ہو گیا۔ "آپ اداس اس لئے ہیں کہ آپ کے سامنے کوئی فیوچر نہیں۔ آپ تھکی ہوئی اس لئے ہیں کہ آپ کے جیون میں کوئی جدوجہد نہیں۔ جب حرکت نہ رہے تو پانی میں ٹھہراؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور ٹھہرا ہوا پانی جوہڑ بن جاتا ہے۔ آپ اور آپ کی کلاس کے لاتعداد لوگ ایک ایسے قلعہ میں قید ہیں جس میں ہزاروں سجے سجائے ایک ہی سے کمرے ہیں۔ جب تک ان میں دل بہلتا رہے۔ یہی بہتر ہے۔ اور جہاں ان سے باہر نکلنے کی کوشش کی تو ان بھول بھلیوں میں جیون بھر سر پھوڑا کیجئے۔ راستہ نظر نہ آئے گا۔ وہ پکنک ہو یا گٹ ٹوگیدر۔ بال روم ہو یا کلب فلرٹیشن ہو یا کورٹ شپ۔ ایک کمرے کے بعد دوسرا کمرہ۔ ایک راستے کے بعد دوسرا راستہ۔ جیون بس ان ہی راستوں میں اُلجھ کر رہ گیا ہے۔ اور اگر آپ سچ مچ اپنے جیون میں کوئی بڑی تبدیلی چاہتی ہیں تو اپنی کلاس سے نفرت کیجئے۔ اور جب نفرت انتہا کو پہنچ جائے گی تو آپ سمجھ سکیں گی کہ

جنتا کا دکھ درد کیا ہے۔ اور ہمدردی کا خیال تو محض ڈھکوسلہ ہے اور کچھ نہیں۔"

بات اچانک ایک ایسے رُخ پر آگئی کہ کمودنی حواس باختہ سی ہوگئی۔ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی، خاموش بیٹھی رہی اور رندھیر اُٹھ کر چلا گیا۔

کمودنی بیٹھی سوچتی رہی کہ جس بات کو وہ اس قدر آسان سمجھتی رہی تھی وہ اتنی آسان نہیں ہے۔ آخر وہ یہ نفرت کا جذبہ خود میں کس طرح پیدا کر سکے گی۔ اس میں اتنی ہمت کس طرح آجائے گی۔ یہ سوچتے، سوچتے وہ تھک گئی۔ پھر اس نے پارٹی لٹریچر کو اور بھی مستعدی سے پڑھنا شروع کر دیا۔ تقریبات اور تفریحی محفلوں میں جانے سے کترانے لگی۔ اس بات پر اس کو نشانۂ استہزا بنایا جانے لگا۔ پورے محاذ کے خلاف وہ مضبوطی سے ٹھہر نہ سکی تھی۔ اس بہاؤ میں اس کے قدم بار بار اکھڑ جاتے۔ پھر ایک روز جب کنور بلراج کے ساتھ کچھ لڑکیاں بھی اس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی تھیں اور چارلس لوائر کی نئی پکچر سے ملکی سیاست تک ہر موضوع پر باتیں ہو رہی تھیں تو اچانک رندھیر کتابوں کا تھیلا سنبھالے ہوئے وہاں آگیا۔ ہمیشہ کی طرح اس کے بالوں پر خاک جمی ہوئی تھی۔ چہرے پر روکھا پن تھا۔ اور لباس ملگجا اور شکن آلود تھا۔ شاندار ڈرائنگ روم اور رنگ و بُو کے اس ماحول میں وہ بالکل غیر ضروری معلوم ہو رہا تھا۔ کمودنی نے اسے سب سے ملایا۔ پھر ادھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔

بلراج نے باتیں کرتے کرتے اچانک کہا۔ "کامریڈ رندھیر! ایک بات تو بتایئے۔ کیا کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے آپ لوگوں کو یہ ہدایت دی جاتی ہے کہ بال لمبے، لمبے اور الجھے ہوئے ہوں۔ شیو بڑھا ہوا اور کپڑے ملگجے ہوں۔ کم از کم میں نے تو سب ہی کامریڈز کو اسی طرح دیکھا ہے۔"

"جی نہیں! ایسی کوئی بات نہیں۔" رندھیر ہنسنے لگا۔ "ہمیں مزدوروں اور یونین کے کرم چاریوں میں رہنا پڑتا ہے۔ ان کے ساتھ ایسی جگہوں پر بیٹھ کر بات چیت کرنا پڑتی ہے، جو عام طور پر صاف ستھری نہیں ہوتیں۔ ویسے بھی خود کو انھی کی طرح رکھنا پڑتا ہے، ورنہ آپس میں بھائی چارا اور میل ملاپ پیدا نہ ہو۔ پھر سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ ہم کو اتنا ملتا ہی نہیں کہ اچھے کپڑے پہنیں اور اپنے تئیں بنا سنوار کر رکھیں۔"

رندھیر نے مزید وضاحت نہ کی۔ وہ اس موضوع پر زیادہ کہنا نہ چاہتا تھا۔ ورنہ وہ اسے بتاتا کہ

ٹپ ٹاپ رہنے کا مطلب ہے۔ شاندار بنگلہ، نئے ماڈل کی چمکتی دمکتی کار، ڈانس ہال، کلب، کاک ٹیل پارٹیاں، فلرٹیشن اور ایسے ہی طرح طرح کے دوسرے ہنگامے اور ان سب کے لئے اسے اپنا ضمیر بیچنا پڑتا۔ سچائی سے منہ موڑنا ہوتا۔ ایمانداری کو فریب دینا پڑتا۔ اس طرح بھی وہ پورے طور پر خود نمائی نہ کر سکتا تو یہ کتنا اچھا ہے کہ کسی شاندار دکان کے شوکیس میں ڈمی ماڈل کے بجائے خود کھڑا ہو جائے۔ اور ہر گزرنے والے سے چیخ، چیخ کر کہے کہ میری طرف دیکھو۔ میں جو نہایت قیمتی سوٹ پہنے کھڑا ہوں۔ میں جو کارنیوال ڈی پیرس کی یہ خوبصورت ٹائی باندھے ہوئے ہوں۔ بتاؤ میں کتنا گریٹ معلوم ہو رہا ہوں۔ کتنا اسمارٹ نظر آتا ہوں۔ میری تعریف کرو۔ مجھے مڑ، مڑ کر دیکھو۔ کیونکہ میں یہاں اسی لئے کھڑا ہوں۔ میں اپنی تعریف سننا چاہتا ہوں۔ اپنی نمائش کرنا چاہتا ہوں۔

"ہو سکتا ہے۔ آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں۔" بلراج اس کی وضاحت سے مطمئن نہ ہوا۔ "لیکن میں نے تو یہ دیکھا ہے کہ اس حلیہ میں آدمی بڑا انٹلکچوئل نظر آتا ہے۔ کمودنی ایسی لڑکیوں پر بڑا رعب پڑتا ہے۔ بلکہ میں نے تو کتنے ہی ایسے کامریڈ دیکھے ہیں جو ٹھاٹھ سے فلرٹ کرتے ہیں۔ عشق لڑاتے ہیں۔"

"ایسا ہوتا نہیں ہے۔ اور ہو بھی کیسے سکتا ہے۔" رندھیر نے بڑے اطمینان سے کہا۔ "مزدوروں اور محنت کشوں کے ساتھ رہ کر فلرٹ و لرٹ کرنے کے بارے میں سوچنے کا وقت ہی کہاں ملتا ہے۔" وہ بے تکلفی سے ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ "ویسے محبت کرنا کوئی جرم تو نہیں۔ یہ تو ایک نیچرل ڈیزائر ہے۔ پارٹی ہم سے برہمچاری رہنے کا عہد تو کراتی نہیں اور نہ ہم کسی مٹھ میں رہنے والے ایسے یوگی ہیں جس نے سنیاس لے رکھا ہو۔" رندھیر کو بلراج کی بات ناگوار گزری تھی۔ وہ کسی قدر جھنجھلا گیا تھا۔ اگر نئی نئی ملاقات نہ ہوتی تو وہ اس سے صاف، صاف کہہ دیتا کہ محبت کرنے کا حق صرف تم کو ہی کیوں ہے۔ مجھے کیوں نہیں۔ میرے ایسے اور نوجوانوں کو کیوں نہیں۔ کیا میرے سینے میں ایک دل ہے اور تمہارے سینے میں بہت سے۔ اس لئے کہ تمہارے پرکھوں میں سے کسی نے ۱۸۵۷ کے غدر میں انگریزوں سے وفاداری کر کے جاگیر پائی تھی اور جس کے نتیجہ میں تم ایک شاندار بنگلہ میں ٹھاٹھ باٹھ سے رہتے ہو۔ اپنی جاگیر میں بسنے والے محنت کش کسانوں کی محنت پر عیش کرتے پھرتے ہو۔ نت نئی لڑکیوں سے فلرٹ کرتے پھرتے ہو۔

کمودنی نے اس کی جھنجھلاہٹ کا اندازہ لگا لیا تھا۔ اس نے بات کا رُخ بدلنے کے لئے تھیلے میں سے کتابیں

نکال کر دیکھنا شروع کر دیں۔ کمودنی کے علاوہ اور لڑکیوں نے بھی کتابیں خریدیں اور ایک لڑکی نے تو کچھ زیادہ ہی دلچسپی کا اظہار کیا۔ کہنے لگی۔

"ہو سکے تو کبھی ہمارے یہاں آیئے۔ کچھ ڈسکس کرنے کا ارادہ ہے۔"

مگر رندھیر نے انکار کر دیا۔ "ڈسکشن کے لئے میں آپ کو وقت نہ دے سکوں گا۔ اس لئے کہ مجھے اور جو کام کرنا پڑتے ہیں وہ زیادہ ضروری ہیں۔"

بلراج زور سے ہنس دیا۔ "کیا غلطی کرتے ہیں آپ۔ کمودنی کو تو آپ نے کامریڈ بنا ہی دیا۔ انہوں نے کیا خطا کی ہے۔ اس میں تو آپکی پارٹی کا فائدہ ہی ہے۔ کیا آپ اپنی طاقت بڑھانا نہیں چاہتے؟"

"میں نے کسی کو کامریڈ نہیں بنایا۔ ان کو یا آپ کو کمیونسٹ بنانے کی کوشش شروع کی جائے تو انقلاب صدیوں تک نہ آسکے گا۔ آپ یا آپ کی کلاس کے لوگ تو ہماری راہ میں رکاوٹ ہی ڈال سکتے ہیں۔ قوت نہیں پہنچا سکتے۔"

بلراج اس کی بات پر بھنا گیا۔ کہنے لگا۔ "آپ تو خواہ مخواہ سوپیریارٹی کامپلکس کا اظہار کر رہے ہیں۔"

رندھیر نے تیزی سے کہا۔ "میں کسی کامپلکس کا اظہار نہیں کر رہا ہوں۔ اس لئے کہ مجھ میں کوئی کامپلکس نہیں۔ پانی وہیں زیادہ گندہ ہوتا ہے جہاں اسے نکلنے کا راستہ نہ ملے۔ بہتی دھارا تو پوتر ہوتی ہے۔ آپ تو میرا خیال ہے۔ کہ گنگا جل ہی پیتے ہوں گے۔"

اس بات پر سب ہنسنے لگے۔ بلراج کھسیانا ہو گیا۔ رندھیر نے سوچا کہ کہیں بات اور زیادہ تلخ نہ ہو جائے۔ لہٰذا اس نے وہاں سے کھسک جانا ہی مناسب سمجھا۔ اس نے اپنا تھیلا سنبھالا۔ اٹھا اور باہر چلا گیا۔

رندھیر ایک مدت تک کمودنی کی کوٹھی پر نہ جا سکا۔ اس لئے کہ اس کے کتنے ہی ساتھی گرفتار ہو کر جیل جا چکے تھے۔ اس کی مصروفیات بہت بڑھ گئی تھیں۔ اگر کبھی فنڈ جمع کرنا ہوتا یا لٹریچر بیچنا ہوتا تو وہ کمودنی کے یا کسی عام طور پر کامریڈ فرید کو بھیج دیتا۔ انہی دنوں کلکتہ میں کسان عورتوں کے جلوس پر فائرنگ ہوئی اور اس فائرنگ کے خلاف کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے احتجاجی جلوس نکالا گیا، جس میں رندھیر بھی شریک تھا۔ لیکن سرکار کی نظر میں کلکتہ کی فائرنگ جائز تھی۔ اس لئے یہ جلوس ناجائز تھا۔ اس طرح امن عامہ کے درہم برہم ہو جانے کا خطرہ تھا۔ فساد ہو جانے کا ڈر تھا اور یہ بات غلط بھی نہ تھی۔ کانپور میں اسی دن ہندو مسلم فساد شروع

ہوا تھا جس دن بھگت سنگھ کو پھانسی دی گئی تھی۔ اس دن بھی احتجاج ہوا تھا اور جلوس نکالے گئے تھے جالانکہ یہ برٹش راج کی باتیں ہیں۔ مگر جس ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اس فساد کی تحقیقات کی تھی، آج بھی موجود تھا۔ اور ترقی کر کے کمشنر بن چکا تھا۔ لہٰذا وہ خطرہ کا بخوبی اندازہ لگا سکتا تھا۔ اس نے سختی سے کام لینے کا حکم دیا۔ اور اس حکم پر عمل درآمد کرانے کے لئے پولس سے جلوس پر لاٹھی چارج کرایا گیا۔ اور یہ لاٹھی چارج اس وقت تک ہوتا رہا جب تک جلوس منتشر نہ ہو گیا۔ اور کلکتہ کی فائرنگ کے خلاف نعرے لگانے والے زخموں سے نڈھال ہو کر اس سڑک پر نہ گر گئے، جس کا گذشتہ نام لارنس روڈ تھا۔ اور اب گاندھی مارگ ہو گیا تھا۔ ان زخمیوں میں رندھیر بھی تھا۔ جسے بے ہوشی کی حالت میں اسپتال پہنچا دیا گیا۔

مہینہ بھر ہسپتال میں رہنے کے بعد جب رندھیر باہر نکلا تو اس کی ایک آنکھ پھوٹ چکی تھی۔ لاٹھی چارج نے اس کے چہرے پر اپنی یادگار چھوڑ دی تھی۔ ہر یادگار کی ایک اہمیت ہوتی ہے۔ اور اس اہمیت کے ساتھ ایک داستان بھی وابستہ ہوتی ہے۔ یوں تو ہر معزز شہری کی موت پر اس کی یادگار قائم کی جاتی ہے، جہاں اس کی خوبیوں کو پتھر کے کتبہ پر کھدوا کر نصب کر دیا جاتا ہے۔ پھر یہ کتبہ دھندلا جاتا ہے۔ یادگار ویران مقبرے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جس کی کہنہ محرابوں پر چمگادڑ بسیرا کرنے لگتے ہیں۔ اسی طرح چانگ پیچنگ نے بھی اپنی ایک داشتہ کی بے وفائی کی یادگار کے طور پر ایک اہرام بنوایا تھا جو زیچیون کی لاکھوں عورتوں کے کٹے ہوئے پیروں سے تعمیر ہوا تھا۔ اس لئے کہ اس کی داشتہ کے پیر بہت خوبصورت تھے۔ چانگ پیچنگ مر گیا۔ اس کا بنوایا ہوا اہرام مٹ گیا۔ لیکن صدیاں گزرنے پر بھی چین کی تاریخ ایک شہنشاہ کے ظلم کی یادگار کو بھول نہ سکی۔ وہ یادگاریں بڑی مقدس ہیں، جو ظلم کی داستانوں کو برابر دہراتی رہیں۔ ایسی یادگاریں کبھی فراموش نہیں ہوتیں۔

رندھیر کو اپنی آنکھ کے ضائع ہونے کا اتنا غم نہ تھا اور نہ اپنے چہرے کے بدنما ہو جانے کا اتنا دکھ تھا جتنا صدمہ اسے یہ سن کر ہوا کہ اس کے پتا کا دہانت ہو گیا۔ وہ اسپتال میں زخموں کی تکلیف سے تڑپتا رہا اور گھر پر اس کا باپ موت کے انتظار میں کروٹیں بدلتا رہا۔ اسی دن دوپہر کی ٹرین سے وہ گھر پہنچ گیا۔

رات ہو چکی تھی اور تنگ کمروں والے مکان پر ہولناک ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ جس جگہ اس کا باپ مرا تھا وہاں ایک چراغ جل رہا تھا۔ اس کے قریب ہی اس کی ماں خاموش بیٹھی تھی۔ اسکی بہن اور دونوں چھوٹے

بھائی بلک بلک کر رو رہے تھے۔ ان دھندلے سایوں کے درمیان رندھیر بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا کہ یہ صرف ایک پتی ہی کی موت نہیں ہے۔ یہ صرف ایک باپ ہی کی موت نہیں ہے بلکہ یہ تریسٹھ روپئے مہینہ پنشن پانے والے سول کورٹ کے ایک اہلمد کی بھی موت ہے جو ان اداس چہروں سے بچھڑ گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی تریسٹھ روپئے ماہوار کی آمدنی بھی بچھڑ گئی۔

وہ ہفتہ بھر تک گھر پر رہا اور اس ہفتہ بھر میں اس نے دیکھا کہ اس کا باپ ترکہ میں ودھوا ماں اور انا تھ بہن بھائیوں کے علاوہ کچھ ایسے لوگوں کو بھی اس کا منتظر چھوڑ گیا ہے جنہوں نے اس کے پہنچتے ہی ہمدردی کے ساتھ ساتھ دبی زبان سے اپنا قرض ادھار بتانا بھی شروع کر دیا۔ اس قرض ادھار سے سول کورٹ کے ریٹائرڈ اہلمد نے جوا کھیلا تھا۔ موت سے بچنے کے لئے، تریسٹھ روپئے ماہوار کی پنشن کو برقرار رکھنے کے لئے۔ ایک خاندان کی سرپرستی کے لئے۔ لیکن جواری ہار گیا۔ اور رندھیر پر اچانک طرح طرح کی پریشانیوں نے یلغار کر دی۔ مگر ماں اسے پریشان اور دل گرفتہ نہ دیکھ سکی۔ اس نے وہ بھومر بھی اس کے سامنے ڈال دیا جو اس کی بہن بیلا کے جہیز کے لئے رہ گیا تھا۔ اس کی بہن نے کالج جانا چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ آئندہ برس پرائیویٹ امتحان دینے کا ارادہ رکھتی تھی۔ ایک ہفتہ وہ اپنے گھر پر نہیں رہا بلکہ ویدوں کے بتائے ہوئے نرک میں رہا۔

جب وہ گھر سے چلنے لگا تو بیلا خاموشی سے اس کے پاس آئی۔ اپنا ہاتھ اس کے سامنے کر دیا جس میں سات روپئے اور کچھ ریزگاری دبی تھی۔ رندھیر حیرت سے چونک پڑا۔ گھبرا کر بولا۔

"بیلا یہ کیا ہے؟"

بیلا نے مسکرا کر کہا۔ "تمہیں خرچہ کے لئے ضرورت پڑے گی۔ اسے رکھ لو۔"

رندھیر سوچنے لگا کہ بیلا نے اسے یہ سات روپئے نہیں دیئے ہیں۔ محبت نہیں برتی ہے، بلکہ اس کے منہ پر طمانچہ مارا ہے۔ اس نے جلدی سے اس کا ہاتھ پیچھے ہٹا دیا۔ گھبرا کر بولا۔

"نہیں مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ تم اسے اپنے پاس ہی رکھ لو۔"

بیلا اس کو خاموشی سے گھورتی رہی۔ پھر اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اور آنسو ٹپک ٹپک کر رخساروں پر ڈھلکنے لگے۔ رندھیر اسے اس طرح روتے ہوئے نہ دیکھ سکا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ بھی رونے لگے۔ اس نے بھرائی

ہوئی آواز میں پوچھا۔

"تم اتنا برا کیوں مان گئیں۔ تم اس طرح مت رُو۔ مجھے بڑا دکھ پہنچ رہا ہے۔"

بیلا نے اس کی جیب میں روپئے ڈال دیئے اور آہستہ آہستہ کہنے لگی۔ "تم انھیں اپنے پاس رہنے دو۔ یہی میری اچھا ہے۔ اتنے دن بعد تو آئے ہو۔ نہ جانے کب آنا ہو۔ میری ایک ہی بات مان لو۔ میں تمھاری بہن ہی تو ہوں۔ کوئی غیر تو نہیں۔"

رندھیر اب انکار نہ کر سکا۔ بیلا کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "لیکن یہ بات تمھیں بتانا پڑے گی۔ یہی کہ یہ روپئے تم نے کس لئے اکٹھے کئے تھے۔ سچ سچ بتانا جھوٹ نہیں۔"

بیلا نے بتایا۔ "نئی دھوتی خریدنے کے لئے۔ لیکن ابھی تو میری پہلے کی دھوتیاں اور ساڑھیاں بالکل ٹھیک ہیں۔ ان سے کام چل سکتا ہے۔"

رندھیر زبردستی ہنسنے لگا۔ "اچھا بھئی ہم نے تمھارے روپئے لے لئے اور یہ بھی طے رہا کہ تمھیں نئی ساری ملے گی۔" دونوں بہن بھائی ہنسنے لگے۔

لیکن گھر سے واپس آنے کے بعد پارٹی میں کام کرتے کرتے کبھی کبھی اسے یہ بھی محسوس ہوتا کہ محنت کش عوام کے دکھ درد کے ساتھ ساتھ اس سے ایک ماں کی ممتا بھی وابستہ ہے۔ ایک بہن کا پیار بھی وابستہ ہے۔ ایک بے سہارا خاندان کی پرورش بھی وابستہ ہے۔ آخر اس نے رات کے وقت ایک معمولی سے اخبار میں کام کرنا بھی شروع کر دیا، جس سے اُسے پچاس روپئے مہینہ ملنے لگا۔ لیکن اس شب بیداری سے اس کی تندرستی بگڑنے لگی۔ وہ پھر بیمار پڑ گیا۔ انھی دنوں ایک روز ڈاکٹر کے مطب سے لوٹتے ہوئے راستہ میں اس کی کمودنی سے ملاقات ہو گئی۔ وہ اس کی چھوٹی ہوئی آنکھ دیکھتے ہی ایک دم گھبرا گئی۔

"ارے یہ آپ کی آنکھ میں کیا ہو گیا۔ کوئی ایکسیڈنٹ ہو گیا کیا؟"

رندھیر ہنسنے لگا۔ "جی نہیں۔ پچھلے مہینے پولیس نے جو لاٹھی چارج کیا تھا۔ اس میں یہ آنکھ جاتی رہی۔"

اس نے چاہا کہ بات کا رُخ بدل دے۔ "کہئے! اخبار آپ کے پاس پہنچ جاتا ہے اور جو ادھر نیا لٹریچر آیا ہے، وہ بھی آپ نے دیکھا؟"

مگر کمودنی کسی اور موضوع پر بات کرنا نہ چاہتی تھی۔ "جی ہاں! کامریڈ فرید مجھے اخبار پہنچا جاتے ہیں۔ اور لٹریچر بھی۔" اس نے نظر بھر کر رندھیر کی بینائی سے محروم دھنسی ہوئی آنکھ کی جانب دیکھا۔ "مگر یہ آپ کے ساتھ بہت ظلم ہوا۔ بہت بُرا ہوا۔"

رندھیر کہنے لگا۔ "ایسی بات نہیں ہے۔ یہ تو لاٹھی چارج کا ایک نشان ہے۔ اور مجھے اس سے اتنا ہی پیار ہے۔ جتنا ماں کو اپنی ناجائز اولاد سے ہوتا ہے۔ یہ تو مجھے پولیس کے ظلم کو برابر یاد دلاتا رہے گا۔ مجھ میں وہ وشواس پیدا کرے گا جو پھانسی کے سائے میں بھی جولیس فیوچک سے جدا نہ ہوا۔ اس لئے کہ ظلم اسی وقت بڑھتا ہے جب جنتا کی طاقت پورے زور شور سے ابھرتی ہے۔ اگر میری آنکھ کسی اکسیڈنٹ میں چلی جاتی تو یقیناً بُرا ہوتا۔ اور مجھے واقعی دُکھ ہوتا۔" کمودنی خاموش کھڑی ہوئی اس کی دھنسی ہوئی آنکھ دیکھتی رہی۔ جس نے اس کے چہرے کو خاصا بدنما بنا دیا تھا۔ رندھیر تیزی سے بولتا رہا اور وہ سوچتی رہی کہ جو شخص دوسروں کے دُکھ درد کے لئے اس قدر ظلم سہنے کے باوجود ہراساں نہیں ہو سکتا، وہ پرلوک سے آیا ہوا کوئی دیوتا ہی ہو سکتا ہے۔

لیکن جب رندھیر زور زور سے کھانسنے لگا تو کمودنی نے غور کیا کہ وہ بیمار نظر آ رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر کہا۔ "آپ کی طبیعت بھی تو خراب معلوم ہوتی ہے۔"

"ہاں خراب تو ہے۔ میں ابھی ڈاکٹر ہی کے پاس سے آ رہا ہوں۔"

کمودنی نے اصرار کیا کہ وہ کچھ دن اس کی کوٹھی پر آرام کر لے وہاں باقاعدہ علاج بھی ہو سکے گا۔ اور دیکھ بھال بھی ہو سکے گی۔ رندھیر نے سوچا کہ جلد ہی تندرست ہو جانے کے لئے کمودنی کی کوٹھی پر علاج ٹھیک سے ہو جائے گا۔ بیماری سے وہ جلد سے جلد نجات پا لینا چاہتا تھا۔ یہ بیماری اس کے لئے جنجال تھی۔ مصیبت تھی۔ اس طرح اس کے سرگرمیوں میں بڑی رکاوٹ پیدا ہو گئی تھی۔ دوسرے روز وہ پارٹی کی اجازت سے کمودنی کی کوٹھی میں منتقل ہو گیا۔

کمودنی کی اس خوبصورت کوٹھی کے آراستہ کمروں میں الف لیلائی شبستانوں کی طرح سبکسار خوابوں کا ہلکا دھندلکا چھایا رہتا تھا۔ جہاں سرسراتے ریشمی پردوں سے ہوائیں گنگناتی ہوئی گزرتی تھیں۔ جہاں جھلکتے ہوئے دریچوں پر دھوپ کے سنہری عکس مچلتے تھے اور جہاں خانساماں اور بیرے اشاروں پر چلتے تھے۔ اس فضا میں، اس ماحول میں بیمار رندھیر نرم، نرم بستر پر پڑا سوچا کرتا کہ ویدوں میں جس سورگ کا ذکر ہے، وہ

یہی کوٹھی ہے۔ اور یہ سورگ ایک لڑکی کے لئے مہیا کی گئی ہے، جو اکتائی ہوئی رہتی ہے۔ تھکی ہوئی رہتی ہے۔ اور اداس رہتی ہے۔ اس لئے کہ اس کے سامنے ہر خواہش دست بستہ کھڑی ہے۔ جس کے سامنے ہر آرزو سرنگوں ہے۔ ایک انسان، صرف ایک انسان کے لئے اتنا ساز و سامان۔ پھر اس کے سامنے مزدوروں کی بستیاں آجاتیں، سڑتی ہوئی تنگ و تاریک گلیاں۔ کالی کالی دیواروں والے چھوٹے چھوٹے مکان اور کوارٹر۔ اندھیری کوٹھریاں، جن میں گندگی کے عادی لوگ بستے ہیں، بدصورت عورتیں رہتی ہیں۔ مریل بچے جنم لیتے ہیں۔ یہ مزدوروں کی بستیاں ہیں۔ جو محنت بیچتے ہیں، جو محنت کے لئے زندہ رہتے ہیں۔ جو خوشی کے لئے ترستے ہیں۔ روشنی اور تازہ ہوا کے لئے ترستے ہیں۔ اتنا بڑا فرق۔ اتنی بڑی خلیج، پھر یہ سماج قابلِ نفرت کیوں نہیں۔ یہ نظام قابلِ نفرت کیوں نہیں اور یہ نفرت ایک مقدس جذبہ ہے۔ جو اس نفرت کو مقدس نہیں سمجھتے۔ وہ بے رحم ہیں۔ سفاک ہیں۔ خود غرض ہیں۔ اندھے ہیں۔ رندھیر کی نفرت کا یہ احساس اور بھی شدید ہو گیا۔ ایک روز کمودنی کے لئے آئے ہوئے ایک بل پر اس کی نظر پڑ گئی۔ جو ڈرائنگ روم کی نئی آرائش کے لئے تھا۔ اس لئے کہ اس کا فرنیچر ذرا ماڈرن نہیں رہا تھا۔ اور کمرے کی ترتیب و تزئین میں کوئی ندرت نہیں رہی تھی۔ اس نئے فرنیچر پر، نئے ریشمی پردوں پر نئے رنگ و روغن پر بیس ہزار سے زیادہ روپے خرچ ہوئے تھے۔ رندھیر کا دل چاہا کہ وہ اس بل کو پھاڑ کر مسل ڈالے۔ فرنیچر کو توڑ پھوڑ ڈالے اور اس کوٹھی میں آگ لگا کر بھاگ جائے۔ ورنہ وہ پاگل ہو جائے گا۔ دیوانہ ہو جائے گا۔

اسی وقت کمودنی آگئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے اپنے ہاتھ سے دوائی پلائی۔ تھرمامیٹر سے ٹمپریچر لیا۔ چارٹ پر اسے درج کیا اور ٹیلی فون اٹھا کر ڈاکٹر کو رپورٹ بتانے لگی۔ اس تیمارداری اور دیکھ بھال میں صرف ہیرو ورشپ کا جذبہ کارفرما تھا۔ اور کچھ نہیں۔ ایک ایسی عقیدت جو ڈان ژوان کے ہیرو ایرول فلائین کا آٹوگراف لیتے ہوئے اسے محسوس ہوئی تھی۔ ایک ایسا فخر جو ٹینس چمپئن غوث محمد کے ساتھ فوٹو کھینچواتے وقت اسے محسوس ہوا تھا۔ ایک ایسی خوشی جو کوی سمترانندن پنت کو اپنی کوٹھی پر ڈنر دیتے وقت محسوس ہوئی تھی۔ اور رندھیر تو پرلوک سے اترا ہوا دیوتا تھا جو دکھ کے مارے ہوئے انسانوں کے ظلم سہہ رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔

رندھیر نرم اور شفاف بستر پر لیٹا رہتا۔ ریشمی پردوں میں ہوائیں گنگناتی رہتیں۔ دھوپ کی سنہری کرنیں

جھلملاتی رہتیں اور دریچوں پر جھولتی ہوئی چنبیلی کی شاخیں مہکتی رہتیں۔ کمرے میں الف لیلائی شبستانوں کی طرح سبکسار خوابوں کا دھندلکا چھایا رہتا۔ وہ یہ سب کچھ دیکھتا رہتا۔ کمودنی کو دیکھتا رہتا، جو خوبصورت تھی، خوش پوش اور خوش ادا تھی اور اس کی دیکھ بھال میں سرگرمی کے ساتھ ساتھ مسرت کا بھی مظاہرہ کرتی تھی۔

اس سہانی شام کو جب باہر درختوں میں ہوا سرسراتی ہوئی چل رہی تھی۔ ریڈیو پر آہستہ آہستہ دائلن بج رہا تھا۔ کمودنی کسی تقریب میں جانے کے لئے تیار ہو رہی تھی۔ بہت دیر سے وہ لباس کا انتخاب کر رہی تھی۔ مگر اس کی پسند کو قرار نہیں تھا۔ کبھی ایک ساڑھی اٹھاتی، کبھی دوسری۔ آخر اس نے بہت سی خوش رنگ اور چمکتی دمکتی ساڑھیاں اس کے سامنے لاکر ڈال دیں۔ مسکرا کر بولی۔

"میری تو سمجھ میں نہیں آرہا۔ آج آپ ہی سلیکٹ کر دیجئے۔"

رندھیر کو اس کے لئے لباس کا انتخاب کرنا ہی پڑا۔ کمودنی لباس تبدیل کر کے اس کے سامنے آئی۔ وہ اس لباس میں دلکش اور دل آرا نظر آرہی تھی۔ رندھیر نے اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ زبان سے کچھ نہ کہا۔ خاموش لیٹا رہا۔ وہ مسکراتی ہوئی باہر چلی گئی۔

رندھیر کو لیٹے ہی لیٹے خیال آگیا کہ کمودنی اپنے لباس کا انتخاب نہیں کر سکتی ہے۔ اس لئے کہ اس کے پاس اعلیٰ درجے کی کتنی ہی ساڑھیاں ہیں اور بیلا کی سب دھوتیاں پھٹ چکی ہیں۔ وہ ڈیڑھ سات روپے مہینوں تک جمع کرنے کے بعد بھی نئی دھوتی نہ خرید سکی اور یہ مہینوں تک جمع کئے ہوئے روپے، نئی دھوتی کی خواہش، اس نے بھائی کی تکلیف کے لئے سب کچھ نچھاور کر دیا اور اس کا بھائی اس کے لئے نئی ساڑھیاں نہ خرید سکا۔ اس کے جہیز کا جھومر قرضخواہوں کی نذر ہو گیا۔ اس ذہنی اذیت سے وہ کانپ اٹھا۔ کیا اس کی بہن اسی طرح نئی دھوتی کے لئے تڑپتی رہے گی۔؟ کیا اس کی ماں کا چہرہ اسی طرح مرجھایا رہے گا؟ کیا اس کے دونوں بھائی اسی طرح بلکتے رہیں گے؟ ان اچانک سوالوں سے وہ گھبرا گیا۔ بدحواس ہو گیا۔

کیلنڈر پہ تاریخیں بدلتی رہیں، ہواؤں کے رُخ بدلتے رہے اور رندھیر نرم اور شفاف بستر پہ لیٹا آرام کرتا رہا۔ اس کی صحت اب بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اس خوبصورت کوٹھی سے مانوس ہوتا جا رہا تھا۔ گنجان جنگلوں میں بسنے والے اس درندے کی طرح جو آہنی کٹہروں میں رہنے کا عادی ہو ہی جاتا ہے۔ کمودنی اس کی دیکھ بھال

میں اسی طرح مستعدی برتتی رہی۔

ایک سہ پہر کو جب وہ نڈھال اور افسردہ لیٹا ہوا تھا کمودنی اس کے پاس آئی۔ اس نے رندھیر کو اداس دیکھ کر پیانو بجانا شروع کر دیا۔ پیانو سے نغمے پھوٹتے رہے۔ کمرہ کی فضا ان جھنکاروں میں سحر زدہ سی ہوتی گئی۔ ان نغموں میں رندھیر کو کمودنی کوئی مقدس دیو داسی معلوم ہونے لگی۔ بسکسار خوابوں سے ڈھکا ہوا کمرہ اجنتا کا کوئی غار معلوم ہونے لگا۔ اچانک یہ فضا، یہ سحر، یہ خواب درہم برہم ہو گئے۔ کمرے میں کیپٹن شیام حسب معمول بے تکلفی سے قہقہے لگاتا ہوا داخل ہوا۔ کمودنی اس کے ساتھ ہنستی مسکراتی چلی گئی۔ حالانکہ رندھیر چاہتا تھا کہ وہ نہ جائے۔ وہ اسی طرح پیانو پر نغموں کے جادو جگاتی رہے۔ اس کا چہرہ مقدس دیو داسیوں کی طرح جھلکتا رہے۔ لیکن وہ کیپٹن شیام کے ساتھ چلی گئی۔ اس لئے کہ وہ کیپٹن شیام تھا اور رندھیر صرف رندھیر تھا۔ رندھیر غور کرنے لگا کہ گذشتہ جنگ میں اگر وہ کوشش کرتا تو کمیشن پا سکتا تھا۔ اور آج اس کے شانوں پر بھی سنہرے اسٹار جھلکتے ہوتے اور کمودنی اس طرح اس کے پاس سے اُٹھ کر چلی نہ جاتی۔ اسی وقت جب وہ دل گرفتہ اور جھنجھلایا ہوا لیٹا تھا کہ مرلی آ گیا۔ مرلی جو ٹیکسٹائل مل میں مزدور تھا اور جو یونین کا بڑا جوشیلا ورکر تھا۔ وہ اس کی عیادت کے لئے آیا تھا۔

مرلی نے ذرا دیر تک تو کمرے کو احمقوں کی طرح گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ پھر صوفہ پہ آلتی پالتی مار کر اطمینان سے بیٹھ گیا اور رندھیر سے کہنے لگا۔ "کمرہ تو بڑے ٹھاٹھ کا ہے۔ ایسا تو سالے اپنے مینجنگ ڈائرکٹر کے پاس بھی نہیں۔"

مگر رندھیر نے اس کی بات پر توجہ نہ دی۔ پوچھنے لگا۔ "یونین کا کیا حال ہے؟"

مرلی گردن ہلا کر بولا۔ "سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ بس آج کل وہ سالا مینجر بہت خار کھائے ہوئے ہے۔ یوں آنکھ ٹیڑھی کر کے دیکھتا ہے جیسے میں نے اس کی جورو بھگا لی ہے۔ اپنا تو جی چاہتا ہے کہ ایک دن سالے کے سامنے تان ماردوں۔" اور مرلی بھونڈی آواز سے گانے لگا۔

"ہمیں مار گئی رے تیری نجریا، بانکی نجریا۔ مار گئی رے!"

رندھیر نے اسے جھٹ خاموش کرا دیا۔ اتنے میں گردھر کمرے کے اندر آ گیا۔ شاید وہ شور سن کر آیا تھا۔

کہنے لگا۔

"چائے لے آؤں؟"

مُرلی فوراً بول اٹھا۔

"جھٹ پٹ لے آؤ۔ خوب اسٹرانگ ہو اور چینی بھی ذرا اچھی طرح ڈالنا۔"

اس نے گردھر سے بالکل اسی طرح کہا تھا جس طرح وہ رندھیر کے ساتھ کارخانہ کے سامنے والے ٹی اسٹال میں بیٹھ کر آرڈر دیا کرتا تھا۔

رندھیر نے بھی کہدیا۔ "ہاں چائے لے آؤ۔"

گردھر چلا گیا۔ رندھیر کو اس قدر خفت محسوس ہوئی کہ وہ جھنجھلا گیا۔ لیکن مرلی نے اس کی جھنجھلاہٹ پر غور نہیں کیا۔ جھٹ جیب سے بیڑی کا بنڈل نکالا اور ایک بیڑی سُلگا کر بنڈل رندھیر کی طرف بڑھا دیا۔

"لو کامریڈ۔ اصلی لال تاگہ ہے۔ ایک کش لگا لو۔ طبیعت مست ہو جائے گی۔"

مگر رندھیر نے انکار کر دیا۔ حالانکہ وہ اکثر مرلی سے بیڑی مانگ کر پیتا رہتا تھا۔

مرلی دیر تک رندھیر کے پاس بیٹھا رہا اور اسکا دل بہلانے کے لئے ہنس، ہنس کے باتیں کرتا رہا۔ جب وہ چلا گیا تو رندھیر نے غور کیا کہ مرلی جس صوفہ پر بیٹھا تھا۔ اس پر مرلی کے تیل کے داغوں سے بھرے ہوئے گندے کپڑوں سے بھورے بھورے دھبے پڑ گئے تھے۔ صوفہ ابھی ابھی خریدا گیا تھا۔ رندھیر نے سوچا یہ تو بہت بُرا ہوا۔ وہ دیر تک لیٹا ہوا مرلی پر جھنجھلاتا رہا۔

ڈیڑھ ماہ بعد جب کوٹھی سے باہر آیا تو اسے خود اپنے وجود میں تبدیلیاں محسوس ہوئیں۔ وہ اب بھی مزدوروں کی بستیوں میں جاتا۔ کارخانوں کے پھاٹکوں پر مزدوروں کی میٹنگیں کرتا مگر گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں اس کو اپنا چہرہ جھلستا ہوا معلوم ہوتا۔ لو کے بگولوں میں اس کا جسم پگھلنے لگتا۔ انہی دنوں میرٹھ سے اس کا ایک دوست آ گیا۔ وہ راشننگ کے محکمہ میں ملازم تھا۔ اس نے بلیک مارکیٹ کرنے والوں سے رشوت لے کر تگڑی کمائی کی تھی۔ وہ رندھیر کو ایک شاندار ریستوراں میں لے گیا۔ جس کی فضا ٹھنڈی اور فرحت بخش تھی۔ رندھیر اس کے ساتھ بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ قہقہے لگاتا رہا۔ کھاتا پیتا رہا۔

رندھیر شام تک ریستوراں میں بیٹھا رہا اور دوپہر کو کارخانہ کے گیٹ پر ہونے والی میٹنگ میں نہ جا سکا۔ اس لاپروائی پر دوسرے روز جب وہ مزدوروں میں گیا تو یونین کے ورکرز نے احتجاج کیا۔

"کامریڈ کل سارے مزدور تمھارا انتظار کرتے رہے۔"

"تمھارے نہ آنے سے کتنے ہی مزدور ناراض ہو گئے۔"

"میٹنگ نہ ہونے سے ہڑتال کی بات پھر رہ گئی۔"

رندھیر چپ چاپ ان کی باتیں سنتا رہا۔ لیکن جب گردھاری نے طنزیہ لہجے میں کہا "سنا ہے کہ کامریڈ رندھیر تو ہوٹل ڈی لکس میں بیٹھے عیش کر رہے تھے۔ کارخانے کے گیٹ پر ہونے والی میٹنگ میں بھلا وہ کیسے آتے۔" تو رندھیر جھنجھلا گیا۔ حالانکہ گردھاری سے کبھی کبھار اس کا ہنسی مذاق بھی ہو جاتا تھا۔ گردھاری جتنا دھاکڑ ورکر تھا۔ اسی قدر ہنس مکھ بھی تھا۔ رندھیر نے ضبط سے کام لیا۔ مگر وہاں سے واپس آنے کے بعد اس کی جھنجھلاہٹ اور بڑھ گئی تھی۔ اس کی پٹی بورژوا عزت نفس کو سخت ٹھیس پہنچی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ان مزدوروں کے لئے اس چلچلاتی دھوپ میں، اس جھلسا دینے والی گرم، گرم لو میں وہ کئی میل پیدل چل کر آتا ہے۔ مینجر کے غنڈوں کی گالیاں اور دھمکیاں سنتا ہے اور ایک روز میٹنگ میں نہ پہنچنے پر وہ اس طرح جلی کٹی سنا رہے تھے جیسے وہ ان کا ملازم ہے۔ وہ اپنی تنخواہ سے ہر مہینے صرف آٹھ، آٹھ آنے ہی تو دیتے ہیں۔ اور وہ بھی یونین کے فنڈ کے لئے، اسے تو کچھ نہیں دیتے۔ یہ اس کے ساتھ سراسر زیادتی ہے دھونس اور دھاندلی ہے۔

اب رندھیر اکثر پارٹی کے کاموں سے کترانے لگا تھا۔ غیر ذمہ داری اور لاابالی پن کا مظاہرہ کرتا۔ اس کے وجود میں جو تیز آنچ دہک رہی تھی وہ جیسے دھیمی پڑتی جا رہی تھی۔ اسی دوران میں سہارن پور جا کر ریلوے کے مزدوروں میں کام کرنے کے لئے پارٹی کی جانب سے ہدایت ملی۔ وہ دو اور کامریڈوں کے ساتھ سہارنپور چلا گیا۔ یہاں اسے ایک مزدور کے ساتھ رہنا پڑا۔ اس لئے کہ یہاں باقاعدہ پارٹی آفس نہ تھا۔ وہ ایک آرگینائزر کی حیثیت سے وہاں گیا تھا۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد دونوں کامریڈوں کو واپس بلا لیا گیا۔ وہ تنہا رہ گیا۔ دن بھر تنگ و تاریک کوٹھری میں پڑا رہتا اور رات کو مزدوروں میں جا کر پارٹی کا کام کرتا۔ ریلوے ورکرز نے اس سے تعاون کرنا شروع کر دیا تھا۔ ایک چھوٹی سی یونین قائم ہو چکی تھی۔ لیکن وہ خود اکتایا ہوا اور بے زار، بے زار سا رہتا۔ دن رات تاریک

کوٹھڑی میں پڑے پڑے اس کا دم گھبرا جاتا۔ پارٹی کا جو لٹریچر وہ ساتھ لے گیا تھا، اسے پڑھنے میں دل نہ لگتا۔ حالانکہ مزدور رات کو اس کی کوٹھڑی میں اکٹھا ہو جاتے۔ پھر باتیں ہوتیں ورکس مینجر کی۔ فورمین کی۔ مستریوں کی، خراب راشن کی، الاؤنسز کی اور ان باتوں کے ساتھ ساتھ کبھی کبھار ہنسی دل لگی بھی ہو جاتی پھر زور دار قہقہے لگتے۔ لیکن رندھیر کو چراغ کی مدھم روشنی میں بیٹھے ہوئے لوگ پرچھائیوں کے جال کی طرح دھندلے دھندلے نظر آتے۔ کوٹھڑی اُسے جیل خانہ معلوم ہوتی۔

پھر ایک روز ایسا ہوا کہ وہ اس کوٹھڑی سے، اس جیل خانے سے چپ چاپ نکل گیا۔ اس غیر ذمہ دارانہ رویّہ پر پارٹی میٹنگ میں اس پر سخت اعتراضات کئے گئے۔ اور وارننگ دیکر اسے پھر سہارن پور جانے کی ہدایت کی گئی۔ مگر اس نے وہاں جانے سے صاف انکار کر دیا۔ اس لئے کہ وہ تنگ و تاریک کوٹھڑی میں رہنا نہ چاہتا تھا۔ وہاں اس کا دل گھبراتا تھا۔ وحشت ہوتی تھی۔ یہ پارٹی کے ضابطوں کی کھلی خلاف ورزی تھی، لہٰذا اسے پارٹی کی رکنیت سے علیحدہ کر دیا گیا۔

رندھیر نے شہر میں ایک کمرہ کرائے پر لے لیا اور اس میں بیٹھا، ہوا سوچا کرتا کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا سراسر غلط ہوا۔ اس نے پارٹی کے لئے لاٹھیاں کھائی تھیں۔ زخم کھائے تھے۔ اپنی آنکھ ضائع کی تھی اپنے چہرے کو بدنما بنایا تھا۔ جس پارٹی کے لئے اس نے یہ سب کچھ کیا تھا وہ ذرا سا اس کی مرضی کا بھی خیال نہ کر سکی۔ اس کو اتنا بھی حق نہ دے سکی۔ یہ ڈسپلن نہیں، زبردستی ہے، جبر ہے۔ اور پارٹی کو کسی دن اپنی اس غلطی کا ضرور احساس ہوگا۔ اس لئے کہ اس کے بغیر یونین کا کام ٹھیک طور سے نہیں چل سکے گا۔ مزدور پارٹی کی نہیں اس کی بات مانتے ہیں۔ اس کی عزت کرتے ہیں۔

رندھیر ہارے جواری کی طرح سرگرداں گھومتا رہا اور اپنے کمرے میں پڑا ہوا سوچتا رہا۔ اس نے پھر اخبار میں نوکری کر لی تھی اور کسی بہتر ملازمت کے لئے وزیروں اور صوبائی اسمبلی کے ممبروں کی سفارش حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ گریجویٹ تھا اور اس کا تعلیمی ریکارڈ بھی بہت اچھا رہا تھا۔ لہٰذا وہ اپنے روشن مستقبل کے لئے بہت پُر امید تھا۔

رندھیر میں اور بھی تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ اب وہ صاف ستھرا لباس پہنتا تھا۔ بال قاعدے سے جمے

ہوتے۔ جس پھوٹی ہوئی آنکھ کو وہ پولس کے ظلم کی یادگار قرار دیکر ہمیشہ نمایاں رکھتا تھا۔ اب اُسے چھپانے کے لئے گہرے شیشوں کا چشمہ لگانے لگا تھا۔ اس کے وجود میں چھپا ہوا متوسط طبقے کا وہ نوجوان، جس نے چمکتی دمکتی زندگی کے کبھی سہانے خواب دیکھے تھے، اپنا خول توڑ کر رفتہ رفتہ باہر نکل رہا تھا۔

انھی دنوں کا ذکر ہے کہ رندھیر نے سُنا کہ ٹیکسٹائل مل کے ہڑتالی مزدوروں پر پولس نے اندھا دھند فائرنگ کی ہے۔ کتنے ہی مزدور گھائل ہوئے تھے اور مرلی وہیں دم توڑ چکا تھا۔ مرلی جو بڑا جوشیلا اور سرگرم ورکر تھا۔ مرلی جس نے مل مالک کے غنڈوں کی مار کھائی تھی، مرلی جو کئی بار کارخانے سے نکالے جانے کے باوجود اپنے مقصد سے پیچھے نہ ہٹا تھا۔ آج وہ مرلی پولس کی فائرنگ کا نشانہ بن گیا تھا۔ سرمایہ داروں کی حیوانیت کا شکار بن گیا تھا۔ تمام دن اس پر افسردگی طاری رہی۔ آخر جب کسی طور دل کو قرار آیا تو شام کو وہ مزدوروں کی بستی میں گیا۔ مرلی کے گھر پر سناٹا چھایا تھا۔ جھکی ہوئی کالی کالی چھت کے نیچے کتنے ہی مزدور جمع تھے۔ مرلی کی لاش ابھی ہسپتال سے ملی نہ تھی۔ اس کی بیوی بے ہوش پڑی تھی۔ بوڑھا باپ سر جھکائے بیٹھا تھا۔ تین چھوٹے چھوٹے بچے حیرت سے ایک، ایک کا منہ تک رہے تھے۔ چراغ کی پھیکی، پھیکی روشنی میں ہر طرف سائے لہرا رہے تھے۔ ان لہراتے ہوئے سایوں میں ایک بے سہارا خاندان نظر آ رہا تھا۔ مرلی کی تان ٹوٹ گئی۔ اور ایک بیوہ اور تین اناتھ معصوم بچّوں کے ساتھ ایک بوڑھے باپ کا بھی سہارا چھٹ گیا۔ رندھیر سوچنے لگا۔ کہ یہ مُرلی نہیں مرا ہے۔ باون روپئے ماہوار پانے والا سرپرست مرا ہے۔ ایک تریسٹھ روپئے پنشن پانیوالے ریٹائر اہلمد کی طرح اور اس دُکھ میں، اس صدمہ میں رندھیر کو اپنا غم بھی نظر آتا۔ اپنے گھر والوں کا بھی غم نظر آیا۔

دوسرے دن شہر کی تمام ملوں میں ہڑتال ہو گئی۔ مرلی کی ارتھی دھوم دھام سے اٹھائی گئی۔ اس کی لاش پارٹی کے سُرخ جھنڈے میں لپٹی ہوئی تھی۔ ارتھی کا جلوس سڑکوں پر سے گزر رہا تھا۔ رندھیر مرنے والے ساتھی کا آخری دیدار کرنے کے لئے فٹ پاتھ پر کھڑا ہو کر جلوس کو دیکھتا رہا جس کے ساتھ ساتھ مسلح پولس کی لاریاں بھی چل رہی تھیں۔ مزدور فلک شگاف نعرے لگا رہے تھے۔

"پولس کا ظلم، بھولو مت، بھولو مت"!

"کامریڈ مرلی کا خون، سب کا خون"

"انقلاب زندہ باد، انقلاب زندہ باد"

"کامریڈ مرلی امر ہو"

مرلی سچ مچ امر ہو گیا تھا۔ اس کی ارتھی توپ کے دہانہ پر نہیں "انقلاب زندہ باد" کے نعروں کی گھن گرج کے ساتھ جا رہی تھی۔ اس کی ارتھی کے ساتھ فوجی دستے نہیں مارچ کر رہے تھے۔ صرف مزدور تھے وہ انقلابی جن کے سینے تنے ہوئے تھے۔ جن کے نعروں سے دھرتی دھڑک رہی تھی۔ پولس والوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ خوف زدہ اور سہمے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ رندھیر سوچنے لگا کہ یہ کیسا جلوس ہے کہ ظلم و ستم سہنے والوں کی چھاتیاں اٹھی ہوئی ہیں۔ اور ظلم کرنے والوں کے چہروں پر بدحواسی طاری ہے۔ شاید آج پھر فائرنگ ہوگی۔ آج پھر کتنے ہی مرلی گولیوں کے سامنے دم توڑ دیں گے۔ ایک خاندان نہیں کتنے ہی برباد ہو جائیں گے۔ لیکن اس ظلم کو کچلنے کے لئے، انقلاب لانے کے لئے ایک نہیں کتنے ہی خاندان تباہ ہو جائیں۔ ان کو تباہ ہو جانے دو۔ وہ موت، وہ تباہی جو کروڑوں خاندانوں کی بہتری کے لئے ہو۔ جو ظلم کو کچلنے کے لئے ہو، جو انقلاب کے لئے ہو، ایسی موتیں، ایسی تباہیاں مقدس ہیں۔ قابل پرستش ہیں۔ کامریڈ مرلی تم کبھی نہیں مر سکتے۔ تم ہمیشہ زندہ رہو گے۔ تم امر ہو۔

رندھیر کھڑا ہوا سوچتا رہا اور نعروں کی گونج میں اس کا جسم جوش سے کپکپاتا رہا۔ جلوس آہستہ آہستہ گزر گیا۔ اور رندھیر کھڑا دیکھتا رہا۔ اس کی گردن جھک گئی۔ وہ اس جلوس سے اس انقلابی کاروان سے چھٹ چکا تھا۔ ایک بچھڑا ہوا ساتھی۔ دفعتاً وہ تڑپ کر بے قرار ہو گیا۔ جھنجھلا کر سوچنے لگا۔ ایسا کیوں ہوا، ایسا کیوں ہوا۔ وہ وہاں سے سیدھا کمودنی کی کوٹھی پر پہنچا۔ وہ اس وقت اپنے خوبصورت ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے اخبار پڑا تھا۔ رندھیر کو پریشان دیکھ کر کہنے لگی۔

"بہت دنوں کے بعد آپ آئے۔ اب طبیعت کیسی ہے؟"

رندھیر نے کچھ بھی نہ کہا، صرف ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا۔

اس دفعہ کمودنی مسکرا دی۔ "چپ کیوں ہیں؟" پھر کچھ سوچ کر بولی۔ "کل کی فائرنگ میں ایک مزدور مر گیا

بہت بُرا ہوا۔"

رندھیر ایک دم چونک پڑا۔ "کچھ بھی بُرا نہیں ہوا، وہ مرا نہیں وہ زندہ ہے۔ ایسے لوگ کبھی مرا نہیں کرتے۔ ہاں میں مر گیا ہوں۔ میں نے خودکشی کی ہے۔ میں اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا ہوں۔ پوچھو یہ کیوں ہوا۔" پھر اس کا لہجہ اور تیز ہو گیا۔ "اس لئے کہ میں نے تم سے نفرت کرنا چاہی، تم سے تمہارے ماحول سے تمہارے طبقے سے، مگر میں نفرت نہ کر سکا۔ میں اپنے مقصد سے ہٹ گیا۔" یکایک وہ اٹھا اور دیوانوں کی طرح کمودنی کے دونوں بازو پکڑ کر زور، زور سے جھنجھوڑنے لگا۔ اسے وحشتناک نظروں سے گھورنے لگا۔

کمودنی بدحواس ہو کر مچلنے لگی۔ "چھوڑو۔ مجھے چھوڑ دو، نہیں تو میں چیخ کر سب کو اکٹھا کر لوں گی۔"

رندھیر اسی طرح وحشتناک نظروں سے اسے گھورتا رہا۔ "ضرور چیخو، اتنا چیخو کہ ساری دنیا یہاں اکٹھی ہو جائے۔ پھر لوگ دیکھیں کہ میں کتنا بزدل ہوں، کتنا نکما ہوں، کتنا فرسٹریٹڈ ہوں، چیخو ضرور چیخو تاکہ مجھے میرے پاپ کی سزا مل جائے۔"

اس کی آواز کمرے کے اندر گونجتی رہی اور مرلی کی ارتھی کا جلوس گزرتا رہا۔ جس کے ساتھ مزدور تھے، انقلابی نعرے تھے اور یہ شور، یہ آوازیں شاہراہوں پر گونجتی رہیں، گرجتی رہیں۔

تیسرا آدمی

دونوں ٹرک سُنسان سڑک پر تیزی سے گذر رہے تھے۔

پتمبر پور روڈ، مشرق کی سمت مُڑتے ہی ایک دم نشیب میں چلی گئی تھی، جھکے ہوئے ٹیلوں کے درمیان وہ کسی زخمی پرندے کی مانند ہانپتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ رات اب گہری ہو چکی تھی۔ آغاز سرما کی بھیگی ہوئی ہوا فراٹے بھرتی ہوئی چل رہی تھی۔ دونوں ٹرک کھڑکھڑاتے ہوئے ڈھلوان پر دوڑتے رہے۔ ان کا بے ہنگم شور پتھریلی چٹانوں میں دھڑک رہا تھا۔ ناگاہ اندھیرے میں کسی نے چیخ کر للکارا۔

"ہے کون جا رہا ہے؟ ٹرک روک لو۔"

رات کے سناٹے میں یہ آواز بڑی پُراسرار معلوم ہوئی۔ لیکن ٹرک کے اندر بیٹھے ہوئے لوگوں نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔ وہ بالکل خاموش رہے۔ دونوں ٹرک جھکی ہوئی چٹانوں کی گہرائی میں بدستور تیز رفتار سے دوڑتے رہے۔

"رُکو روک لو ٹرکوں کو۔"

اس دفعہ آواز دُور سے ابھری، اور اس کے ساتھ ہی موٹر سائیکل اسٹارٹ ہونے کی گھڑگھڑاہٹ بھی سنائی دی۔ موٹر سائیکل کی تیز روشنی دھوپ چھاؤں کی طرح ٹرکوں کے پچھلے حصّوں پر رُک، رُک کر لہرانے لگی۔ مگر ٹرک رُک نہیں سکتے۔ یہ خطرے کا الارم تھا۔ ٹرکوں کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ سڑک بالکل ویران تھی اور دونوں ڈرائیور بہت اکسپرٹ تھے۔

موٹر سائیکل کی روشنی ٹرکوں سے قریب ہوتی جارہی تھی، قریب اور قریب، اس کا شور اب ٹرکوں کے بہت نزدیک سنائی دے رہا تھا، لیکن ٹرکوں کی رفتار زیادہ نہیں بڑھ سکتی، ڈھلوان پر انکے بے قابو ہو جانے کا اندیشہ تھا، ڈرائیوروں کے چہروں پر خوف کے سائے پھیلتے جارہے تھے، مگر نیلی آنکھوں والا کیلاش ناتھ وانچو خاموشی سے بیٹھا سگریٹ پیتا رہا۔ وہ ڈرائیور کے برابر اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا اور برابر سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ وقت کم تھا، خطرہ سر پر منڈلا رہا تھا، یکایک اونچے نیچے ٹیلوں کی گہرائی میں گولی چلنے کی آواز بڑے بھیانک انداز میں گونجی۔ گولی ایک ٹرک کے پچھلے پہیوں کے پاس سے سنسناتی ہوئی گذر گئی۔

ایک بار پھر کسی نے اونچی آواز میں ڈپٹ کر للکارا "ٹرکوں کو روک لو، نہیں تو میں ٹائروں کو برسٹ کر دوں گا۔"

اس وارننگ کے ساتھ ہی پختہ سڑک پر ٹائروں کے رگڑنے کی تیز چیخیں ابھریں، دونوں ٹرک ٹھہر گئے، ٹرک کے اندر سے صرف وانچو اتر کر نیچے آیا۔ باہر شوریدہ سر ہوا سرسراتی ہوئی چل رہی تھی، سردی اب بڑھ گئی تھی اور جسم میں چبھتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ وانچو نے اپنے بلے اوور کوٹ کے بڑے بڑے کالروں کو کانوں تک بلند کیا، آگے بڑھا، اور سنبھل، سنبھل کر قدم رکھتا ہوا موٹر سائیکل کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے سلگتی ہوئی سگریٹ، جھنجھلا کر سڑک پر پھینکی، جوتے سے اسے مسلا، اور تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"اس طرح ٹرک رکوانے کا مطلب، کیا چاہتے ہیں آپ؟"

موٹر سائیکل پر بیٹھا ہوا بھاری بھرکم جسم والا انسپکٹر اس کی جھنجھلاہٹ اور طنطنے سے ذرا متاثر نہ ہوا، بے نیازی سے بولا "میں اینٹی کرپشن کا انسپکٹر ہوں اور دونوں ٹرکوں کی تلاشی لینا چاہتا ہوں۔" اس کی آواز میں سردی سے ہلکی ہلکی کپکپاہٹ تھی۔

وانچو نے غور سے انسپکٹر کی جانب دیکھا، دھندلی روشنی میں اس کا چہرہ بڑا کرخت معلوم ہو رہا تھا، ریوالور ابھی تک اس کی انگلیوں میں دبا تھا، کیلاش ناتھ وانچو نے پہلی ہی نظر میں اندازہ لگا لیا کہ بھاری بھرکم جسم والا انسپکٹر، پوری طرح دہشت زدہ کرنے پر تلا ہوا تھا، اس سے الجھنے اور تکرار کرنے کی کوئی

گنجائش نہ تھی، وانچو نے صورت حال کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے جھٹ کاروباری پینترا بدلا بے تکلفی سے گویا ہوا "اچھا تو آپ ہیں!" وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر مسکرانے لگا۔ "اگر آپ آفیشلی پوچھتے ہیں تو میں عرض کروں گا کہ دونوں ٹرکوں میں آلوؤں سے بھرے ہوئے بورے لدے ہوئے ہیں، ثبوت میں ڈسٹرکٹ آکٹرائے آفس کی رسید بھی پیش کر سکتا ہوں، یہ محصول چنگی کے پچھلے ناکہ ہی پر ادا کیا گیا ہے اور جو کچھ اصلیت ہے، وہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے۔" اس کا لہجہ اور نرم ہو گیا۔ "سیمنٹ اور آئرن شیٹس لے جانے کا یہ کوئی پہلا اتفاق تو ہے نہیں، یہ سلسلہ ایک مدت سے چل رہا ہے۔"

انسپکٹر گردن ہلا کر بولا۔ "جی ہاں، سنا تو کچھ میں نے بھی یہی ہے اور اسی کا سراغ لگانے کے لئے کئی گھنٹوں سے اس سڑک پر سردی میں تپسیا کر رہا ہوں۔"

"یہ تپسیا خواہ مخواہ آپ نے اپنے سر مول لی۔" وانچو نے مسکرا کر ایک بار پھر بے تکلفی کا مظاہرہ کیا۔ "میں نے آج دو مرتبہ آپ کو فون کیا، اگر دفتر میں مل جاتے اور بات چیت ہو جاتی تو آپ کو اس طرح پریشانی نہ اٹھانا پڑتی، مجھے بھی سردی میں ادھر نہ آنا پڑتا۔" اس نے ہلکا سا قہقہہ بلند کیا۔ "چلئے یہ بھی ٹھیک ہی رہا، اسی بہانے آپ کے درشن ہو گئے۔" اور وہ تین سو روپے جو احمد پور کے اس بھیڑے میں صاف بچا لینا چاہتا تھا، آخر اسے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے نکالنا پڑے، اس نے کرنسی نوٹ انسپکٹر کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ "آپ سے پہلی بار ملاقات ہوئی ہے، کچھ نہ کچھ تو نذرانہ پیش کرنا ہی پڑے گا، لیجئے، ان کو رکھ لیجیے۔ فرمائیے اور کیا سیوا کی جائے۔"

"اس مہربانی کا بہت، بہت شکریہ۔" انسپکٹر نہایت رکھائی سے بولا۔ "اب اتنی مہربانی اور کیجئے کہ ان کو اپنے ہی پاس رکھ لیجئے۔"

وانچو سنجیدہ ہو کر خاموش ہو گیا۔ دونوں اندھیرے میں گم صم کھڑے تھے۔ پت جھڑ کی بپھری ہوئی ہوا رات کے سناٹے میں چیختی رہی، قریب کھڑے ہوئے ٹرکوں کے اندر سرگوشیوں کی دبی، دبی آوازیں خاموشی میں بھنبھنا رہی تھیں۔

کیلاش ناتھ وانچو نے نظریں اٹھائیں، غور سے انسپکٹر کو دیکھا، اور پھر گردن جھکا کر سوچنے لگا کہ یہ

آسانی سے ماننے والی آسامی نہیں ہے۔ اسے ابھی کچھ اور دکشنا دینا پڑے گی۔ اس نے جیب سے کچھ اور نوٹ نکالے اور نرم لہجے میں بولا۔

"انسپکٹر تیواری جب تک اس حلقے میں تعینات رہے۔ ہماری کمپنی کی طرف سے اسی حساب سے ان کا بھتّا پابندی سے پہنچتا رہا۔" وہ بے تکلفی سے مسکرانے لگا۔ "لیکن آپ کو اس جاڑے پالے میں یہاں آکر پریشان ہونا پڑا ہے۔ اب آپ کی پریشانی اور تکلیف کا بھی کچھ نہ کچھ تو خیال کرنا ہی پڑے گا۔ لیجیے یہ دو سو روپے اور ہیں۔ دیکھئے اب کچھ اور نہ کہئے گا۔" اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ "اپنا یہ ریوالور تو ہولسٹر کے اندر رکھ لیجیے۔ خواہ مخواہ آپ سے خوف معلوم ہو رہا ہے۔"

مگر انسپکٹر نے اسے مزید بے تکلف ہونے کا موقع نہ دیا۔ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی خشونت کم نہ ہوئی۔ بے رُخی سے بولا۔ "دیکھئے، آپ مجھے غلط سمجھنے کی کوشش نہ کریں۔" اس کا لہجہ تیز ہو گیا۔ "میں دونوں ٹرکوں کو تھانے لے جائے بغیر باز نہ آؤں گا۔ آپ خواہ مخواہ میرا وقت خراب کر رہے ہیں۔ اور خود بھی پریشانی اٹھا رہے ہیں۔" اس نے ریوالور ہولسٹر میں رکھ لیا۔ سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے ہاتھوں کو آپس میں رگڑ کر گرم کرنے کی کوشش کی۔ موٹر سائیکل کا ہینڈل سنبھالا اور کک مار کر اسے اسٹارٹ کرنے لگا۔

دانچو کی مسکراہٹ نے دم توڑ دیا۔ اسے اب خطرے کی شدت کا احساس ہو چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ٹرک کسی صورت میں بھی تھانے نہیں جا سکتے۔ کمپنی کا یہی حکم تھا۔ واضح ہدایت تھی کہ کمپنی کی ساکھ اور شہرت پر مطلق حرف نہ آئے۔ اس اہم ذمہ داری کے صلہ میں کمپنی سے اسے نو سو روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی رہائش کے لئے خوبصورت بنگلہ تھا۔ اور اس کے علاوہ مینجنگ ڈائریکٹر کی طرف سے خفیہ طور پر چھ سو روپے خصوصی الاؤنس بھی ملتا تھا۔ کیلاش ناتھ دانچو اپنی یہ ڈیوٹی نہایت مستعدی اور سرگرمی سے انجام دے رہا تھا۔

کمپنی اس کارگذاری اور فرض شناسی کو سراہتی تھی۔ قدر کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اسے اپنی سرگرمیوں کے لئے کمپنی کے بڑے عہدیداروں کے روبرو جواب دہ بھی ہونا پڑتا تھا۔ اور کبھی، کبھی ایسے بے ڈھب اور بے تکے سوالوں سے سابقہ پڑتا تھا کہ وہ الجھن میں مبتلا ہو جاتا۔ عام

طور پر ایسے سوالات خفیہ لین دین کے سلسلہ میں اٹھائے جاتے تھے، چنانچہ وہ پانچ سو روپے سے زیادہ دو ٹرکوں کے لئے رشوت نہیں دے سکتا، ورنہ عین ممکن تھا کہ بورڈ آف ڈائریکٹرز کی آئندہ میٹنگ میں اگر کوئی ڈائریکٹر پیچھے پڑ گیا تو زائد رقم اُسے اپنی تنخواہ سے ادا کرنا پڑے۔

لیکن وانچو کچھ اور دینے پر آمادہ بھی ہو جاتا تب بھی انسپکٹر کے سخت رویہ سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ وہ قابو میں نہیں آئے گا۔ وہ ٹرکوں کو تھانے لے جانے پر تُلا ہوا تھا۔ وانچو کے لئے یہ بڑا نازک مرحلہ تھا۔ اس کی ان خطرناک سرگرمیوں کا پس منظر یہ تھا کہ فیکٹری کی تعمیر پر کمپنی ابھی تک صرف روپیہ لگا رہی تھی۔ شوگر پلانٹ کی تعمیر ہنوز مکمل نہ ہوئی تھی۔ البتہ کمپنی کے ان زرعی فارموں میں جن میں گنّے اور ایکھ کی کاشت ہو گی، ٹریکٹر چلنے لگے تھے اور آلو کی فصلیں پیدا کی جا رہی تھیں۔ یہ آلو بوروں میں بھر کر قرب و جوار کی منڈیوں کے آڑھتیوں کو فروخت کر دیئے جاتے مگر پہلے سے طے شدہ شرائط کے مطابق ان کو منڈیوں میں پہنچانا، کمپنی کے ذمہ تھا۔ کمپنی نے یہ ذمہ داری ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت قبول کی تھی۔ یہ منصوبہ وانچو ہی نے اپنی کارگزاری دکھانے کے لئے تیار کیا تھا اور مینجنگ ڈائریکٹر کی تائید سے اسے بورڈ آف ڈائریکٹرز سے منظور بھی کرا لیا تھا۔

منصوبہ یہ تھا کہ آلوؤں کے ساتھ سیمنٹ کی بوریاں اور لوہے کی چادریں بھی ٹرکوں میں بھر کر خفیہ طور پر روانہ کی جائیں اور بلیک مارکیٹ میں ان کی تگڑی قیمت وصول کی جاتی۔ اس کی نوعیت یہ تھی کہ دوسری جنگ عظیم ختم ہوئے دو سال بھی نہ گزرے تھے، جنگ کی ہولناک تباہ کاریوں کے باعث اشیاء ضرورت کی جو قلت پیدا ہو گئی تھی، ہنوز برقرار تھی۔ ان اشیاء میں سیمنٹ اور لوہے کی چادریں بھی شامل تھیں، نئی تعمیرات کے لئے جن کی اس قدر شدید مانگ تھی کہ ضرورتمند بلیک مارکیٹ میں منہ مانگے دام ادا کرتے تھے۔ شوگر فیکٹری کی تعمیر کے لئے کمپنی کو بھی سیمنٹ کے علاوہ لوہے کی چادریں درکار ہوتی تھیں۔ ان کے لئے حکومت پرمٹ جاری کرتی تھی، باقاعدہ کوٹا مقرر کرتی تھی۔ وانچو نے ڈائریکٹر آف انڈسٹریز اور اس کے عملے کو کھلا پلا کر فیکٹری کی تعمیر کی آڑ میں ضرورت سے کہیں زیادہ بڑا کوٹا کمپنی کے نام الاٹ کرا لیا تھا۔ یہ فاضل سیمنٹ اور لوہے کی چادریں سُنسان اور اندھیری راتوں میں اسمگل

ہو کر بلیک مارکیٹ میں پہنچ جاتیں، اس ناجائز کاروبار میں پولیس کے علاوہ کئی دوسرے سرکاری محکمے بھی کمپنی کے ساتھ در پردہ شریک تھے۔

سردی بڑھتی جا رہی تھی اور ہوا بپھری ہوئی تھی۔

وانچو اندھیرے میں خاموش کھڑا تھا۔ اس کی گھنی بھنویں آنکھوں پر جھکی ہوئی تھیں، چہرے کے نقوش، پتھر کے مجسمے کی مانند ٹھوس اور ترشے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ وہ گہری سوچ میں غرق تھا۔ سوچتے سوچتے اس نے آخر طے کر لیا کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ ایسے ہی نازک موقعوں سے نمٹنے کے لئے وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ جو کچھ کرنا ہے، اس کے فیصلے کے لئے منٹ، دو منٹ سے زیادہ وقت نہیں صرف ہونا چاہیئے۔ اور وہ لوگ، جو صرف انجام ہی پر نظر رکھتے ہیں، کبھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے۔

انسپکٹر نے اسے خاموش دیکھ کر تو کا۔ "آپ کھڑے سوچ کیا رہے ہیں؟ جائیے ٹرکوں کو جا کر اسٹارٹ کرائیے۔"

وانچو نے کچھ نہ کہا، خاموشی سے مڑا اور بوجھل قدموں سے چلتا ہوا اس ٹرک کے پاس پہنچا، جو آگے کھڑا تھا۔ اس نے اپنا منہ دروازے کے قریب کیا اور آہستہ سے آواز دی۔ "نیل کنٹھ! اے نیل کنٹھ مہاراج!"

نیل کنٹھ نے جھک کر باہر دیکھا اور زبان سے پوچھا۔ "کیا طے ہوا سکڑی صاحب؟"

"نیچے آ جاؤ۔"

نیل کنٹھ ٹرک سے نکل کر باہر آ گیا۔ اس کا جسم سیاہ تھا اور پٹھے مضبوط تھے۔ رات کے اندھیرے میں اس کا آبنوسی جسم سائے کی مانند دھندلا نظر آ رہا تھا۔

"دیکھو نیل کنٹھ!" وانچو نے اسے مخاطب کیا۔ "یہ سالا انسپکٹر تو پٹھے پر ہاتھ ہی رکھنے نہیں دیتا۔ کہتا ہے کہ ٹرکوں کو تھانے لے جائے گا۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ ٹرک کسی صورت میں تھانے نہیں جا سکتے۔"

"سرکار حکم کریں۔" نیل کنٹھ سینہ تان کر بولا۔ "آپ کی اشیرواد چاہیئے۔ بھگوان کی کرپا سے کام ٹھیک ہی ہوگا۔"

گہری نیلی آنکھوں والے کیلاش ناتھ وانچو نے نیل کنٹھ کو بھرپور نظروں سے دیکھا، اور پھر ایک آنکھ دبا کر سرگوشی کی "مجھے صرف لائن کلیئر چاہیئے۔ زیادہ جھنجھٹ میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔" وہ آگے بڑھا اور مڑتے ہوئے ہدایت دی "میں جا کر اسے باتوں میں لگاتا ہوں، تم ٹرکوں کے پیچھے سے گھوم کر پہنچ جانا۔ سمجھ گئے نا۔"

نیل کنٹھ فوراً سب کچھ سمجھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں مجرمانہ چمک اُبھری۔ وہ مُڑا اور پھر ٹرک کے اندر چلا گیا۔

وانچو آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا۔ ٹرکوں کے عقب سے نکل کر سامنے آیا۔ انسپکٹر نے اسے اپنی جانب آتے ہوئے دیکھا تو حیرت سے دریافت کیا "آپ نے ٹرکوں کو اسٹارٹ نہیں کروایا؟" اس کا لہجہ تیکھا ہو گیا "بلاوجہ دیر ہو رہی ہے۔ آپ چاہتے کیا ہیں؟"

وانچو نے انسپکٹر کے نزدیک پہنچ کر سنجیدگی سے کہا "آپ یہیں تلاشی لیں گے یا تھانے میں پہنچ کر یہ کارروائی کریں گے؟"

"یہاں تلاشی لینے کی تو بظاہر کوئی ضرورت نہیں۔" انسپکٹر نے اس دفعہ قدرے نرمی سے کہا۔ "یوں جیسی آپ کی مرضی۔"

"انسپکٹر صاحب! مرضی ہماری کہاں، مرضی تو آپ کی ہے۔" وانچو نے ایک بار پھر کاروباری پینترا بدلا۔ "ہم نے تو اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، مگر آپ کی ناراضگی ختم ہی نہیں ہوتی۔"

"دیکھئے ان بیکار باتوں سے کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔" انسپکٹر نے بے رُخی سے کہا۔ "آپ کو جو کچھ کہنا ہے، تھانے میں چل کر اطمینان سے کہہ لیں۔"

"بہت بہتر، آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔" وانچو اچانک سنجیدہ ہو گیا۔ اس کا لہجہ بھی تیکھا ہو گیا۔ "لیکن اتنا میں آپ کو ضرور بتا دینا چاہتا ہوں کہ جو لوگ سیمنٹ اور آئرن شیٹس کا سرپلس کوٹا حاصل کر سکتے ہیں۔ اور جو اسے اسمگل بھی کرا سکتے ہیں، وہ اپنے بچاؤ کے طریقے بھی جانتے ہی ہوں گے۔ چور، چوری کرنے جاتا ہے تو باہر نکلنے کا راستہ پہلے دیکھ لیتا ہے۔"

وانچو ٹھیک ہی کہہ رہا تھا، وہ جس کھونٹے پر اُچھل رہا تھا، خاصا مضبوط تھا۔ اس کی کمپنی کے دو ڈائریکٹر صوبائی اسمبلی کے ممبر تھے۔ ان میں سے ایک ایم۔ ایل۔ اے تو وزیر مال کا داماد بھی تھا۔ اسی لئے سرکاری محکموں میں کمپنی کا اثر و رسوخ بھی تھا۔ لیکن انٹی کرپشن کا بھاری بھرکم جسم والا انسپکٹر اس حقیقت کو نہیں جانتا تھا۔ اس سرکل میں اس کا نیا، نیا تبادلہ ہوا تھا۔ وہ پورے علاقے پر اپنی دھاک بٹھا دینا چاہتا تھا۔ مگر ایک آدھ بڑا کیس پکڑے بغیر بات نہیں بنتی۔ پولیس کی اصطلاح میں ایک بار ہوا بندھ گئی تو لکشمی خود آکر قدم چومتی ہے۔

انسپکٹر اس وقت اپنے زعم میں تھا۔ وانچو کی باتیں اسے سخت ناگوار معلوم ہوئیں۔ اس نے جھنجھلا کر کہا۔ "ممکن ہے۔ آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں۔ ابھی تو آپ میرے ساتھ تھانے چلیں اور رات حوالات میں گذاریں۔ پھر دیکھیں گے۔ آپ اپنے بچاؤ کا کون سا طریقہ جانتے ہیں۔"

وانچو بھی بپھر گیا۔ اس نے اپنے چہرے پہ ہاتھ پھیر کر اسی طنطنہ سے جواب دیا۔ "انسپکٹر صاحب! مجھے کیلاش ناتھ وانچو کہتے ہیں۔ آپ کے ایسے انٹی کرپشن کے انسپکٹروں سے اکثر سابقہ پڑ چکا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی مل گیا ہوتا تو اس طرح مونچھ اونچی کر کے آپ کو بات کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔" وہ انسپکٹر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھورنے لگا۔

"کیا مطلب؟" انسپکٹر کے چہرے پر اور زیادہ خشونت چھا گئی۔ اس نے قہر آلود نظروں سے وانچو کو دیکھا۔ "آپ چاہتے کیا ہیں؟"

"یہ ابھی آپ کو معلوم ہو جائے گا۔" وانچو نے اس دفعہ بھی اسی لہجے میں کہا۔

"آپ سیدھی طرح تھانے چلتے ہیں یا۔" اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ جھٹ ہولسٹر کی جانب ہاتھ بڑھایا۔

مگر اس کا ہاتھ ریوالور تک پہنچا ہی تھا کہ عین اس وقت آبنوسی جسم والا نیل کنٹھ اندھیرے سے نکلا اور چھلاوے کی طرح انسپکٹر کی پشت پر پہنچ گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں دبی ہوئی لوہے کی وزنی سلاخ اٹھائی اور گھما کر انسپکٹر کے سر پہ ماری۔ نشانہ بالکل ٹھیک بیٹھا۔ سلاخ کھٹاک سے

انسپکٹر کے سر سے ٹکرائی۔ اس کے منہ سے کراہ کے ساتھ گھٹی ہوئی ہائے کی آواز نکلی۔ وہ ڈگمگایا اور موٹر سائیکل سے لڑھک کر نیچے گر پڑا۔ اس کی انگلیوں میں دبا ہوا ریوالور ابھی تک کانپ رہا تھا۔

وانچو نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ کو اپنے جوتے سے رگڑ دیا۔ جھک کر ریوالور چھینا اور ٹیلوں کی جانب اچھال دیا۔ اس نے غصّے سے انسپکٹر کی کمر پر ٹھوکر ماری اور بڑبڑانے لگا۔ "دھت تیری کی سالا کسی طرح مانتا ہی نہ تھا۔" وہ مڑا اور نیل کنٹھ سے مخاطب ہوا۔

"مہاراج! ڈال دو سالے کو اُدھر سڑک کے کنارے۔" اس نے سگریٹ نکال کر سلگائی اور لمبا کش لگا کر بولا۔ "ہاں یہ دیکھ لینا زخم گہرا تو نہیں آیا ورنہ بلاوجہ بات بڑھ جائے گی۔"

"ہاتھ بھرپور نہیں پڑا ہے۔" نیل کنٹھ نے کیلاش ناتھ وانچو کو اطمینان دلایا۔ "فکر کرنے کی کوئی بات نہیں۔"

وانچو خاموش رہا اور اطمینان سے سگریٹ کے کش لگاتا رہا۔

نیل کنٹھ نے جھک کر بے سدھ پڑے ہوئے انسپکٹر کو دیکھا اس کے دونوں بازو پکڑے اور گھسیٹتا ہوا دور تک لے گیا۔ انسپکٹر کا خاک اور خون میں لتھڑا ہوا چہرہ ڈراؤنا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی سانس رک رک کر چل رہی تھی۔ وہ جھکے ہوئے پتھریلے ٹیلوں کے دامن میں کسی لاش کی طرح بے جان پڑا تھا۔ آغاز سرمائی بھری ہوئی ہوا چٹانوں کے درمیان سے سسکیاں بھرتی ہوئی گذر رہی تھی۔ ناگاہ کسی ٹیلے کے پیچھے گیدڑوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔

وانچو نے نظریں اٹھا کر بے سدھ پڑے ہوئے انسپکٹر کو دیکھا۔ مڑا اور ٹرکوں کی جانب بڑھنے لگا۔ نیل کنٹھ اس کے ساتھ، ساتھ چل رہا تھا۔ دونوں ٹرکوں کے قریب پہنچے اور اندر داخل ہو گئے۔ ان کے سوار ہوتے ہی ٹرک اسٹارٹ ہوئے۔ انجنوں کی گھڑگھڑاہٹ سنسان رات میں ابھری۔ دونوں ٹرک آگے بڑھے اور انسپکٹر کی موٹر سائیکل کو روندتے ہوئے سڑک پر تیزی سے دوڑنے لگے مگر احمد پور جانے کے بجائے، اب وہ جنوبی ٹیلوں کی جانب مڑ رہے تھے۔ لگ بھگ سترہ میل کا چکر کاٹنے کے بعد وہ پھر اسی چوراہے پر پہنچ گئے، جہاں لوہے کے کھمبے پر آویزاں تختیوں پر لکھا تھا۔

بلبیر گھاٹ، ۱۵ میل

قریب ہی ڈسٹرکٹ اکٹرائے آفس تھا، جس کی نیم پختہ عمارت کے جھکے ہوئے سائبان کے نیچے دھندلا لیمپ روشن تھا۔ بوڑھا محرر رجسٹر کھولے ہوئے آہستہ، آہستہ کھانس رہا تھا۔ کچھ ہی دیر پہلے اسی ناکہ پر دونوں ٹرکوں پر لدے ہوئے سامان کی چنگی ادا کی گئی تھی۔ وانچو ٹرک سے اترا اور سیدھا سائبان کے نیچے پہنچا، اس نے کھنکھار کر محرر کو اپنی جانب متوجہ کیا، چوکنا نظروں سے چوکیدار کو دیکھا، جو کمبل لپیٹے دیوار سے ٹیک لگائے بے خبر سو رہا تھا۔

"آپ بہت جلدی واپس آ گئے۔" محرر نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

وانچو نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "منشی جی! میرے خیال میں آپکے رجسٹر میں ٹائم تو درج نہیں ہوتا۔" پھر جواب کا انتظار کئے بغیر اس نے جیب سے تیس روپے نکالے اور محرر کی طرف بڑھا کر بولا۔ "لیجئے، اگر کوئی پوچھ گچھ کرنے آئے تو کہہ دیجئے گا کہ دونوں ٹرک ساڑھے آٹھ بجے کے قریب یہاں آئے تھے، سمجھ گئے نا آپ؟"

محرر نے روپے لے کر اپنی گردن ہولے، ہولے ہلائی۔ "یہی کہہ دوں گا۔" اس نے قدرے توقف کرنے کے بعد پوچھا۔ "گھبرانے کی تو کوئی بات نہیں؟" اس کے لہجے سے تشویش آشکارہ تھی۔

"جب تک ہم موجود ہیں، اس وقت تک بھلا آپ پر کوئی آنچ آ سکتی ہے۔" وانچو نے سینے پر ہاتھ مارا اور ڈرامائی انداز میں قہقہہ لگا کر بولا۔ "آپ بالکل مطمئن رہیں۔"

"سو تو ہے۔" محرر بھی مطمئن ہو کر ہنسنے لگا۔ "پر بات اتنی ہے سرکار کہ اب زمانہ بڑا خراب لگ گیا ہے۔ ذرا، ذرا سی بات میں سو سو بال کی کھال نکالتے ہیں۔"

چنگی کے بوڑھے محرر کو پوری طرح اطمینان دلانے کے بعد وانچو مسکراتا ہوا پلٹا، اور ٹرک کے اندر جا کر بیٹھ گیا۔ دونوں ٹرک آگے بڑھے اور ٹرک پر دوڑنے لگے۔ سامنے پتمبر پور روڈ تھی، جو بل کھاتی ہوئی اندھیرے میں گم ہو گئی تھی، مگر دونوں ٹرک اس سمت جانے کے بجائے راہیل روڈ

سہجنوال کلاں، ۱۸ میل

شیام باڑہ، ۸۴ میل

احمد پور، ۱۵۲ میل

کی طرف مڑ گئے۔ وانچو نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ڈیڑھ بج رہا تھا۔

دونوں ٹرک سڑک پر دوڑتے رہے۔ دو بجنے سے پہلے ہی وہ امبیر گڑھ پولیس اسٹیشن کے سامنے جا کر رک گئے۔ وانچو باہر نکلا اور آہستہ، آہستہ چلتا ہوا تھانے کے اندر چلا گیا۔ اس نے ڈیوٹی انسپکٹر کو ڈیڑھ سو روپے دیئے۔ ایک ٹرک کا چالان کروایا۔ روزنامچے میں درج کر دیا گیا۔

"ٹرک نمبر ۳۱۲۶، نو بجے رات کو راہیل روڈ سے گذرتے ہوئے بغیر ہیڈ لائیٹس کے پایا گیا۔ تفتیش کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کی بیٹری خراب تھی۔ ٹرک مذکور یونائیٹڈ انڈسٹریز لمیٹڈ کی ملکیت ہے اور اس میں آلوؤں سے بھرے ہوئے بورے لدے تھے۔"

اسی طرح کھیم پور کے تھانے پر مزید ڈیڑھ سو روپے رشوت دے کر وانچو نے دوسرے ٹرک کا بھی چالان کروا دیا۔ ہیڈ محرر نے روزنامچے میں درج کیا۔

"پونے دس بجے شب کو ٹرک نمبر ۶۲۲۸، راہیل روڈ پر اس قدر تیز رفتار سے گذر رہا تھا کہ کسی حادثے کے رونما ہونے کا سخت خطرہ تھا۔ انسپکٹر ہرنام سنگھ نے اسے رکوا کر تحقیقات کی تو یہ بھی دریافت ہوا کہ ٹرک ڈرائیور مسمی نذر محمد کے پاس ڈرائیونگ لائسنس بھی موجود نہ تھا۔"

دونوں ٹرک ایک بار پھر راہیل روڈ پر تیز رفتار سے دوڑنے لگے اور صبح کاذب کے دھندلکے میں بلبیر گھاٹ پہنچ گئے۔ دونوں ٹرک وہیں کھڑے رہے۔ رات بھر کے جاگے ہوئے ڈرائیوروں کو اب آرام کرنے کی ضرورت تھی۔ لیکن کیلاش ناتھ وانچو چھ بجنے سے پہلے ہی بھارت انجینئرنگ ورکس لمیٹڈ کی لمبی چوڑی اسٹوڈی بیکر میں بیٹھ کر فیکٹری کی جانب روانہ ہو گیا۔ وہ تمام راستے کار کی پچھلی سیٹ پر لیٹا ہوا اطمینان سے سوتا رہا۔ دھوپ ابھی اچھی طرح پھیلنے بھی نہ پائی تھی کہ کار فیکٹری کے پھاٹک کے اندر داخل ہو گئی۔

کیلاش ناتھ وانچو نے اپنے بنگلے میں جا کر فوراً غسل کیا۔ معمول کے مطابق ناشتہ کیا۔ اپنے دفتر میں پہنچا اور روزمرہ کے کاموں میں الجھ گیا۔ رات کے حادثے کی اہمیت پچھلے مہینے پیش آنے والے اس ڈریلمنٹ سے زیادہ نہ رہی، جس میں ریلوے کی ایک ویگن، فیکٹری کے احاطے میں ایک ٹرالی سے ٹکرا گئی تھی اور پٹری سے اتر کر ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ ریلوے حکام نے اس حادثہ کا ذمہ دار کمپنی کو ٹھہرایا

تھا۔ اور اپنے نقصان کے لئے کوئی چار ہزار روپے کا کلیم کیا تھا۔ معاملہ اب عدالت کے روبرو پہنچ چکا تھا اور عدالتی کارروائیوں سے نمٹنے کے لئے کمپنی کے قانونی مشیر، بیرندر پرشاد، ایڈوکیٹ موجود ہی تھے۔

پولیس تحقیقات کرتی رہی، طرح طرح کی پوچھ گچھ اور تفتیش ہوتی رہی، اینٹی کرپشن کا بھاری بھرکم جسم والا زخمی انسپکٹر، اسپتال میں پڑا ہوا کراہتا رہا اور گٹھے ہوئے بدن کا کالا کلوٹا نیل کنٹھ، بھنگ چڑھا کر ٹھاٹھ سے گالیاں بکتا اپنے کوارٹر میں بستر پر لیٹ کر رات گئے تک اونچی آواز سے آلہا گاتا۔

۲

"تمہاری بات اگر نہ مانی جائے تو؟"

"پھر تو کنور صاحب نتیجہ کچھ اچھا نہیں نکلے گا۔"

"لیکن دیپ چند تم کو معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ میں کمپنی کا مینجنگ ڈائریکٹر ہوں۔"

کمرے کے اندر تیز لہجے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ آتش دان میں کوئلے چٹخ رہے تھے۔ دہکتے ہوئے سرخ انگاروں کی روشنی میں کیلاش ناتھ وانچو کا گنجا سر چمک رہا تھا۔ وہ خاموش بیٹھا اپنا بھدا پائپ ہونٹوں میں دبائے آہستہ آہستہ کش لگا رہا تھا۔ کھلی ہوئی کھڑکی سے ہوا کے سرد جھونکے اندر آ رہے تھے۔ فیکٹری کے ورکشاپ میں دھڑکتی ہوئی لوہے کی جھنکار صاف سنائی دے رہی تھی۔

باہر ہلکی نیلگوں کہر کے لچھے منڈلا رہے تھے۔ اور اس دھند میں لپٹی ہوئی مینجنگ ڈائریکٹر کی عالیشان کوٹھی اونگھتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ کوٹھی کے بیرونی برآمدے میں، نیل کنٹھ دیوار سے پیٹھ لگائے چپ چاپ بیٹھا تھا۔ برآمدے میں اندھیرا تھا۔ اور اس گہری تاریکی میں نیل کنٹھ کا آبنوسی جسم آسیب زدہ سائے کی مانند ڈراؤنا نظر آ رہا تھا۔

نیل کنٹھ اندھیرے میں خاموش بیٹھا رہا اور جب دیپ چند سکسینہ تیکھے لہجے میں بولتا تو وہ چونک کر کمرے کے دروازے کی جانب اس طرح سہمی ہوئی نظروں سے دیکھتا جیسے اب کچھ ہونے ہی والا ہے۔ کمرے کا ایک دروازہ، برآمدے میں کھلتا تھا، مگر دروازہ بند تھا۔

کمرے میں دیپ چند ایک صوفے پر بیٹھا تھا۔ بات کرتے، کرتے کبھی وہ گرم ہو جاتا، کبھی نرم۔ ٹیبل لیمپ کے شیڈ کے سائے میں وہ اس طرح سکڑا ہوا بیٹھا تھا کہ اس کا منحنی جسم، ناٹک کے کسی مسخرے کی طرح حقیر معلوم ہو رہا تھا۔ وہ کمپنی کا چیف اکاؤنٹنٹ تھا۔ اس حیثیت سے کمپنی کے ناجائز کاروبار میں اس کا کردار بہت اہم تھا۔ یہ بات نیلی آنکھوں والا وانچو بھی جانتا تھا۔ اور مینجنگ ڈائریکٹر بھی اس کی اہمیت سے بخوبی آگاہ تھا، جسے سب لوگ کنور صاحب کہتے تھے۔ اس کی وجۂ تسمیہ یہ تھی کہ وہ رانی بازار کے علاقے کا جاگیردار تھا۔ اس کی زمینداری ہزاروں بیگھا اراضی پر پھیلی ہوئی تھی۔ مگر وہ کاروباری داؤں پیچ سے زیادہ ریس میں دوڑنے والے گھوڑوں کی نسلوں، شکاری کتّوں کی خصوصیات اور عورتوں کی مختلف قسموں کے بارے میں واقفیت رکھتا تھا۔ اسے صنعت و حرفت سے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ لیکن جب سے جاگیرداری اور زمینداری کے خاتمے کی افواہیں سرکاری حلقوں میں گشت کرنے لگی تھیں، اس نے بھی اپنی دھن دولت، نہ صرف محفوظ کرنے بلکہ اس میں اضافہ کرنے کی غرض سے کسی انڈسٹری میں داخل ہو جانا ہی بہتر سمجھا۔ اس دور اندیشی نے کنور شیو راج سنگھ کے ساتھ، ساتھ اسے یونائیٹڈ انڈسٹریز لمٹیڈ کا مینجنگ ڈائریکٹر بھی بنا دیا تھا۔

مگر کمپنی کا چیف اکاؤنٹنٹ، دیپ چند سکسینہ، اس وقت مینجنگ ڈائریکٹر کی بھاری بھرکم شخصیت سے مرعوب نظر نہ آتا تھا۔ اس نے گردن اٹھا کر نہایت اعتماد سے خبردار کیا۔ "اگر آپ مینجنگ ڈائریکٹر ہیں تو میں بھی کمپنی کا چیف اکاؤنٹنٹ ہوں۔ سارے رجسٹر میری ہی تحویل میں رہتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے کہ سارے رجسٹر تمہاری تحویل میں رہتے ہیں۔" مینجنگ ڈائریکٹر برافروختہ ہو کر دھاڑا۔ "مگر اس بات کو جتانے سے تمہارا مطلب؟"

"کنور صاحب زخمی سانپ اور چوٹ کھایا ہوا انسان بڑا خطرناک ہوتا ہے۔" دیپ چند ذرا خائف نہ ہوا۔ اس نے اس دفعہ ترپ کا نیا پتّا پھینکا۔ "دیکھئے آپ میری حق تلفی نہ کریں، ورنہ میں سارے رجسٹر بورڈ آف ڈائریکٹرز کی میٹنگ میں پیش کر سکتا ہوں۔ یہ میٹنگ کل صبح ہی ہو رہی ہے۔" اس نے دو ٹوک بات کی۔ "میں چاہتا ہوں کہ آپ کو میرے بارے میں جو فیصلہ کرنا ہے۔ وہ آج اور ابھی ہو جانا چاہیئے۔"

یہ دھمکی سُن کر مینجنگ ڈائریکٹر کی سانس معائتیز ہو گئی۔ وُہ دبلے پتلے دیپ چند سکسینہ کو عقابی نظروں سے گھورنے لگا۔ لیکن دیپ چند اس کے غیظ و غضب سے بے نیاز صوفے پر بیٹھا ہوا مزے سے اپنی کینٹی آہستہ، آہستہ کھجاتا رہا۔ اس لئے کہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ مینجنگ ڈائریکٹر اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ وہ پوری طرح اس کے قابو میں تھا۔

وہ مینجنگ ڈائریکٹر کی بدعنوانیوں کے اتنے بڑے، بڑے رازہائے درون پردہ کا محافظ تھا کہ جس وقت بھی چاہتا اُسے نقصان پہنچا سکتا تھا۔ بات دراصل یہ تھی کہ سیمنٹ اور لوہے کی چادریں جس قیمت پر چور بازار میں فروخت ہوتی تھیں، کمپنی کے رجسٹروں میں ان کو بہت کم کر کے درج کیا جاتا تھا۔ اسی طرح فیکٹری کی تعمیر میں استعمال ہونے والے ساز و سامان کی خریداری میں بھی ہیر پھیر کی جاتی تھی۔ ان ہتھکنڈوں سے مینجنگ ڈائریکٹر نے کوئی دو لاکھ روپے نہایت رازداری سے ہتھیا لئے تھے۔ دیپ چند کو اعتماد میں رکھنے کے لئے اس نے دس فیصد کا شریک دار بنا لیا تھا۔ مگر اس کے حصے کے بیس ہزار روپے کی ادائیگی کرتے وقت اس کی نیت بدل گئی۔ دیپ چند کے بار، بار توجہ دلانے پر بھی، وہ برابر ٹال مٹول سے کام لیتا رہا۔

لیکن آج رات دیپ چند سکسینہ نے ٹھان لیا تھا کہ جب تک کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہو جائیگا وہ ٹلے گا نہیں۔ دیپ چند ایسا کرنے پر مجبور تھا۔ اس کی بڑی بیٹی، کرشنا دتی، کے بیاہ کی بات ایک ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر کے بیٹے سے طے پا چکی تھی۔ لڑکا وکیل تھا اور اس کی وکالت بھی چل نکلی تھی۔ رشتہ اتنا اچھا تھا کہ دیپ چند اس میں تاخیر کرنا نہ چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ کوئی شبھ گھڑی، دیکھ کر جلد سے جلد لگن ہو جائے۔ مگر اس کے لئے کائستھوں کے رواج کے مطابق دس ہزار روپے تلک میں دینا تھے ورنہ سگائی نہیں ہو سکتی۔

مینجنگ ڈائریکٹر چاہتا تھا کہ بیس ہزار روپے دینے کے بجائے بورڈ آف ڈائریکٹرز سے سفارش کر کے دیپ چند سکسینہ کی تنخواہ ڈھائی سو سے بڑھا کر ساڑھے تین سو روپے ماہانہ کر دی جائے۔ اس نے یہ تجویز دیپ چند کے سامنے پیش کی۔ مگر وہ رضامند نہ ہوا۔ اسے نقد بیس ہزار روپے کی ضرورت تھی۔

وہ اپنی بیٹی کا بیاہ کرنے کے لئے بے چین تھا، اُسے جب اپنی خواہش پوری ہوتی نظر نہ آئی تو وہ بھی اپنی بات منوانے کے لئے اڑ گیا۔

مینجنگ ڈائریکٹر خاموش بیٹھا ہوا پیچ و تاب کھا رہا تھا، اس کا چہرہ غضب ناک ہوتا جا رہا تھا۔ کاروباری زندگی پر جاگیردارانہ طمطراق برابر حاوی ہوتا جا رہا تھا۔ پھر ایک لمحہ ایسا آیا کہ وہ کمپنی کے مینجنگ ڈائریکٹر سے صرف رانی بازار کے علاقے کا جاگیردار، کنور شیوراج سنگھ رہ گیا۔ وہ غصے سے پھٹ پڑا۔ میز پر زور سے گھونسہ مارا اور چیخ کر دیپ چند کو دھتکارا۔

"کمرے سے باہر نکل جاؤ، اور جاؤ جو کچھ تم سے کیا جائے کر لو۔"

مخنی جسم والا ناٹک کا مسخرہ، دیپ چند سکسینہ، مسکین سی شکل بنائے ہوئے خاموشی سے اٹھا اور دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔

کمرے میں گہری خاموشی چھائی تھی۔ باہر لان میں دیپ چند کے قدموں کی آہٹ آہستہ، آہستہ سنائی دے رہی تھی۔ وانچو نے اپنا پائپ میز پر رکھ دیا، اٹھا اور آتش دان کے نزدیک پہنچ گیا۔ اس نے پوکر اٹھایا اور آتش دان میں سلگتے ہوئے کوئلوں کو کریدنے لگا۔ کوئلے بار، بار چٹختے اور ان میں سے چنگاریاں رک، رک کر ابھرتیں، وانچو نے مڑ کر مینجنگ ڈائریکٹر کی جانب دیکھا، نرم لہجے میں شکوہ کیا۔

"کنور صاحب یہ آپ نے کیا کر دیا؟"

"کچھ نہیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔" مینجنگ ڈائریکٹر نے بے نیازی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی۔

"کل سویرے ہی نوٹس دیکر اس نمک حرام کو نوکری سے علیحدہ کر دو، ہمارا ہی کھاتا ہے اور ہم ہی کو آنکھیں دکھاتا ہے، تم نے سُنا نہیں کیسی دیدہ دلیری سے بات کر رہا تھا۔"

وانچو گھبرا کر بولا "لیکن اس طرح تو کام نہیں بنے گا، بلکہ اب تو وہ اور بھی آسانی سے بلیک میل کر سکتا ہے، آپ یہ تو جانتے ہی ہیں کہ اس کے پاس ہمارے خلاف بہت سے ڈکومینٹری ثبوت موجود ہیں۔"

کنور شیوراج سنگھ دفعتاً گہری خاموشی میں کھو گیا، اور خود کو بڑا بے بس محسوس کرنے لگا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے کسی قدر بے چارگی سے کہا "اچھا تو اب تم ہی کچھ کرو۔" اس نے گہری

سانس بھری "بھئی اپنی تو عقل کام نہیں کر رہی ہے"۔

"میں نے تو اس کے لئے پہلے ہی بندوبست کر لیا تھا، اسے اس وقت یہاں بلایا ہی اس لئے تھا" وانچو نے اسے بتایا "مجھے معلوم تھا کہ وہ ایسی ہی باتیں کرے گا۔ بدقسمتی یہ ہوئی کہ اتفاق سے آپ یہاں آگئے اور خواہ مخواہ اس سے اُلجھ گئے"۔

"تم نے اس کے بارے میں کیا سوچا تھا؟" کنور شیوراج سنگھ نے دریافت کیا۔ اس کے لہجے سے تشویش آشکارہ تھی۔

"آپ اب کوٹھی کے اندر تشریف لے جائیں" وانچو نے اسے اطمینان دلایا "فکر نہ کریں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میرے ہوتے ہوئے بھلا آپ پر آنچ آسکتی ہے"۔

کنور شیوراج سنگھ نے اس کی جانب ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ مجھے تم سے یہی اُمید ہے۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس دروازے پر پہنچا، جو کوٹھی کے اندر کھلتا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھولا اور کمرے سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد وانچو نے نیل کنٹھ کو کمرے میں بلایا۔ اس سے کہا۔

"نیل کنٹھ مہاراج! دیکھو دیپ چند ابھی زیادہ دُور نہ گیا ہوگا۔ تم فوراً بھاگو اور اُسے اپنے ہمراہ واپس لے آؤ۔ کہنا سیکرٹری صاحب نے بُلایا ہے"۔

نیل کنٹھ خاموشی سے مُڑا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ جب وہ لوٹا تو دیپ چند سکسینہ اس کے ہمراہ تھا۔ نیل کنٹھ کمرے میں زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔ وانچو نے اشارہ کیا اور وہ کمرے سے نکل کر باہر برآمدے میں جا کر بیٹھ گیا۔

وانچو نے دیپ چند کو دیکھا اور نرم لہجے میں بولا "دیپ چند جی، آپ کھڑے کیوں ہیں، بیٹھ جائیے"۔

دیپ چند خاموشی سے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

"اکاؤنٹنٹ صاحب، آپ بھی خوب آدمی ہیں" وانچو نے مسکرا کر دیپ چند سے کہا "اتنی عمر ہو گئی، مگر مزاج پہچاننا ابھی تک نہ آیا۔ بھلا اس طرح بھی کوئی بات طے ہوتی ہے"۔

دیپ چند سکینہ بھی کم سیانا نہ تھا۔ وہ پہلے ہی بھانپ گیا تھا کہ اس کا تیر ٹھیک نشانے پر لگا تھا۔ اسے بخوبی اندازہ تھا کہ مینجنگ ڈائریکٹر اس کے قابو سے نکل کر نہیں جا سکتا۔ مگر اس نے انکساری سے کام لیا۔ گلہ کرنے کے انداز میں بولا۔ "سیکرٹری صاحب! ذرا یہ تو سوچئے کہ کنور صاحب میرا گلا کاٹنے پر تلے ہوئے ہیں، آپ ہی بتلائیے میں کرتا بھی کیا؟"

"بھئی کمال کر دیا آپ نے" وانچو بے تکلفی سے ہنسنے لگا۔ "اتنا تو آپ جانتے ہی ہیں کہ زندگی میں پہلی بار کنور صاحب کاروباری بکھیڑوں میں پڑے ہیں۔ انہوں نے تو ہمیشہ حکم ہی چلایا ہے۔ اپنی زمینداری میں من مانی کرتے رہے ہیں، نہ تو سننے کے وہ عادی ہی نہیں ہیں، دیکھئے ان رئیسوں سے تو بات کرنے کا ادب ہی گر ہوتا ہے، ان کے سامنے تو ہر بات پر بس ہاں کرتے جائیے، پھر اپنا جو کام جی چاہے ان سے کرا لیجئے۔"

دیپ چند نے مصلحت اندیشی سے کام لیا۔ فوراً اپنی غلطی تسلیم کر لی۔ پشیمانی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ "اب آپ سے کیا عرض کروں سیکرٹری صاحب، مجھے بھی اس وقت نا معلوم کیا ہو گیا تھا کہ کنور صاحب کے سامنے ذرا تیزی سے بات کرنے لگا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "بات یہ ہے کہ میں اپنی بیٹی کی سگائی کے سلسلہ میں ادھر بڑا پریشان رہا ہوں، آپ جانتے ہی ہیں، میں بواسیر کا پرانا مریض ہوں، صحت روز بروز گرتی جا رہی ہے، چاہتا ہوں اپنی زندگی ہی میں اس کے ہاتھ پیلے کر دوں، بس اب تو اپنی یہی تمنا ہے۔" اس کے لہجے میں رقت تھی۔

"جی ہاں! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں، بیٹی کا باپ ہونا بھی اس سوسائٹی میں اچھی خاصی مصیبت ہے۔" وانچو نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن بات کے اسی پہلو پر اگر آپ نے زور دیا ہوتا تو بھلا کنور صاحب انکار کر سکتے تھے، انہوں نے لاکھوں روپیہ ریس میں اڑا دیا، کیا اس کنیادان کے لئے وہ کچھ نہ کرتے؟ وہ زبان کے جس قدر کڑوے ہیں، اندر سے اتنے ہی نرم بھی ہیں، آپ نے انہیں پہچانا نہیں۔"

"اچھا تو اب آپ ہی بتائیے میں کیا کروں۔" دیپ چند نے عاجزی سے کہا۔

وانچو بولا۔ "کیجئے گا کیا۔ کنور صاحب نے جب آپ سے وعدہ کیا ہے تو آپ کو اپنا روپیہ ضرور ملے گا۔"

دیپ چند کے مرجھائے ہوئے چہرے پر زندگی کی تر و تازگی ہویدا ہو گئی مسکرا کر بولا "تو اس کام کو اب کرا ہی دیجئے" وہ گڑگڑانے لگا "سیکرٹری صاحب آپ کا بہت بڑا احسان ہوگا"

وانچو نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا "آپ تو خواہ مخواہ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں" اس نے میز کی دراز سے کنجی نکالی اور دیپ چند کے سامنے ڈال دی "لیجئے ذرا سیف کے اندر سے چیک بک تو نکالئے۔ میں آپ کی رقم کا چک ان کے پرسنل اکاؤنٹ سے اسی وقت تیار کئے دیتا ہوں۔ ابھی تو کنور صاحب کا موڈ بگڑا ہوا ہے۔ سویرے آفس پہنچتے ہی ان سے دستخط کروا کے چیک آپ کو دے دوں گا۔ آپ بالکل اطمینان رکھیں"

دیپ چند سکسینہ واقعی مطمئن بھی ہو گیا۔ اس نے کچھ نہ کہا۔ خوشی سے اس پر وارفتگی طاری ہو گئی۔ اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں کنجی اٹھائی۔ کھڑا ہوا اور دیوار کے پاس رکھے ہوئے آہنی سیف کے پاس پہنچ گیا۔ سیف کے اوپر لگے ہوئے چھوٹے سے سبز بلب کو دیکھا، جو اپنی ایک آنکھ سے اس کی جانب اس طرح گھور رہا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو، خطرے کی کوئی بات نہیں۔

دیپ چند نے کنجی سے تالا کھولا اور دروازے کو باہر کھینچا۔ سیف کا اندرونی حصہ اب غار کی مانند منہ پھاڑے ہوئے نظر آ رہا تھا۔ یہ پہلا موقع نہ تھا۔ دیپ چند کئی بار مینجنگ ڈائریکٹر یا وانچو کی موجودگی میں سیف کے اندر سے کیش کے علاوہ چیک بک یا کوئی ایسی اہم دستاویز نکال کر پیش کر چکا تھا، جسے حفاظت کے خیال سے سیف میں رکھا جاتا تھا۔

وانچو گردن موڑے مجرمانہ نظروں سے دیپ چند کی جانب دیکھ رہا تھا۔ دیپ چند نے جیسے ہی جھک کر سیف کے نچلے خانے کا ہینڈل مضبوطی سے پکڑ کر کھولنے کی کوشش کی، ٹھیک اسی وقت وانچو نے ہاتھ بڑھایا۔ اور پشت کی دیوار میں لگے ہوئے سوئچ کو دبا دیا۔ سیف پر لگا ہوا سبز بلب بجھ گیا اور اس کے بجائے سرخ بلب روشن ہو گیا۔ دیپ چند دفعتاً منہ پھاڑ کر بھیانک آواز میں چیخا۔ پھر اس کے کراہنے کی دبی، دبی آوازیں گہری خاموشی میں ابھرنے لگیں۔

وانچو نے سوئچ دبا کر فوراً ہی لیمپ بھی بجھا دیا۔ آتش دان میں دہکتے ہوئے انگاروں کی گہری سرخ

روشنی میں سامنے دیوار پر دیپ چند کا بے ڈول سایہ بڑا مہیب نظر آرہا تھا۔ اس کے حلق کے اندر سے رک، رک کر بلیوں کے غرانے کی سی آوازیں نکل رہی تھیں پھر ہینڈل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ ایک طرف لڑھک گیا۔ باہر فیکٹری کے ورکشاپ میں لوہے کے ٹھوکنے پیٹنے کی جھنکار ابھر رہی تھی۔ ہر طرف کہر کا دھندلکا چھایا تھا۔

کمرے کی آسیب زدہ تاریکی میں وانچو کا چہرہ بڑا پُراسرار نظر آرہا تھا۔ اس کی گہری نیلی آنکھوں میں دہشت جھلک رہی تھی۔ گنجے سر پر پسینے کی نمی تھی۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور خواب میں بھٹکنے والے سائے کی مانند آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا چلنے لگا۔ سیف کے قریب پہنچا اور ٹھہر گیا۔ اس نے دیپ چند کی جانب دیکھا۔ وہ منہ پھاڑے بے ڈھنگے پن سے فرش پر پڑا تھا۔ دھندلی روشنی میں اس کی پھٹی، پھٹی آنکھیں ڈراؤنی نظر آرہی تھیں۔

وانچو نے گھبرا کر جھرجھری لی۔ وہ اس خوفناک منظر کو زیادہ دیر نہ دیکھ سکا۔ اس نے مڑ کر دروازے کی سمت دیکھا۔ نیل کنٹھ کو آواز دی۔ وہ اس کی آواز کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ فوراً دروازہ کھول کر اندر آگیا وانچو کی جانب دیکھتے ہوئے اس نے نہایت مستعدی سے دریافت کیا۔

"کیا حکم ہے سکرٹری صاحب؟"

"ویرانڈے میں لگے ہوئے بجلی کے مین سوئچ کو آف کر دو بالکل اسی طرح جیسے میں تم کو سمجھا چکا ہوں۔"

وانچو نے نیل کنٹھ کو ہدایت کی۔ "جاؤ اور سوئچ آف کر کے فوراً واپس آجاؤ۔"

نیل کنٹھ ہدایت ملتے ہی چلا گیا۔ باہر برآمدے میں اس کی چاپ سنائی دی۔ [illegible] کے اوپر جلتا ہوا سرخ بلب ذرا دیر بعد بجھ گیا۔ اب خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ بلب کے بجھتے ہی کمرے میں ہر طرف گہرا اندھیرا پھیل گیا۔ اس اندھیرے میں وانچو دم بخود کھڑا تھا۔ آتشدان میں دہکتے ہوئے انگاروں کی ہلکی، ہلکی سرخ روشنی میں اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

نیل کنٹھ دروازہ کھول کر اندر آگیا۔

"اسے اٹھا کر باہر لان میں لے جاؤ۔" وانچو نے دیپ چند کے مردہ جسم کی طرف ہاتھ اٹھا کر نیل کنٹھ سے

کہا "میرا انتظار کرو۔ ذرا دیر بعد میں بھی پہنچ جاؤں گا۔" اس کی آواز میں ہلکی، ہلکی تھرتھراہٹ تھی۔

نیل کنٹھ نے نظریں اٹھا کر کیلاش ناتھ وانچو کو اس طرح دیکھا، جیسے پوچھ رہا ہو کہ کیا یہ مر گیا؟ وہ دھندلی، دھندلی روشنی میں خاموشی سے آگے بڑھا۔ دیپ چند کے نزدیک پہنچا۔ اس کی لاش اٹھا کر پشتارے کی طرح اپنی چوڑی چکلی پیٹھ پر لادی اور کسی کبڑے کی طرح سر جھکائے ہوئے سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

وانچو نے میز کی دراز سے ٹارچ نکال کر روشن کی اور اسے ہاتھ میں دبائے ہوئے سیف کے پاس پہنچا۔ پشت پر لگے ہوئے سوئچ بورڈ پر ٹارچ سے روشنی ڈالی۔ بورڈ کا ڈھکنا کھلا ہوا تھا۔ اس نے ان جڑے ہوئے تاروں کو علیحدہ کر کے درست کیا جن کے ذریعے میز کے پیچھے کی دیوار کا سوئچ دبانے سے سیف میں بجلی سرایت کر جاتی تھی۔ سبز بلب بجھ جاتا تھا اور خطرے سے خبردار کرنے والا سرخ بلب روشن ہو جاتا تھا۔ وانچو نے سوئچ بورڈ پر لکڑی کا ڈھکنا احتیاط سے رکھا۔ جیب سے پیچ کش نکالا اور تمام اسکرو اچھی طرح کس دئے۔

سوئچ بورڈ کا کھلا ہوا منہ بند ہو گیا، مگر سیف کا اندرونی حصہ ابھی تک منہ پھاڑے ہوئے نظر آ رہا تھا۔ اس نے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کے پنجلے خانے کو بند کیا تو اسے دیپ چند کی پھٹی، پھٹی خوفناک آنکھیں یاد آ گئیں۔ وانچو کا جسم لمحہ بھر کے لئے لرز کر رہ گیا۔ اس نے جھپاک سے سیف کا بیرونی دروازہ بھی بند کر دیا۔ آتش دان میں دہکتے ہوئے انگارے کسی جلتی ہوئی چٹائی طرح یکایک زور سے چٹخنے اور چنگاریاں اڑ کر فضا میں بکھر گئیں۔

وانچو کی سانس تیزی سے چلنے لگی۔ وہ لمبے، لمبے ڈگ بھرتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ کوٹھی ابھی تک تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وانچو نے برآمدے میں پہنچ کر بجلی کا مین سوئچ آن کر دیا۔ دریچوں پر نور آرائی جھلملانے لگی، اسی وقت کوٹھی کے اندرونی حصے میں کنور شیو راج سنگھ کے آہستہ، آہستہ کھانسنے کی آواز ابھری، مگر کیلاش ناتھ وانچو نے اُدھر کوئی توجہ نہ دی۔ آگے بڑھا اور تیزی سے سیڑھیاں طے کر کے نیچے لان میں پہنچ گیا۔ نیل کنٹھ ایک درخت کے نیچے اندھیرے میں کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

دانچو کو دیکھ کر وہ آہستہ سے کھنکھارا، دانچو بڑھ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

دونوں گہری دھند میں آہستہ، آہستہ آگے بڑھے۔ وہ فیکٹری کے پاور ہاؤس کے عقبی دروازے کی سمت جا رہے تھے۔ سردی اب بڑھ گئی تھی۔ دانچو آگے، آگے چل رہا تھا۔ اس کا بدن سردی سے ہولے ہولے کپکپا رہا تھا۔ نیل کنٹھ اس کے پیچھے تھا۔ وہ دیپ چند کی لاش اپنی پیٹھ پر لادے جھکا، جھکا چل رہا تھا۔ ان کے قدموں کی آہٹ سُنسان راستے پر رک، رک کر ابھر رہی تھی۔ نیلگوں دھند میں وہ سایوں کی طرح معلوم ہو رہے تھے۔

دانچو، گردن گھما پھرا کر ادھر، ادھر پوکنا نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ مگر نیل کنٹھ کی نگاہیں دانچو پر جمی تھیں۔ وہ سنبھل، سنبھل کر قدم اٹھاتا ہوا اس کے عقب میں چل رہا تھا۔

رات گئے جب نیل کنٹھ واپس ہوا اور اپنے کوارٹر کے نزدیک پہنچا تو دھندلی روشنی میں اس نے دس گیارہ سال کی عمر کے ایک دبلے پتلے بچے کو دیکھا، جو اس کے کوارٹر سے کچھ فاصلے پر سردی سے سکڑا ہوا کھڑا تھا۔ اس نے پہلی ہی نظر میں اسے پہچان لیا۔ وہ دیپ چند سکسینہ کا بیٹا، مُنّا تھا۔ وہ سردی سے کپکپاتی ہوئی آواز میں بوڑھے چوکیدار کو پکار رہا تھا۔

"پربھو دادا۔ اے پربھو دادا!"

پربھو، اپنی کوٹھری کا دروازہ کھول کر کھانستا ہوا نکلا اور اسے دیکھتے ہی حیرت زدہ ہو کر بولا۔

"ارے منّے! تم اس سمے کہاں نکل پڑے۔ ہائے رام، کتنے زوروں کا جاڑا پڑ رہا ہے۔"

"بابوجی ابھی تک گھر نہیں لوٹے۔" منّا نے تھرتھراتے ہوئے بتایا۔ "ماں جی گھبراتی ہیں۔ انہوں نے مجھے بابوجی کے بارے میں پوچھنے کے لئے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ کرشنا دیدی تو رات کو نکلتی ہی نہیں۔ اب وہ بڑی ہو گئی ہیں نا۔"

پربھو نے گردن اٹھا کر سوچتے ہوئے قیاس آرائی کی۔ "اکاؤنٹنٹ صاحب تو شاید بڑے صاحب کی کوٹھی پر گئے ہوں گے۔ میں ابھی جا کر ان کو بتا دوں گا۔ چلو پہلے میں تم کو گھر پہنچا دوں۔ جاڑا بھی کڑاکے کا ہے اور کہرا بھی آج رات بہت ہے۔"

وہ منّا کو اپنے ہمراہ لے کر چلا گیا نیل کنٹھ اندھیرے میں کھڑا دونوں کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

منّا نے چلتے، چلتے چوکیدار سے کہا "پربھو دادا! تم جاکر بابو جی کو لے آؤ۔ میں اکیلا ہی چلا جاؤں گا۔ وہ ننھی بلّو ہے نا، بابو جی کے بنا اسے نیند نہیں آتی۔ خوب زور، زور سے رُو رہی ہے۔"

نیل کنٹھ کو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی تاریکی میں قریب ہی کھڑا سرگوشی کر رہا ہو "نیل کنٹھ مہاراج! اس سے کہہ دو۔ جاؤ منّا اب تمہارے بابو جی کبھی نہیں آئیں گے۔ ننھی بلّو روتے، روتے ان کے بنا ہی سو جائے گی۔ وہ فیکٹری کے پاور ہاؤس میں چُپ چاپ پڑے ہیں۔ نہ بولتے ہیں، نہ کسی کی سن سکتے ہیں۔ تمہاری آواز اب ان کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی۔"

نیل کنٹھ نے ہلکی سی جھرجھری لے کر لہری سانس بھری۔ اچانک اسے ایسا لگا کہ بہت تھک گیا ہے۔ اس کا مضبوط پٹھوں والا جسم پگھلنے لگا ہے۔ اس کے چاروں طرف دبی، دبی سسکیاں سرسرا رہی ہیں۔ وہ پریشان ہو کر آگے بڑھا اور بوجھل قدموں سے چلتا ہوا اپنے کوارٹر کے دروازے پر پہنچا۔ ہاتھ بڑھا کر اسے کھولنے کی کوشش کی۔ مگر آہٹ سن کر فوراً چونکا۔ اسے یاد آگیا کہ دروازہ تو اندر سے بند ہے۔

وہ مڑا۔ کوارٹر کے پچھواڑے پہنچا۔ چوکنا نظروں سے ادھر اُدھر دیکھا۔ اچھل کر آنگن کی دیوار پر پہنچا اور آہستہ سے نیچے اتر گیا۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ ڈسٹرکٹ جیل کی پتھروں سے بنی ہوئی اونچی دیوار پھاند کر رات کے سناٹے میں فرار ہوا تھا۔ اس کے عقب میں گشت کرنے والے پہریداروں کی سیٹیاں زور زور سے چیخ رہی تھیں اور خطرے کے سائرن جیل کی چار دیواری میں دیر تک گونجتے رہے تھے۔

نیل کنٹھ نے آنگن عبور کیا۔ اپنے کمرے میں گیا اور بستر پر لیٹ گیا، مگر اسے نیند نہ آئی۔ وہ بہت دیر تک جاگتا رہا۔ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا اور نہ جانے کیا اوٹ پٹانگ باتیں سوچتا رہا۔

دوسرے روز فیکٹری میں کوئی کام نہ ہوا۔ چیف اکاؤنٹنٹ دیپ چند سکسینہ کی ناگہانی موت کے سوگ میں فیکٹری بند رہی۔ اس کی لاش پاور ہاؤس میں ٹرانسفارمر دم سے کچھ فاصلے پر پائی گئی تھی۔ وہ کسی مستری سے ملنے وہاں گیا تھا اور غلطی سے اس کا جسم کسی ہائی وولٹیج تار سے مس ہو گیا۔ گذشتہ رات جنریٹنگ مشینوں کی مرمت ہو رہی تھی اور وقفہ، وقفہ سے بجلی کی سٹنگ بھی کی جا رہی تھی۔ کمپنی کی جانب سے پولیس کے تحقیقاتی

افسر کے روبرو فورمین نے یہی بیان دیا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ سے بھی فورمین کے بیان کی تصدیق ہوتی تھی۔ لہٰذا پولیس نے دیپ چند کی موت کو اتفاقی حادثہ قرار دیکر اپنی تفتیش ختم کردی اور کیس داخل دفتر کردیا۔ دوسری طرف فیکٹری میں یہ افواہ بھی گشت کررہی تھی، کہ دیپ چند نے ہزاروں روپے کا غبن کیا تھا اور اس سلسلہ میں اس سے پوچھ گچھ کی جا رہی تھی، جس سے پریشان ہوکر اس نے خودکشی کرلی۔ یہ افواہ کیلاش ناتھ واڈچو کے اشارے پر پھیلائی گئی تھی۔

اسی روز سہ پہر کو بورڈ آف ڈائریکٹرز کی میٹنگ ہوئی جس میں دیپ چند سکسینہ کی المناک موت پر اظہار تعزیت کیا گیا اور مینجنگ ڈائریکٹر کی سفارش پر دیپ چند کے سوگوار خاندان سے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے پانچ ہزار روپے گزارے کے لئے منظور کئے گئے۔

۳

فیکٹری کی تعمیر اچانک سست پڑگئی تھی۔

پھاگن کی مہکتی ہوئی ہوائیں چلنے لگی تھیں۔ ان کے سرسراتے ہوئے تیز جھونکوں سے سرسوں کے گہرے زرد، زرد پھولوں کی ڈالیاں جھومنے لگی تھیں۔ کھیتوں میں بیسے بسنتی آنچل لہراتے تھے۔ رات گئے تک ڈھولک کی تھاپ اور مجیرے کی جھنکار کیساتھ ہولی کے راگ اونچے سروں میں گائے جاتے۔ گاؤں اور بستیوں کے چوراہوں پر جگہ جگہ الاؤ دہکنے لگے پھر ہولی کے روز ہر طرف رنگ کی پچکاریاں چلیں گی۔ ابیر اور گلال اڑایا جائے گا۔ اور اس کے بعد گیہوں اور جو کی فصلوں کی کٹائی شروع ہو جائے گی۔ شہروں میں محنت مزدوری کرنے والے دیہاتی ہولی کا الاؤ جلتے ہی اپنی بستیوں میں واپس آنا شروع ہو گئے تھے۔ ہر سال ایسا ہی ہوتا تھا۔ فصل کی بوائی کے بعد وہ قرب و جوار کے شہروں میں چلے جاتے، مزدوری کرتے اور فصل کی کٹائی پر لوٹ آتے۔

فیکٹری میں مزدوروں کا شور روز بروز مدھم پڑتا جارہا تھا۔ ان میں بڑی تعداد ایسے مزدوروں کی تھی، جو دیہات کے رہنے والے تھے۔ وہ دھیرے دھیرے فیکٹری کا کام چھوڑ کر بھاگنے لگے تھے۔ کمپنی نے گھبرا کر ان کی کئی ہفتے کی مزدوری روک لی۔ اب مزدوروں کے روکھے چہروں پر ہر وقت جھنجھلاہٹ چھائی

رہتی۔ وہ ٹائم کیپر کے دفتر کی اس کھڑکی کے سامنے اکٹھا ہوتے جہاں ہر ہفتے چٹھا بنتا تھا وہ زور زور سے چلاتے۔

"یہ مزدوری کیوں نہیں ملتی۔ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟"

"یہ سب کیا ہے؟ ہولی کا تہوار آرہا ہے، ہم کو پیسہ چاہیئے"

"ہاں جی، ہم کو اپنی مزدوری چاہیئے ہے"

"دان یا بھکشا نہیں مانگتے، محنت کی ہے اس کی مزدوری مانگتے ہیں"

لیکن مزدوری ابھی نہیں مل سکتی۔ کمپنی کو اپنی فیکٹری کی جلد سے جلد تعمیر کے لئے مزدوروں کی شدید ضرورت ہے اگر تعمیر رک گئی تو کمپنی کو زبردست نقصان ہوگا مگر مزدوروں کو کمپنی کے نفع نقصان سے غرض نہیں، وہ اب مزید نہیں ٹھہر سکتے انہیں ربیع کی فصل کی کٹائی کے لئے واپس جانا ہے۔ وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیختے۔ جھنجھلا کر گالیاں دیتے، پھر کسی روز تاروں کی چھاؤں میں سامان کی گٹھری سر پر رکھ کر اپنی بستی کی جانب روانہ ہو جاتے۔ غرضیکہ مزدوروں کی تعداد ہر گذرتے دن کے ساتھ کم ہوتی جا رہی تھی

روز بروز بگڑتی ہوئی اس صورتحال پر غور کرنے کے لئے بورڈ آف ڈائریکٹرز کی ایمرجنسی میٹنگ بلائی گئی، اور یہ طے کیا گیا کہ مزدوری بڑھادی جائے۔ فیکٹری کی تعمیر میں کسی قسم کی تاخیر نہیں ہونا چاہیئے۔ اس فیصلے کے بعد مزدوری میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔

ایک روپیہ چھ آنے یومیہ!

ایک روپیہ دس آنے یومیہ!

پونے دو روپے یومیہ!

مگر مزدوری بڑھانے کا تجربہ بھی کارگر ثابت نہ ہوا، بلکہ مزدوروں نے اور بھی تیزی سے بھاگنا شروع کر دیا۔ ہر روز ٹائم کیپر رجسٹر لے کر مینجنگ ڈائریکٹر کے دفتر میں جاتا اور سہمی ہوئی آواز میں رپورٹ سناتا۔ مینجنگ ڈائریکٹر جھنجھلا کر مزدوروں کے ساتھ، ساتھ ٹائم کیپر پر بھی برستا۔

ایک صبح شدید ذہنی خلفشار کے عالم میں مینجنگ ڈائریکٹر نے کیلاش ناتھ وانچو کو اپنے دفتر میں

بلایا اور اس سے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ "مسٹر وانچو! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ مزدوری کا ریٹ اس طرح کب تک بڑھایا جائے گا۔" اس کے چہرے پر جھنجھلاہٹ پھیل گئی۔ "مزدوری بڑھانے سے بھی تو وہ حرام زادے ٹھہرنے کو تیار نہیں ہیں، ہر روز ان کی تعداد کم ہی ہوتی جا رہی ہے۔"

وانچو بھی بجھا بجھا نظر آ رہا تھا۔ اس نے دبی زبان سے اپنی مجبوری بیان کی۔ "کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کیا کیا جائے۔ بات یہ ہے کنور صاحب کہ یہ ترائی کا علاقہ ہے۔ یہاں کی زمین بڑی زرخیز ہے اور اس سال تو یہ بھی مصیبت ہے کہ ربیع کی فصل بہت اچھی تیار ہوئی ہے۔ راشن کا زمانہ ہے کسانوں کے تو ٹھاٹھ ہو گئے۔ اب ان کو فیکٹری کی مزدوری کیا اچھی لگے گی۔" اس نے لمحہ بھر رک کر جھجکتے ہوئے کہا۔ "اور یہ زمینداری ابالیشن کی خبروں نے تو ان کا اور بھی دماغ خراب کر دیا ہے۔"

مینجنگ ڈائریکٹر، جو بہت بڑا زمیندار بھی تھا، یہ بات سن کر اور بھی زیادہ پریشان ہو گیا۔ غضب ناک ہو کر بولا۔ "تم نے تو پوری کتھا سنانا شروع کر دی۔ اس طرح کیسے کام چلے گا؟ یہ بتاؤ کہ لیبر کا بندوبست کیسے کیا جائے۔ کمپنی کی تعمیر کا کام کسی قیمت پر نہیں رکنا چاہیئے۔ ایسا لگتا ہے کہ تم کو کچھ اندازہ نہیں کہ فیکٹری میں کرشنگ شروع نہ ہوئی اور سیزن خالی گیا تو کمپنی کو کتنا زبردست نقصان ہو گا۔"

"ایسی بات نہیں ہے کنور صاحب مجھے اس کا پورا، پورا اندازہ ہے۔" وانچو نے فوراً صفائی پیش کی "ہمارے فارموں کی پیداوار سے تو فیکٹری کی ضرورت پوری نہیں ہو گی تب ہی تو آس پاس کے زمینداروں سے باقاعدہ معاہدہ ہو چکا ہے۔ ان کو ایڈوانس بھی دیا جا چکا ہے۔ اس دفعہ خریف کی فصل پر وہ گنے کی بوائی کا رقبہ بڑھا دیں گے۔ فصل کٹتے ہی یہ گنا پہنچنا شروع ہو جائے گا۔ معاہدے کی رُو سے کمپنی اسے خریدنے پر مجبور ہے، ورنہ ہرجانہ ادا کرنا پڑے گا۔"

"اس کے علاوہ بینکوں سے جو قرض لیا گیا ہے اس کا بیاج بھی برابر چڑھ رہا ہے۔" مینجنگ ڈائریکٹر نے کہا۔ "ایک پریشانی ہو تو بتاؤں۔ فیکٹری نے مقررہ وقت پر کام شروع نہ کیا تو ہم تباہ ہو جائیں گے۔ ادھر اپنا حال یہ ہے کہ کنسٹرکشن کا کام تیز ہونے کے بجائے ٹھپ ہوتا جا رہا ہے۔"

وانچو سر جھکائے چند لمحے خاموشی سے سوچتا رہا۔ پھر اس نے نظریں اٹھا کر مینجنگ ڈائریکٹر کی جانب

دیکھا۔ جھجکتے ہوئے اس سے کہا۔ "میں کئی روز سے ایک اسکیم پر غور کر رہا ہوں، لیکن اس میں خطرہ بھی ہے اور روپیہ بھی اچھا خاصا خرچ ہوگا۔"

"ذرا ہاتھ پاؤں بچا کے کام کرنا، روپے کی تم فکر نہ کرو۔ میں ڈائریکٹروں سے نپٹ لوں گا۔" کنور شیوراج سنگھ فوراً آمادہ ہو گیا۔ "یوں بھی کچھ کم خرچ ہو رہا ہے؟ اگر فیکٹری اس سال اسٹارٹ نہ ہوئی تو کمپنی دیوالیہ ہو جائے گی۔" اس کے لہجہ سے اعتماد جھلکنے لگا۔ "اس تباہی سے بچنے کے لئے ہر خطرہ مول لیا جاسکتا ہے۔ مطلب یہ کہ فیکٹری کے کنسٹرکشن کا کام کسی طرح بھی رکنا نہیں چاہیئے۔"

وانچو نے اس کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "آپ کے خیال میں فیکٹری کا یہ بنگالی کیمسٹ، پاریش کمار سانیال کیسا آدمی ہے۔ اس پر اعتبار کیا جاسکتا ہے؟"

"آدمی تو وہ قابل اعتبار معلوم ہوتا ہے۔" مینجنگ ڈائریکٹر گردن ہلا کر بولا۔ "انارکسٹ پارٹی میں کئی سال تک رہ چکا ہے۔ پولیس نے ایک بار اسے گرفتار بھی کر لیا تھا۔ بہت بری طرح ٹارچر کیا، مگر اس نے کچھ نہ اگلا۔ ذرا بھی سراغ نہ دیا۔ میرا خیال ہے تم اس پر اعتبار کر سکتے ہو۔"

وانچو نے چپراسی کو طلب کیا اور اسے ہدایت کی کہ سانیال کو بلا لائے۔

چند منٹ بعد پاریش کمار سانیال پہنچ گیا۔ وہ ادھیڑ عمر کا بنگالی تھا۔ اس کے بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ چہرا بھدا اور سپاٹ تھا۔ آنکھوں پر موٹے، موٹے شیشوں کا چشمہ تھا۔ وانچو نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا، پھر دریافت کیا۔ "پاریش بابو! پچھلے نومبر میں آپ کمپنی کے کام سے بمبئی گئے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، وہاں آپ نے گورنمنٹ لیباریٹری سے بھی کچھ مشورہ کیا تھا۔ وہاں آپ کا کوئی جان پہچان کا ہے؟"

"جی ہاں! میری وائف کے ایک رشتہ دار لیباریٹری میں کام کرتے ہیں۔" سانیال نے بتایا۔ "میں دو روز تک انہی کے فلیٹ میں ٹھہرا تھا۔"

وانچو کا مرجھایا ہوا چہرہ ذرا دمکنے لگا۔ وہ چٹکی بجا کر بولا۔ "تب تو کام بن جائے گا۔ دیکھیے آج رات کی گاڑی سے آپ دہلی چلے جائیں اور وہاں سے ہوائی جہاز کے ذریعہ بمبئی پہنچ جائیے۔ آپ کو

گورنمنٹ لیبارٹری میں ایک ضروری کام کرنا ہے۔ کام کی نوعیت اور دوسری تفصیلات میں آپ کو بعد میں پوری طرح سمجھا دوں گا۔ آپ سفر کے لئے تیار ہو جائیں۔"

"جیسا آپ کا حکم۔" سانیال تیار ہو گیا۔ اس کے رویہ سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بمبئی جانے کا پہلے ہی سے خواہش مند تھا۔

وانچو نے فون اٹھایا۔ سیٹ کے ریزرویشن کے لئے اسٹیشن ماسٹر سے گفتگو کی اور اسی وقت دس ہزار کا بینک ڈرافٹ پارتھ کمار سانیال کے نام تیار کروانے کی ہدایت بھی جاری کر دی۔

سہ پہر کو وانچو کے ساتھ بند کمرے میں سانیال دیر تک رازدارانہ گفتگو کرتا رہا۔ پروگرام کے مطابق رات کی ٹرین سے وہ دہلی کے لئے روانہ ہو گیا۔

پانچویں روز بمبئی سے سانیال کا ٹیلی گرام آیا۔ لکھا تھا "ہارڈویر کا بازار بہت خراب ہے۔ کرشنگ سلنڈر ابھی تک نہیں ملا۔" وانچو نے تار کو کئی بار پڑھا۔ اور اپنے دفتر میں خاموش بیٹھا اس کی خفیہ عبارت کے بارے میں غور کرتا رہا۔ اس کے چہرے پر پریشانی چھائی تھی۔

دو روز اور گزر گئے۔ بمبئی سے کوئی اطلاع نہ آئی۔ وانچو کی بے چینی بڑھنے لگی۔ وہ سخت پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس پریشانی میں اس کے رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیاں اور بدنما معلوم ہونے لگیں تھیں۔

کیلاش ناتھ وانچو کی پریشانی میں برابر اضافہ ہوتا گیا۔ انھی دنوں ایک روز بغیر کسی پیشگی اطلاع کے فیکٹری کا کیمسٹ، پارتھ کمار سانیال، گھبرایا ہوا وانچو کے دفتر میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے کے بھدے نقوش دھندلے، دھندلے نظر آ رہے تھے۔ وہ بہت تھکا ہوا اور نڈھال معلوم ہو رہا تھا۔

وانچو اسے دیکھ کر چونکا۔ کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جب وہ بیٹھ گیا تو وانچو نے دھڑکتے دل سے پوچھا "پارتھ بابو! کیا خبر لائے؟" اس کے لہجے سے تذبذب عیاں تھا۔

"کام تو بن گیا۔" سانیال نے آہستہ سے کہا۔

وانچو کے چہرے پر چھایا ہوا پریشانی کا غبار چھٹ گیا۔ اس نے مسکرا کر پوچھا "پھر تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں نظر آ رہے ہو؟"

"مجھے ایک شخص پر شبہ ہے کہ وہ بمبئی سے میرا پیچھا کر رہا تھا۔" سانیال نے مڑ کر دروازے کی جانب دیکھا، پھر وانچو کی جانب متوجہ ہوا۔ اس نے سرگوشی کی۔ "میں آپ کی ہدایت کے مطابق ہوائی جہاز کے بجائے ٹرین ہی سے آیا ہوں۔ وہ دو اسٹیشن پہلے رات کو خاموشی سے اتر گیا تھا، لیکن صبح میں یہاں پہنچا تو وہ پھر نظر آیا۔"

وانچو لمحہ بھر کے لئے خاموشی میں ڈوب گیا، پھر اس نے اعتماد کا اظہار کیا۔ "میرا خیال ہے تم کو مغالطہ ہوا۔"

"شاید ایسا ہی ہو۔" سانیال نے آہستہ سے کہا۔ "میں تو ایسا پریشان ہو گیا کہ گھر پر سامان رکھا اور سیدھا آپ کے پاس چلا آیا۔"

"اچھا اب تم جاؤ۔ نہا دھو کر آرام کرو۔" وانچو نے اسے اطمینان دلایا۔ "گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہی ہوگا۔"

سانیال خاموشی سے اٹھا اور باہر چلا گیا۔

وانچو اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا کھڑکی کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے پردہ ذرا سا سرکایا اور اس کی اوٹ سے باہر دیکھا۔ پارلیش کمار سانیال فیکٹری کے پھاٹک سے نکل کر اپنے کوارٹر کی سمت جا رہا تھا۔ جب ایک موڑ پر وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو وانچو مڑا اور واپس اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے ریسیور اٹھا کر مینجنگ ڈائریکٹر کو فون کیا۔ وہ اپنی کوٹھی پر موجود تھا۔ وانچو نے سانیال کی واپسی کی اسے اطلاع دی اور خود بھی دفتر سے نکل کر مینجنگ ڈائریکٹر کی کوٹھی کی طرف روانہ ہو گیا۔

وہ مینجنگ ڈائریکٹر کے پاس پہنچا اور دیر تک اس کے ساتھ بیٹھا باتیں کرتا رہا۔

پہر رات گزر چکی تھی۔ اندھیرا اب بڑھ گیا تھا اور ہوا فراٹے بھرتی ہوئی چل رہی تھی۔ کیلاش ناتھ وانچو نے جیپ کا اسٹیئرنگ سنبھالا اور ایکسیلیٹر دبا دیا۔ جیپ اسٹارٹ ہوئی اور آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ اس کی پچھلی سیٹ پر نیل کنٹھ خاموش بیٹھا تھا۔

جیپ روشن نگر روڈ کی طرف مڑ گئی۔ تیرہ میل تک پختہ سڑک تھی۔ جیپ سنسناتی ہوئی تیزی سے دوڑتی رہی، مگر جب ناہموار کچی سڑک شروع ہو گئی تو وہ جھٹکے لے کر بار بار کھڑکھڑاتی۔ وانچو جھٹکوں سے بے نیاز

اطمینان سے بیٹھا جیپ چلاتا رہا۔ اس کے چہرے پر پُر اسرار سکوت چھایا تھا۔

نیل کنٹھ پچھلی سیٹ پر بیٹھا سوچتا رہا کہ جھٹکوں سے اس کا سر بوجھل ہوتا جارہا ہے۔ باہر پھاگن کی ہوا چل رہی ہے جو ہولی کا سندیسہ لاتی ہے۔ ہولی، جو اب ختم ہو چکی ہے۔ اب تو گیہوں کی فصلوں کی کٹائی شروع ہو چکی ہے۔ ہنسیا کی تیز دھار سے لہلہاتی ہوئی گیہوں کی بالیاں کھیتوں میں جگہ جگہ ڈھیریوں میں اکٹھا ہوتی جارہی ہوں گی۔ جانے اشیر گڑھ کے خوبصورت گاؤں میں ابھی تک نیل کنٹھ مہاراج کو بھی کوئی یاد کرتا ہے جس کی پھرتیلی کٹائی کا چوپال پر بڑا چرچا رہا کرتا تھا۔ یکایک بین کی لے پر جھومنے والے ناگ کی مانند وہ خود فراموشی کے عالم میں بڑبڑانے لگا۔

"میں ایک کسان ہوں، ہاں، میں کسان ہوں"

پھر ایسا محسوس ہوا جیسے کہ کوئی اس کا گلا دبوچ کر سرگوشی کر رہا ہو "نہیں تو مجرم ہے۔ پولیس وارنٹ گرفتاری لئے تجھے ابھی تک تلاش کر رہی ہے۔"

نیل کنٹھ نے چونک کر دیکھا، سامنے وانچو اطمینان سے اسٹرنگ سنبھالے ہوئے بیٹھا تھا۔ جیپ پتھریلی سڑک پر ہچکولے کھارہی تھی۔ رتاروں کی مدھم روشنی میں کوہستانی چٹانیں سایوں کی طرح دور تک پھیلی ہوئی تھیں وانچو نے دفعتاً جیپ کو موڑا۔ آگے اس قدر گہری ڈھلوان تھی کہ جیپ فضا میں ڈولتی ہوئی محسوس ہوئی۔ نیل کنٹھ گھبرا کر اپنی سیٹ سے چمٹ گیا۔ جیپ کی رفتار اب سست پڑ گئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ درختوں کے نیچے کچھ دور تک چلتی رہی پھر وانچو نے اسے "دُور کر سڑک" کے نشیب میں اتار دیا۔ اس نے بریک لگائے اور جیپ اندھیرے میں ٹھہر گئی۔

دونوں جیپ سے نکل کر باہر آگئے۔ وانچو نے پچھلی سیٹ اٹھائی اور نیل کنٹھ کی مدد سے ڈائنامائٹ کا بکسہ جیپ سے باہر نکالا۔ یہ ڈائنامائٹ فیکٹری کا کیمسٹ، پارلیس کمار سانیال بمبئی سے اپنے ہمراہ لایا تھا۔ اسے سرکاری لیبارٹری سے اسمگل کیا گیا تھا، اور اس خفیہ کارروائی پر کمپنی کا نو ہزار سے زیادہ روپیہ خرچ ہوا تھا۔ وانچو نے اشارہ کیا اور نیل کنٹھ نے اسے اپنے مضبوط ہاتھوں میں اٹھا لیا۔

وانچو آگے بڑھا۔ نیل کنٹھ حسب معمول اس کے پیچھے، پیچھے چلا۔ دونوں سنبھل سنبھل کر چلتے رہے۔

ان کے قدموں کے نیچے خشک پتے دبی، دبی آہٹ پیدا کر رہے تھے درختوں کی شاخوں سے الجھتی ہوئی تیز ہوا ہانپتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی، اندھیرا بہت گہرا تھا اور چٹانوں کے درمیان سے گزرنے والی کویلا ندی کا شور صاف سنائی دے رہا تھا۔

دونوں اندھیرے میں احتیاط سے قدم اٹھاتے ہوئے آگے، اور آگے بڑھتے گئے، جب وہ ایک جھکے ہوئے ٹیلے کو عبور کر کے نشیب میں اترے تو پتھروں سے ٹکراتا ہوا ندی کا شور رات کے سناٹے میں ہیبتناک معلوم ہو رہا تھا۔ اس وادی میں کویلا ندی کا بہاؤ بہت تیز تھا۔ دونوں طرف اونچی، اونچی پہاڑیاں تھیں۔ ندی ایک موڑ سے نکل کر تیزی سے بہتی تھی یہاں سے ایک پگڈنڈی بائیں ہاتھ کو مڑتی تھی۔

وہ پگڈنڈی پر چلنے لگے۔ پگڈنڈی تنگ تھی اور اونچی نیچی چٹانوں کے درمیان سے بل کھاتی ہوئی گزرتی تھی۔ راستہ ناہموار تھا اور اندھیرا بھی تھا ہر طرف ہُو کا عالم طاری تھا۔ وانچو نے جیب سے چھوٹی سی ٹارچ نکالی اور اسے روشن کر لیا۔ اس کی ہلکی، ہلکی روشنی میں وہ ڈھلوان پر آگے بڑھنے لگے۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد کویلا ندی ایک بار پھر سامنے آ گئی یہاں بھی ندی کے دونوں جانب پہاڑی سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ وانچو نے ٹارچ بجھا کر جیب میں رکھ لی۔ اس مقام پر ندی کا بہاؤ سست پڑ گیا تھا۔

انہوں نے گھاٹی عبور کی۔ سامنے پانی کی جھیل تھی جو دھندلی، دھندلی روشنی میں جھلملا رہی تھی۔ جھیل کے جنوبی رُخ پر کویلا ڈیم تھا۔ یہ مختصر سا بند تھا جو ہائیڈرو الیکٹرک پیدا کرنے کے لئے تعمیر کیا گیا تھا۔ بند کے پشتے کے ایک طرف پاور ہاؤس کی پختہ عمارت تھی جس کی روشنیاں دُور سے ٹمٹماتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ اس مقام پر پانی بلندی سے شور مچاتا ہوا نشیب میں گرتا تھا۔ اور بہت تیزی سے بہتا تھا۔ اس تیز بہاؤ سے ٹکرا کر ان ٹربائنوں کے پنکھے تیزی سے گردش کرتے تھے، جن سے بجلی پیدا ہوتی تھی۔

جھیل کے ارد گرد تین فیٹ سے کچھ زیادہ چوڑی پختہ منڈیر تھی۔ دونوں منڈیر کے کنارے، کنارے اندھیرے میں چلتے رہے اور پشتے سے کچھ فاصلے پر رک گئے۔ پشتہ کنکریٹ اور پتھروں سے تعمیر کیا گیا تھا۔ پاور ہاؤس کی عمارت بھی پتھروں کی بنی ہوئی تھی۔ اور اب صاف نظر آ رہی تھی دو پہریدار اس کے پھاٹک کے سامنے سنگینیں سنبھالے ہوئے مستعدی سے کھڑے تھے۔

کیلاش ناتھ وانچو نے آہستہ سے نیل کنٹھ کو ایک بار پھر ہدایت کی "اب تم آگے چلے جاؤ اور ڈائنا مائٹ ٹھیک اسی جگہ فٹ کر دو، جہاں میں نے بتایا ہے پہریداروں پر برابر نظر رکھنا۔ دیکھو بہت ہوشیاری سے کام کرنے کی ضرورت ہے میں یہاں کھڑا ہوا تمہاری واپسی کا انتظار کرتا رہوں گا۔"

نیل کنٹھ خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔ ڈائنا مائٹ اس کے ہاتھوں میں دبا تھا اور وہ سنبھل سنبھل کر چل رہا تھا۔

وانچو ڈائنا مائٹ کے تار سنبھالے ہوئے ایک چٹان کی اوٹ میں دبک کر بیٹھ گیا۔ اس کی نگاہیں برابر نیل کنٹھ کا تعاقب کرتی رہیں۔ نیل کنٹھ اندھیرے میں جھکا، جھکا آگے بڑھ رہا تھا۔ پشتے کی نزدیک پہنچ کر وہ گہری تاریکی میں اوجھل ہو گیا۔ مگر وانچو کی نظریں ہنوز اسی کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔ اس کی سانس کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔

دھندلی، دھندلی روشنی میں پشتہ دور سے نظر آ رہا تھا۔ پشتے کے دوسری طرف نشیب میں بلندی سے گرتے ہوئے پانی کا شور ابھر رہا تھا۔ اس شور میں بکھری ہوئی ہوا کی سرسراہٹ بھی دب کر معدوم ہو گئی تھی۔ وانچو ٹکٹکی باندھے چوکنی نظروں سے پشتے کو تکتا رہا۔ یکایک دھندلی روشنی میں پشتے پر ایک انسانی سایہ لہرایا۔ اسی وقت پاور ہاؤس کی عمارت کے سامنے کھڑے ہوئے ایک پہریدار نے اونچی آواز سے للکارا۔

"ہالٹ!"

"ہے کون ہے پشتے پر ٹھہر جاؤ۔"

اس تنبیہ کے ساتھ ہی رائفل سے گولی چلنے کی تیز آواز گونجی۔ وانچو سراسیمہ ہو گیا۔

مگر نیل کنٹھ پشتے سے چمٹا ہوا ڈائنا مائٹ لگانے کی کوشش میں مصروف رہا۔ گولی اس کی کنپٹی کے قریب سے سنسناتی ہوئی زن سے گذر گئی۔ اس کے ہاتھ تیزی سے اپنا کام کرتے رہے۔ وہ مڑ مڑ کر پہریداروں کی جانب بھی دیکھتا رہا۔ وہ ابھی تک پاور ہاؤس کے سامنے کھڑے تھے اور گردنیں اٹھائے پشتے کی سمت دیکھ رہے تھے۔

وانچو بھی اندھیرے میں بیٹھا ہوا پشتے کی سمت گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ایک بار پھر گولی چلنے کی تیز آواز ابھری اور اس کی صدائے بازگشت دیر تک چٹانوں میں گونجتی رہی۔ وانچو کی سانس تیزی سے چلتے، چلتے معاً رک گئی۔ وہ پھٹی، پھٹی آنکھوں سے پشتے کو تک رہا تھا۔ پشتے پر گہری تاریکی چھائی تھی، نہ کوئی سایہ لہرایا، نہ آہٹ

ابھری، اسی خوف و ہراس کے عالم میں کچھ وقت گذر گیا۔

یکایک ڈائنا مائٹ کا تار زور زور سے ہلنے لگا یہ نیل کنٹھ کی جانب سے سگنل تھا کہ اس نے اپنا کام کر لیا لیکن وہ خود نظر نہ آیا۔ وانچو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نیل کنٹھ کو بے قراری سے تلاش کرنے لگا۔

ایک منٹ گزر گیا۔

دوسرا منٹ بھی بے چینی اور انتظار کے عالم میں گزر گیا۔

وانچو مزید انتظار نہ کر سکتا تھا۔ پہریدار پہلے ہی چوکنا ہو چکے تھے اور کسی بھی وقت دوڑتے ہوئے پشتے پر پہنچ سکتے تھے۔ وانچو نے جھنجھلا کر سوچا کہ تار کے ذریعہ ڈائنا مائٹ کا فلیتہ سلگا کر دھماکہ کر دے۔ خطرہ برابر بڑھتا جا رہا تھا اور نیل کنٹھ کا دور دور تک پتہ نہ تھا لیکن شدید خطرے کے باوجود وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ اسے نیل کنٹھ کی پرواہ نہ تھی مگر خدشہ یہ تھا ڈیم کی تباہی کے ساتھ نیل کنٹھ بھی پشتے پر ہلاک ہو گیا۔ اور بعد میں اس کی لاش شناخت کر لی گئی تو پولیس کو آسانی سے سراغ مل جائے گا۔ یہی سوچ کر وہ سخت اذیت ناک لمحات سے گزرتا رہا اور بے چینی سے پشتے کو تکتا رہا۔

وانچو اس ذہنی اذیت میں زیادہ دیر مبتلا نہ رہا۔ کچھ فاصلے پر ایک کبڑا سا سایہ نظر آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے نیل کنٹھ اندھیرے سے نکل کر سامنے آ گیا۔ وہ جھکا ہوا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ جب وہ نزدیک آ گیا تو وانچو نے صرف اس قدر دریافت کیا "سب ٹھیک ٹھاک ہے؟"

نیل کنٹھ نے گردن ہلا کر اسے اطمینان دلایا۔

وانچو نے بلا تاخیر اپنا کام شروع کر دیا۔ آن کی آن میں ڈائنا مائٹ خوفناک دھماکہ سے پھٹا۔ اس کی گھن گرج سے چٹانیں لرز کر رہ گئیں پشتہ گڑگڑاہٹ کے ساتھ ٹوٹ پھوٹ گیا جھیل کا پانی شور کرتا ہوا اس قدر تیزی سے نیچے گرنے لگا کہ زبردست سیلاب آ گیا۔ اس سیلاب میں پاور ہاؤس کی عمارت بھی ڈوب گئی کویلا ندی، جس کا بہاؤ سست پڑ گیا تھا، اب نشیب میں تیزی سے بہنے لگی تھی۔

وانچو نے کویلا ڈیم کی تباہی کو نظر انداز کیا اور نیل کنٹھ کے ہمراہ فوراً واپس ہوا۔ وہ جلد سے جلد جیپ کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ مگر نیل کنٹھ بار بار لڑکھڑا کر رک جاتا۔ پہریداروں کی ایک گولی نے اس کے کندھے

کو زخمی کر دیا تھا اور اس زخم سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ وہ ڈگمگاتا ہوا کسی نہ کسی طور جیپ کے نزدیک پہنچا تو اس کے پیر بالکل بے قابو ہو چکے تھے۔

وانچو نے جیپ اسٹارٹ کی اور تیزی سے دوڑانے لگا۔ وہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر فوری طور پر اس علاقے سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔ نیل کنٹھ پچھلی سیٹ پر بے سدھ پڑا تھا۔ وہ راستے بھر تکلیف سے کراہتا رہا۔ اس کے زخم سے خون رستا رہا۔ اس پر بے ہوشی کی سی کیفیت طاری تھی۔ وانچو نے اس کی حالت اس قدر غیر دیکھی تو سیدھا شہر پہنچا۔ اپنے اعتماد کے ایک ڈاکٹر سے اس کی مرہم پٹی کرائی اور فیکٹری کی جانب روانہ ہو گیا۔

رات کے پچھلے پہر جیپ فیکٹری کی حدود میں داخل ہوئی۔ نیل کنٹھ نڈھال اور لاغر نظر آ رہا تھا۔ وانچو اسی وقت مینجنگ ڈائریکٹر سے ملا۔ اسے اپنی کارگزاری سے مطلع کیا اور دیر تک بیٹھا اسی سلسلہ میں اس سے باتیں کرتا رہا۔

نیل کنٹھ کو عارضی طور پر کوارٹر کے بجائے مینجنگ ڈائریکٹر کی کوٹھی کے ایک حصہ میں ٹھہرا دیا گیا۔

کوکیلا ڈیم کی ہولناک تباہی سے ترائی کے علاقے میں سنسنی پھیل گئی۔ سرکاری حلقوں میں تہلکہ مچ گیا۔ فوری تحقیقات کا حکم جاری کیا گیا۔ تحقیقاتی افسروں نے بھاگ دوڑ شروع کر دی۔ اتفاق سے ڈاک بنگلے کی مرمت ہو رہی تھی۔ لہٰذا تحقیقات کرنے والے افسروں نے فیکٹری کے گسٹ ہاؤس کو استعمال کرنا چاہا۔ مینجنگ ڈائریکٹر نے ٹالنا چاہا، مگر کمشنر کے زور دینے پر بادل نخواستہ اجازت دینا پڑی۔

گسٹ ہاؤس کے تمام کمروں پر اب پولیس والوں کا قبضہ تھا۔ کچھ کمروں میں انکی رہائش تھی، اور کچھ میں ان کے دفاتر قائم تھے۔ آئے دن مشتبہ افراد کو پولیس کی حراست میں لایا جاتا۔ ان سے پوچھ گچھ کی جاتی۔ طرح طرح سے جبر و تشدد کیا جاتا۔ رات کے سناٹے میں ان کے چیخنے چلانے کی آوازیں بڑی ہولناک معلوم ہوتیں۔ فیکٹری میں کام کرنے والے پریشان اور سہمے ہوئے نظر آتے۔ کسی سے بات کرتے ہوئے ڈرتے۔ اس صورت حال سے وانچو سے زیادہ مینجنگ ڈائریکٹر پریشان تھا۔

انہی دنوں صوبائی وزیر مال کا داماد نرائن دلبھ، جو ایم۔ ایل۔ اے بھی تھا، اچانک فیکٹری میں پہنچا۔ اس کی کار مینجنگ ڈائریکٹر کی کوٹھی کے سامنے جا کر رکی۔ پہر رات گزر چکی تھی۔ مینجنگ ڈائریکٹر اپنی کوٹھی میں موجود تھا اور ابھی جاگ رہا تھا۔ ڈرائنگ روم میں دونوں کی ملاقات ہوئی۔ نرائن دلبھ کے تیور بگڑتے ہوئے تھے۔ اس نے

بیٹھتے ہی گلہ کیا۔

"کنور صاحب! یہ آپ نے سب کیا کرکے رکھ دیا ہے؟ مجھے تو ایسا جان پڑتا ہے کہ فیکٹری بننے کے بجائے اب تباہ ہونے والی ہے۔"

مینجنگ ڈائریکٹر پہلے ہی بوکھلایا ہوا تھا۔ نرائن دلبھ کی باتیں سن کر اور بھی بدحواس ہو گیا۔ کہنے لگا "بھئی اپنی سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا ہے۔ میں خود یہاں سے عاجز آگیا ہوں۔" اس کے لہجے سے پریشانی کے ساتھ، ساتھ بے زاری عیاں تھی۔

مگر نرائن دلبھ ذرا نہ پسیجا۔ تیکھے لہجے میں بولا۔ "اب تو آپ یہی کہیں گے۔ لیکن آپ کو کم از کم یہ تو سوچنا چاہیئے تھا کہ حکومت کا انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ اتنا بے وقوف نہیں کہ اتنی بڑی بات سمجھ نہ سکے۔ ہوم سیکرٹری کے پاس جو خفیہ رپورٹ پہنچی ہے اس میں فیکٹری پر شبہ ظاہر کیا گیا ہے اس لئے کہ کچھ عرصے سے لیبر کی جو کمی پڑ گئی تھی، ڈیم کے برباد ہوتے ہی خود بخود ختم ہو گئی۔ اسے دیکھ کر کون شبہ نہیں کر سکتا۔"

نرائن دلبھ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ کمپنی کو ان دنوں اپنے ایجنٹ مزدوروں کی بھرتی کے لئے گرد و نواح کی بستیوں میں نہیں بھیجنا پڑ رہے تھے۔ بلکہ اب تو فیکٹری کے بڑے پھاٹک کے سامنے صبح ہوتے ہی ایسے لوگوں کا ہجوم نظر آتا جو مزدوری کی تلاش میں دور، دور سے آتے تھے۔ کمپنی کا لیبر آفیسر ہر روز پچاس افراد کو اندر بلاتا۔ وہ اس کے سامنے قطار بنا کر کھڑے ہو جاتے۔ لیبر آفیسر ہر ایک کا جسم ٹٹول، ٹٹول کر گوشت کے مضبوط پٹھوں کا اندازہ لگاتا اور جس کو فٹ قرار دیتا اس کی چوڑی چکلی چھاتی پر چاک سے سفید نشان بنا دیتا۔ اس نشان کا مطلب یہ ہوتا کہ اسے فیکٹری میں بھرتی کر لیا گیا ہے۔ اسے چودہ آنے یومیہ مزدوری ملے گی۔ اس کا نام اور پتہ ٹائم کیپر حاضری کے رجسٹر میں درج کر لیتا۔ پھاٹک کے باہر کھڑے ہوئے لوگ مویشیوں کی طرح گردن اٹھا، اٹھا کر ساری کارروائی دیکھتے۔ بھرتی ہونے والوں کی قسمت پر رشک کرتے اور دن ڈھلے نڈھال اور تھکے ہوئے اپنے، اپنے ٹھکانوں کو واپس چلے جاتے۔

مینجنگ ڈائریکٹر نے نرائن دلبھ سے الجھنے کے متعلق کوشش نہ کی۔ شکست خوردہ لہجے میں گویا ہوا۔ "مجھے کیا خبر تھی کہ معاملہ اتنا سنگین ہو جائے گا۔" اس نے ساری ذمہ داری کیلاش ناتھ وانچو پر ڈال دی۔

"وانچو تو مجھ سے یہی کہتا رہا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں سب ٹھیک ٹھاک رہے گا۔"

وانچو کو مورد الزام ٹھہرا کر وہ کسی قدر مطمئن بھی ہو گیا اس وضاحت کا نرائن دلبھ پر بھی خاطر خواہ اثر ہوا۔ ویسے بھی کمپنی کا مینجنگ "ڈائریکٹر" ہونے کے علاوہ وہ رانی بازار کے علاقے کا بڑا جاگیر دار تھا۔ اس حقیقت سے نرائن دلبھ بخوبی واقف تھا۔ اس نے مینجنگ ڈائریکٹر کی تائید کرتے ہوئے وانچو ہی کو ذمہ دار ٹھہرایا۔ کہنے لگا۔ "آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔ مجھے تو پہلے ہی اندازہ تھا کہ یہ کیلاش ناتھ وانچو بڑا خطرناک آدمی ہے۔ آپ اس کی مجرمانہ ذہنیت کو نہیں سمجھتے۔ دیکھئے، اب تو یہی مناسب طریقہ ہے کہ اسی مسئلہ پر اسے ملازمت سے علیحدہ کر کے اپنا پیچھا چھڑا لیا جائے۔ وہ جب تک یہاں موجود ہے، ہر وقت خطرہ سر پر منڈلاتا رہے گا۔" اس کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ "کنور صاحب! آپ بالکل چنتا نہ کریں۔ میں سب کچھ سنبھال لوں گا۔ مگر اب وانچو کو یہاں ہرگز ہرگز نہیں رہنا چاہیئے۔"

مینجنگ ڈائریکٹر گہری سوچ میں گم ہو گیا وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ وانچو سے کسی طرح کا بگاڑ پیدا ہو جائے۔ وہ اس کے ہر راز اور ہر دھاندلی سے پوری طرح آگاہ تھا۔ نوکری سے اس طرح اچانک برطرف کئے جانے پر وانچو کے برہم ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ وہ انتقامی کارروائی کے طور پر اسے نقصان بھی پہنچا سکتا تھا اور بدنام بھی کر سکتا تھا۔ مینجنگ ڈائریکٹر نے وانچو کے معاملہ کو اس پہلو سے دیکھا تو پریشان ہو گیا۔

اس کی خاموشی کو نرائن دلبھ زیادہ دیر برداشت نہ کر سکا۔ بے چین ہو کر بولا۔ "کنور صاحب! آپ کس سوچ میں پڑ گئے؟"

"سوچ رہا تھا کہ وانچو کو ملازمت سے ہٹا دیا گیا تو پولیس آسانی سے اس پر ہاتھ ڈال سکتی ہے۔ اسے گرفتار کر کے شامل تفتیش کر سکتی ہے۔ وہ جتنا ہوشیار ہے، مجھے اتنا مضبوط نظر نہیں آتا کہ پولیس کا ٹارچر جھیل جائے۔ جہاں دو چار ہاتھ کرارے لگے۔ غیں، غیں کرنے لگے گا۔ سب کچھ اگل دے گا۔ ایسی صورت میں تو سرکاری گواہ بن کر وہ کمپنی کو بہت نقصان پہنچا سکتا ہے۔" مینجنگ ڈائریکٹر نے تجویز پیش کی۔ "میرا خیال تو یہ ہے کہ ملازمت سے برطرف کرنے کے بجائے کچھ عرصے کے لئے اسے یہاں سے ہٹا دیا جائے۔ بعد میں دیکھا جائے گا کہ اس کے بارے میں کیا فیصلہ کیا جائے۔"

مینجنگ ڈائریکٹر نے بات اس ڈھب سے کی کہ نرائن دلبھ ایم. ایل. اے کی سمجھ میں بھی آگئی۔ اس نے مینجنگ ڈائریکٹر کی رائے سے نہ صرف اتفاق کیا بلکہ اس کی دور اندیشی کا قائل بھی ہو گیا۔ وہ زیادہ دیر نہ رکا۔ مینجنگ ڈائریکٹر نے اصرار بھی کیا مگر وہ رات ہی کو واپس چلا گیا۔

نرائن دلبھ کے جانے کے بعد مینجنگ ڈائریکٹر نے وانچو کو بلوایا اور اسے صاف، صاف ان خطرات سے آگاہ کر دیا جن کا نرائن دلبھ نے اظہار کیا تھا۔ وانچو سراسیمہ ہو گیا۔ آخر مینجنگ ڈائریکٹر کے مشورے پر یہ طے ہوا کہ وہ نیپال کی راجدھانی کٹھمنڈو چلا جائے۔ وہاں اس کا ایک چچازاد بھائی پہلے ہی موجود تھا۔ مینجنگ ڈائریکٹر نے وعدہ کیا کہ پولیس کی تحقیقات ختم ہوتے ہی اسے واپس بلا لیا جائے گا۔ ساتھ ہی یہ بھی اطمینان دلایا کہ سرحد پار کرنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئے گی۔ رانا دلیر جنگ، جو حکومت نیپال کے ایک اہم رکن تھے، مینجنگ ڈائریکٹر کے شناسا تھے۔ دونوں کے دیرینہ مراسم تھے اور بہت خوشگوار تھے۔

کیلاش ناتھ وانچو کٹھمنڈو جانے پر رضامند ہو گیا تو یہ بھی طے ہوا کہ جب تک نیپال میں رہے گا اسے ایک ہزار روپے ماہانہ مینجنگ ڈائریکٹر کی جانب سے پہنچتا رہے گا۔

دوسرے روز وانچو فیکٹری کی کار میں بیٹھ کر اسٹیشن کی جانب روانہ ہو گیا۔ مینجنگ ڈائریکٹر کے سوا کسی کو نہیں معلوم کہ وہ کہاں جا رہا تھا۔ فیکٹری میں کام کرنے والے صرف اس قدر جانتے تھے کہ وہ کمپنی کے کسی ضروری کام کے سلسلہ میں کلکتہ جا رہا تھا۔ وانچو کار میں خاموش بیٹھا ہوا فیکٹری کو کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھتا رہا جس کی تعمیر کے لئے اس نے خطرناک سازشیں کی تھیں، سنگین جرائم کئے تھے۔ اب وہ فیکٹری اس کی نظروں سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ وانچو کی گہری نیلی آنکھیں اب بجھی، بجھی معلوم ہو رہی تھیں۔

ڈیم کے تباہ ہو جانے کے بعد کوکیلا ندی میں بھیانک سیلاب آگیا تھا۔ بپھری ہوئی لہریں ترائی کے نشیبی علاقے میں، شب خون مارنے والے غنیم کی طرح پھیلتی جا رہی تھیں۔ گیہوں کی لہلہاتی ہوئی فصلیں پانی کے تیز ریلے میں بہہ گئی تھیں۔ بستیاں غرق آب ہو کر ویران ہوتی جا رہی تھیں۔ تباہ حال کسان گھروں کو چھوڑ، چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔

راہیل روڈ پر بے گھر لوگوں کے قافلے گزرتے رہتے تھے۔ سیلاب زدگان کی فوری امداد کے لئے ایر گڑھ میں سرکار نے ریلیف کیمپ قائم کر دیا تھا۔ اس سلسلہ میں حکومت کی جانب سے جو پریس نوٹ جاری کیا گیا، اس میں کہا گیا تھا کہ کویلاڈیم کی تباہی میں کمیونسٹ دہشت پسندوں کی تخریب کاری کو دخل ہے، جو اپنے سیاسی مقاصد کے تحت ملک میں بے اطمینانی اور گڑبڑ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اسی الزام کی بنیاد پر پولیس نے کسان سبھا کے دفتر پر چھاپہ مار کر لیڈروں کے ساتھ، ساتھ کتنے ہی کسان ورکروں کو گرفتار کر لیا تھا اور جیلوں میں ڈال دیا تھا۔

کیلاش ناتھ وانچواب کٹھمنڈو میں ہے۔ اور نیل کنٹھ کو مینجنگ ڈائریکٹر کی کوٹھی سے رانی بازار منتقل کر دیا گیا ہے۔ وہ کنور شیوراج سنگھ کی عالیشان حویلی کے پچھواڑے، مٹی اور پھوس کی بنی ہوئی کوٹھریوں میں سے ایک تنگ اور تاریک کوٹھری میں لیٹا ہوا آہستہ، آہستہ کراہ رہا ہے۔ اس کا زخم ابھی مندمل نہیں ہوا ہے۔ کندھے پر سفید پٹیاں لپٹی ہوئی ہیں۔ اس کا مضبوط پٹھوں والا ٹھوس آبنوسی جسم پگھل کر چھپکلی کے پیٹ کی مانند زردی مائل ہو گیا ہے۔ رات ڈھلتی جا رہی ہے۔ نیل کنٹھ کے جسم میں بار، بار ٹیس اٹھتی ہے۔ وہ بے چینی سے بستر پر کروٹیں بدل رہا ہے۔ اس پر غشی کے دورے پڑ رہے ہیں۔ سانس رک، رک جاتی ہے۔ اسی روز مینجنگ ڈائریکٹر نے کمشنر کے اعزاز میں اپنی کوٹھی کے وسیع لان پر شاندار ڈنر دیا۔ جس کا ہنگامہ رات گئے تک برپا رہا۔

اجنبی

جب اور کوئی پروگرام سمجھ میں نہ آیا تو سوچا، چلو تھوڑی سی بیئر ہی پی ڈالی جائے۔ اس روز موڈ ہی کچھ ایسا تھا۔

ستمبر کی راتیں بڑی سہانی ہوتی ہیں اور یہ ان سہانی راتوں میں سے ایک رات تھی۔ ہوا میں کچی کلیوں کی مہک تھی۔ تیکھا پن تھا اور بڑی خوشگوار خنکی تھی۔ ہر طرف اُجلی، اُجلی چاندنی بکھری ہوئی تھی۔ اور میں اس بکھری ہوئی چاندنی میں ولیریو بار میں داخل ہو گیا۔ باہر لان میں میزیں پڑی تھیں۔ ملی جلی آوازوں کے ساتھ تیز قہقہے گونج رہے تھے۔ ہلکی نیون لائٹ میں فضا خواب میں ڈھکی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ میں چپ چاپ ایک خالی میز کے قریب پہنچا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ آنے کو تو میں یہاں آ گیا مگر اس احساس سے کچھ گھبراہٹ معلوم ہونے لگی کہ میں بالکل تنہا ہوں اور تنہا آدمی مجھے شراب پیتا ہوا بالکل ایسا ہی معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر تقریر کرنے کی مشق کر رہا ہو۔ ابھی میں سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ برابر والی میز سے کسی نے بے تکلفی سے کہا۔

"آئیے! اسی طرف آ جائیے۔"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اکیلا ہی تھا۔ اس کے سامنے گلاس رکھا ہوا تھا، جس میں ابھی تھوڑی سی شراب موجود تھی۔ وہ میری طرف نظریں اٹھائے بے نیازی سے مسکرا رہا تھا۔ میں نے پہچاننے کی کوشش کی، مگر پہچان نہ سکا۔ مجھے خاموش پا کر اس نے اپنا گلاس اٹھایا۔ میرے پاس آیا اور کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا۔ ہنس کر گویا ہوا۔

"آپ تو خواہ مخواہ تکلف کرنے لگے۔ لیجئے میں خود ہی یہاں آ گیا۔"

اس دفعہ میں بھی مسکرا دیا۔ وہ میری طرف جھک کر بتانے لگا۔ "دراصل ایک صاحب سے میرا یہاں اپائنٹمنٹ تھا۔ مگر خدا معلوم وہ کیوں نہیں آئے۔ میں ان کے انتظار میں یہاں اکیلا بیٹھا بور ہو رہا ہوں۔ سچ پوچھئے تو اکیلے بیٹھ کر پینا بڑا اَکورڈ معلوم ہوتا ہے۔ سوچا آپ بھی تنہا ہیں اور میں بھی۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے۔" وہ ٹھٹا مار کر ہنسنے لگا۔ لیکن مجھ سے کچھ بھی نہ کہا گیا۔ وہ جس تیزی سے بے تکلف ہوتا جا رہا تھا میں اسی قدر تکلف محسوس کر رہا تھا۔

اس نے بیرے کو بلایا اور مجھ سے پوچھنے لگا۔ "آپ کے لئے کیا منگواؤں؟"

میں نے کہا۔ "میں تو صرف بیئر پیوں گا۔"

کہنے لگا۔ "یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی، کچھ اور پیجئے۔"

مگر میں نے اصرار کیا تو اس نے ایک بیئر اور ایک وہسکی لانے کا آرڈر دے دیا۔ لیکن جب بیرا بیئر کے ساتھ وہسکی لے کر آیا تو میری نیت کچھ بدلنے لگی۔ اس لئے کہ میں بیئر کو شراب نہیں سمجھتا۔ بیئر پینا تو ایسا ہی ہے کہ فلم دیکھنے کے بجائے صرف ٹیلر پر اکتفا کر لیا جائے۔

وہ گلاس میں سوڈا ڈالتے ہوئے بولا۔ "تفصیلی انٹروڈکشن تو پھر ہوتا ہی رہے گا، لیکن میں اتنا بتا دوں کہ میرا نام دلاور ہے۔ حالانکہ میں بڑا بزدل واقع ہوا ہوں۔ خاص طور پر بھوتوں سے بہت ڈرتا ہوں۔"

میں نے ہنس کر کہا۔ "یقین مانئے میں بھوت نہیں ہوں۔ مجھے فہیم کہتے ہیں۔"

ہم دونوں ٹھٹا مار کر دیر تک ہنستے رہے۔

آخر اس نے اپنا گلاس اٹھایا اور اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بڑے ڈرامائی انداز میں کہنے لگا۔ "ہائے کیا چیز ہوتی ہے یہ ظالم بھی۔ کتنا سکون ملتا ہے اس میں۔ زندگی کی کتنی تلخیاں ہیں جو میں نے اس میں ڈبو دی ہیں۔ غم غلط کرنے کے لئے اس سے زیادہ اور کوئی سہارا نہیں۔ کیوں فہیم صاحب کیا خیال ہے آپ کا؟"

میں نے جواب دیا۔ "بات تو یہی ہے۔" حالانکہ شراب نہ تو غم غلط کرنے کے لئے پیتا ہوں اور نہ ایک گونا بے خودی کے لئے۔ اس لئے کہ نہ میں عاشقِ نامراد ہوں، نہ آرٹسٹ۔ شراب تو میں صرف اس لئے پیتا ہوں کہ

کبھی، کبھی ذرا ڈان ژوان پوز کرنے کو دل چاہتا ہے۔

دلاور نے گلاس ہونٹوں کے قریب لے جاکر کہا۔ "اس رات کی یاد میں"! اور ایک بڑا سا گھونٹ بھر کر بڑبڑانے کے سے انداز میں آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ "یوں تو ہم آئندہ بھی ساتھ بیٹھ کر پیتے رہیں گے۔ لیکن یہ رات زندگی میں یاد رہ جائے گی۔ ایک بار جام ٹکرانے کے بعد ایک دوسرے کو بھول جانا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔"

پھر ہوا بھی ایسا ہی۔ گیارہ بجے کے قریب جب ہم دونوں ڈیلریو سے باہر نکلے تو اتنی باتیں کر چکے تھے جیسے ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہوں۔

دوسرے روز شام کو اس نے کافی ہاؤس میں ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن نو بجے رات تک انتظار کرنے کے بعد بھی وہ وہاں نظر نہ آیا۔ میں کئی روز تک کافی ہاؤس جاتا رہا۔ لیکن اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ اس کے نہ ملنے پر مجھے کچھ کوفت بھی ہوئی۔ بات یہ تھی۔ کہ ان دنوں میں بالکل اجنبیت کی سی زندگی گزار رہا تھا۔ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی میں میرا اسی مہینہ میں تقرر ہوا تھا۔ میں یہاں بالکل نو وارد تھا۔ اور جس طرح نیا گھوڑا پہلے پہل تھان پر بدکتا ہے اسی طرح میں بھی دفتر کے ماحول سے کتراتا ہوں اور کلرکوں کے طبقہ سے تو مجھے یوں بھی بُغض للّٰہی ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ میں کئی بار پبلک سروس کمیشن سے قسمت آزما چکا ہوں اور ہر بار نا امیدی کا منہ دیکھ چکا ہوں۔ لیکن اس میں میرا کیا قصور ہے۔ یہ تو سب قسمت کا کھیل ہے اور قسمت صرف ری سورسز ہی سے قابو میں آسکتی ہے۔ اس لئے کہ نہ تو میں کسی وزیر کا بھانجا، بھتیجا ہوں، نہ کسی سکرٹری یا بڑے سرکاری عہدیدار کا ہونے والا داماد ہوں اور نہ کبھی میرے باپ کو کسی اسمبلی کا ممبر منتخب ہونے کی توفیق ہوئی۔ میرے ری سورسز تو صرف اسی قدر ہیں جن کے بل پر میں ٹھاٹھ سے کلرکی کرتا ہوں اور ایک سو بیس روپے ماہوار پر پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کی بوسیدہ بیرک میں بیٹھ کر فائیلوں سے سر کھپاتا رہتا ہوں۔

ایک سہ پہر کا ذکر ہے۔ میں دفتر سے اُٹھ کر گھر جا رہا تھا۔ اچانک بس اسٹینڈ پر دلاور نظر آگیا۔ دیکھتے ہی بڑی بے تکلفی سے بولا۔ "اوہو فہیم صاحب آپ ہیں! کہئے کہاں سے آرہے ہیں۔ بڑے مضمحل اور تھکے ہوئے سے نظر آرہے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "میں تو دفتر سے آرہا ہوں۔ مگر آپ آج کل کہاں رہتے ہیں؟ اس رات کے بعد کہیں نظر ہی

نہیں آئے۔"

کہنے لگا "آج کل شام کا وقت زیادہ تر بلیرڈ روم میں گزرتا ہے اور شام ہی پر کیا منحصر، آج بھی دوپہر سے وہیں تھا۔"

میں نے پوچھا "اچھا تو اب کیا پروگرام ہے؟"

"میں تو اب سیدھا گھر ہی جاؤں گا۔ نہا دھو کر شام کو نکلوں گا۔ طبیعت بڑی مکدر ہو رہی ہے۔"

میں نے ہنس کر کہا "اگر صرف اسی غرض سے آپ واپس جا رہے ہیں تو میرا مکان یہاں سے قریب ہے۔ وہیں نہا دھو لیجئے گا۔"

بغیر کسی عذر کے وہ میرے ہمراہ چل دیا۔ گھر پہنچ کر اس نے غسل کیا۔ چائے پی۔ ہم دونوں ساتھ، ساتھ باہر نکلے اور کافی ہاؤس چلے گئے۔ کوئی دو گھنٹہ تک وہاں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ کافی پیتے رہے۔ پھر دلاور کے پاس کسی کالج کا ایک لیکچرار آ گیا۔ وہ مجھ سے اجازت لے کر اس کے ساتھ چلا گیا۔ میں کچھ دیر تک کافی ہاؤس میں اور بیٹھا رہا۔ اُٹھ کر باہر سڑک پر آیا تو میں نے دیکھا وہ کالج کے لیکچرار کے ساتھ سیوائے بار میں داخل ہو رہا تھا۔

اس روز کے بعد بھی وہ اکثر ملتا رہا۔ میں نے اس کے ساتھ کافی ہاؤس میں شامیں گزاریں۔ دلیر یو بار میں وہسکی کی چسکی لگا کر قہقہے لگائے اور کبھی کبھی رات گئے تک سنسان سڑکوں پر محض آوارہ گردی کرتے رہے اور جہاں تک راتوں کی اس آوارہ گردی کا تعلق ہے، پہ سچ تو یہ ہے کہ مجھے خود بھی شب بیداری کا مرض ہے۔ حالانکہ جب سے برلازمت اختیار کی ہے مجھے اپنی اس عادت سے اکثر بڑی شرمندگی اُٹھانا پڑتی ہے۔ اس لئے کہ میں دن چڑھے تک سونے کا عادی ہو گیا ہوں اور ہمیشہ دفتر دیر سے پہنچتا ہوں۔ اس تاخیر کے باعث کئی بار ایس۔ ڈی۔ او کی جھڑکیاں بھی سن چکا ہوں۔

ایک بار تو ایسا ہوا کہ اس مرض سے اس قدر عاجز آ گیا کہ ڈاکٹر کے پاس سنجیدگی سے علاج کرانے کے لئے پہنچ گیا۔ اس نے پوری توجہ کے ساتھ میرا معائنہ کیا۔ آنکھیں دیکھیں، زبان نکلوا کر دیکھی اور اِدھر اُدھر کے سوالات کرنے کے بعد بتایا کہ میں ذہنی انتشار میں مبتلا ہوں۔ مگر ڈاکٹر کے اس انکشاف پر مجھے ذرا بھی حیرت نہ ہوئی۔ سوچا

یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ انتشار تو پوری سوسائٹی میں ہے۔ اور جب سماج ہی میں پراگندگی ہو تو اس میں بسنے والوں کو سکون کہاں نصیب ہو سکتا ہے۔ مگر یہ بات میں کہہ نہ سکا۔ اس لئے کہ میں اپنا علاج کرانے گیا تھا سوشیالوجی پر بحث کرنے نہیں۔

میرا اپنا خیال یہ ہے کہ میں کسی بیماری میں مبتلا نہیں ہوں۔ میں فطرتاً بوہیمین واقع ہوا ہوں اور ہر وہ شخص جو اس سماج سے مطمئن نہیں ہے اور جس کے سامنے کوئی واضح پروگرام نہیں ہے، وہ بدحواسی کے عالم میں زندگی سے بھاگتا پھرتا ہے۔ اسی لئے میں زندگی میں کسی بھی ترتیب کا قائل نہیں ہوں۔ یوں تو میرے سر کے بال ہمیشہ الجھے ہوئے رہتے ہیں۔ قمیض کے بٹن ٹوٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بال پریشان اور چاک گریباں تو میں رہتا ہی ہوں، لیکن جن لوگوں نے میرا کمرہ دیکھا ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میرا کمرہ بکھری ہوئی اشیاء کے انبار میں اچھا خاصا کباڑ خانہ معلوم ہوتا ہے۔ ویسے مجھے کباڑیوں کی دکانیں پسند بھی ہیں۔ میں وہاں اکثر جاتا ہوں اور دیر تک پرانی چیزوں کو دیکھتا رہتا ہوں۔ سجی سجائی دکانوں پہ تو میں خواہ مخواہ جاتا ہوں اور بلا ضرورت بہت سا سامان نکلوا کر بکھیر دیتا ہوں۔ اس کے لئے بلا وجہ مجھے کچھ نہ کچھ خریدنا بھی پڑتا ہے۔ یہی نہیں مجھے آج تک کسی نے قطار میں کھڑے ہوئے نہیں دیکھا ہوگا۔ میں تو قطار کو درہم برہم کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور اس کوشش میں ایک بار تو پٹتے پٹتے بال بال بچ گیا۔ لیکن اس قدر بے ترتیبی کا قائل ہونے کے باوجود اکثر سوچتا ہوں کہ مجھے باقاعدگی اختیار کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ اب میں پی ڈبلیو ڈی میں کلرک ہوں اور کلرکی کے لئے تنظیم بنیادی شرط ہے۔ حالانکہ راز کی بات یہ ہے کہ یہ تنظیم ایسی ہی ہے جیسے انگریز اپنے کتوں کی دُمیں جسمانی تناسب کے لئے کٹوا دیتے ہیں۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ یہ تنظیم ذہن کو مسخ کرنے کے لئے عائد کی جاتی ہے۔

دلاور کے ساتھ اسی طرح میرا وقت گزرتا رہا اور جب ہم نے ایک دوسرے کی ضرورت کو اپنے وجود میں پیدا کر لیا اور ایک دوسرے کی اہمیت محسوس کرنے لگے تو وہ اچانک پھر کہیں غائب ہو گیا۔ میں پھر تنہائی محسوس کرنے لگا۔ یہ تنہائی کا احساس ایسا ہی تھا جیسے کسی بے تحاشا سگریٹ پینے والے کو یک لخت سگریٹ نوشی چھوڑ دینا پڑے۔

یہ انہی دنوں کی بات ہے۔ اس روز بھی رات کو میں حسب معمول دیر سے سویا تھا۔ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ کمرے

میں کسی کے خراٹوں کی آواز ابھر رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کون ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ میرے ساتھ اور کوئی نہیں رہتا۔ میں خوفزدہ ہو کر ذرا دیر اندھیرے میں خاموش لیٹا رہا پھر میں نے سہمی ہوئی آواز میں آہستہ سے کہا۔

"کون ہے؟"

جواب تو کوئی نہ ملا۔ البتہ کپڑوں کی سرسراہٹ سنائی دی۔ خراٹے بھی بند ہو گئے۔ میں اور بھی سہم گیا۔ اس دفعہ ذرا زور سے آواز دی۔

"کون ہے۔ بولتے کیوں نہیں؟"

اندھیرے کمرے میں مجھے دلاور کی آواز سنائی دی۔ وہ خفا ہونے کے سے انداز میں کہہ رہا تھا۔

"اتنا چیخ کیوں رہے ہو۔ ہوگا کون، میں ہوں!"

میں نے بجلی کا سوئچ دباتے ہوئے پوچھا "تم یہاں آ کدھر سے گئے؟"

میں نے روشنی میں دیکھا وہ ایک کرسی پر سکڑا ہوا بیٹھا تھا۔ آنکھیں ملتے ہوئے کہنے لگا۔ "آ کدھر سے جاتا۔ سامنے والے دروازے سے آیا ہوں۔ تمھیں دروازہ تک تو بند کرنے کا ہوش نہیں رہتا۔" پھر اس نے جیب سے سگرٹ نکال کر سلگائی اور بڑبڑانے لگا۔ "خواہ مخواہ نیند خراب کر دی۔"

میں نے ہنس کر کہا۔ "مجھے کیا معلوم تھا کہ تم ہو۔ تم نے مجھے جگا لیا ہوتا اور اس کرسی پر تمھیں نیند کیسے آ گئی۔؟"

کہنے لگا۔ "چار بجے رات کے بعد مجھے ہر جگہ نیند آ جاتی ہے۔"

میں نے دریافت کیا۔ "اس وقت تم آ کہاں سے رہے ہو۔ اتنے دنوں سے رہے کہاں؟"

اس نے بے زاری سے کہا۔ "ارے بھئی کچھ پوچھو نہیں۔ وہ سالا چوپڑا آج کل دھلی سے آیا ہوا ہے۔ کسی وقت پیچھا ہی نہیں چھوڑتا۔ گھر سے آ کر لے جاتا ہے۔ امپیریل ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔ رات بھر اس کے کمرے میں پوکر ہوتا ہے اور پینے پلانے کا شغل بھی چلتا ہے۔ اس وقت بھی وہیں سے آ رہا ہوں۔ وہ لوگ تو سالے ابھی تک جمے ہوئے ہیں۔ مگر مجھے نیند معلوم ہو رہی تھی۔ میں تو اپنی جان چھڑا کر بھاگا۔"

میں نے کہا۔ "تو اب سو جاؤ۔ صبح چلے پی کر چلے جانا۔"

ہنس کر بولا۔ "اب کون سی صبح ہوگی چھ تو بج رہے ہیں۔ اچھا یہ بتاؤ تمھارے پاس کچھ روپے ہوں گے۔ میں تو

سب کچھ وہاں ہار آیا۔"

مجھے اسی ہفتہ تنخواہ ملی تھی۔ ابھی تک کچھ روپے موجود تھے۔ میں نے اُٹھ کر کوٹ کی جیب سے روپے نکالے اور اس سے پوچھنے لگا۔ "کتنے روپے چاہئے ہیں؟"

کہنے لگا "پس بیس روپے ہوں تو دیدو۔ ابھی تو انہیں سے کام چل جائے گا۔ پرسوں ہی تو ابا جان سے روپے لئے تھے۔ آج کہوں گا تو بھڑک اٹھیں گے۔"

میں نے بیس روپے نکال کر اس کو دیدیئے۔ وہ ذرا دیر تک بیٹھا باتیں کرتا رہا پھر اُٹھ کر چلا گیا۔ اس رات کے بعد وہ پھر کچھ دنوں کے لئے لاپتہ ہو گیا۔

اچانک ایک شام کو وہ میرے مکان پہ کچھ گھبرایا ہوا سا آیا۔ آتے ہی اپنا کوٹ اتار کر پلنگ پر پھینک دیا اور سیدھا غسل خانے میں گھس گیا۔ جب نہا دھو کر باہر نکلا تو مجھ سے پوچھنے لگا: "کوئی اچھا سا سوٹ ہو تو نکالو۔ گھر جانے کا وقت نہیں۔ ذرا جلدی میں ہوں اور پھر جواب کا انتظار کئے بغیر میرا نیا سوٹ ہینگر پر سے اتار کر پہننے لگا۔ میں نے ہنس کر پوچھا۔

"یہ آج کہاں جانے کی تیاریاں ہیں؟"

مسکرا کر بولا "آج عارف کے ہاں بنارس والی ستارا کا مجرا ہے۔ بہت عمدہ پروگرام ہے۔ تم بھی چلو۔"

مگر میں نے جانا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے سوٹ پہنا۔ آئینہ میں اپنا عکس دیکھا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

اس دن کے بعد وہ پھر کچھ عرصہ کے لئے روپوش ہو گیا۔

لیکن جس طرح اچانک غائب ہوا تھا، اسی طرح ایک روز پھر مل گیا۔ میں نے غائب رہنے کی وجہ پوچھی تو وہ صرف مسکرا کر رہ گیا۔ میں نے غور کیا کہ کبھی کبھی وہ خواہ مخواہ مسکرایا کرتا تھا۔ میں یہی سمجھتا رہا کہ وہ میری کسی بات پر مسکرا رہا ہے اور جب میں نے اس کا سبب جاننے کی کوشش کی تو اس کی مسکراہٹ اور بھی پُراسرار ہو جاتی۔ اس مسکراہٹ کے ساتھ، ساتھ مجھے خود اس کی شخصیت بھی ایک مسٹری معلوم ہونے لگتی۔

ان دنوں اس کی جیبیں بالکل خالی رہا کرتی تھیں۔ مہینہ کی آخری تاریخیں ہونے کی وجہ سے میں بھی قلاش تھا۔ سگریٹ کے لئے تو اس نے کئی دکانوں پر اُدھار چلا رکھا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ میں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ اکثر پی

کرآتا تھا اور یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اس لئے کہ مجھے معلوم تھا کہ کسی بھی بار میں قرض اُدھار نہیں چلتا تھا۔

ایک رات جب وہ خوب پیئے ہوئے تھا اور اس کے قدم نشہ سے لڑکھڑا رہے تھے، میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

"معلوم ہوتا ہے تم نے بار میں بھی قرض اُدھار کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ لیکن یہ ہوا کیسے؟"

وہ ڈرامائی انداز میں قہقہہ لگا کر بولا۔ "بغیر قرض ادھار کے کہیں اپنا کام چلتا ہے۔ ارے یہ تو شراب ہے۔ اپنا تو بالا خانوں پر بھی کریڈٹ چلتا ہے اور یقین نہ ہو تو ابھی میرے ساتھ چل کر دیکھ لو۔ بولو کیا کہتے ہو۔"

میں سچ مچ ششدر رہ گیا۔ مگر وہ کہتا رہا۔ "آؤ چلو، آج یہی سہی، تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کسی رئیس سے سابقہ پڑا تھا۔"

مگر میں آمادہ نہ ہوا۔ اس لئے کہ وہ تو خوب چڑھائے ہوئے تھا اور میں نے کافی بھی نہیں پی تھی۔ ان دنوں جیب میں اتنے بھی پیسے نہ تھے۔ لیکن اس مفلسی کے باوجود اس نے ایک تانگہ روکا اور اس میں سوار ہو گیا۔ مجھے بھی ساتھ بٹھا لیا۔ ہم دونوں ویران سڑکوں پر تانگے میں بیٹھے ہوئے گھومتے رہے۔ آخر گھر واپس پہنچے ہم دونوں تانگے سے نیچے اترے۔ میں تو کرایہ ادا کرنے کے خیال سے سخت گھبرایا ہوا تھا۔ مگر اس نے اطمینان سے سگرٹ نکال کر سلگائی۔ تانگہ والے کی جانب دیکھا۔ مسکرا کر پوچھا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

اس نے بتایا۔ "ساب مجھے عبداللہ کہتے ہیں۔"

دلاور کہنے لگا۔ "دیکھو بھئی عبداللہ اس وقت تو ہم اپنی جیبیں بالکل خالی کر چکے ہیں۔ اب رات بہت ہو چکی ہے۔ گھر پر کسی کو جگایا نہیں جا سکتا۔ تم سویرے آ کر اپنا کرایہ لے جانا۔"

عبداللہ کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ اس نے جھٹ ایک سگرٹ نکال کر اس کو دی اور ذرا بے تکلفی سے بولا۔

"لو یار تم سگرٹ تو پیو اور اس سامنے والے دروازے کو پہچان لو، صبح یہیں آ کر آواز دے لینا اور اگر تم سویرے یہاں نہ آنا چاہو تو شام کو کیفے دلربا کے پاس تانگہ اسٹینڈ پر مل جانا۔" اس نے قدرے تامل کیا،

پھر پوچھا" اور ہاں تمھارے تانگے کا نمبر کیا ہے؟" اور جھک کر تانگے کا نمبر دیکھنے لگا۔

عبداللہ نے کوئی حیل حجت نہیں کی۔ سگرٹ سلگائی اور کش لگاتا ہوا تانگے میں جاکر بیٹھ گیا۔ ہم دونوں گھر کے اندر آگئے۔ جب کپڑے تبدیل کرکے اطمینان سے بیٹھا تو میں نے دلاور سے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔

"تم نے صبح تانگے والے کو بلا تو لیا، مگر سویرے ہی سویرے کرائے کا انتظام ہوگا کیسے؟"

وہ بے نیازی سے بولا" یار! صبح کی صبح دیکھی جائے گی۔ اس وقت کیوں بیکار میں نیند خراب کر رہے ہو۔ اور بھئی وہ صبح آئے گا ہی نہیں، تم دیکھ لینا۔"

لیکن مجھے یقین نہ آیا۔ میں دیر تک بستر پر لیٹا ہوا سوچتا رہا کہ صبح اگر عبداللہ آئے گا تو کیا ہوگا۔ مگر دلاور مزے سے پڑا سوتا رہا۔ پھر وہی ہوا جو اس کا خیال تھا۔ تانگے والا میرے دفتر کے جانے کے وقت تک تو آیا نہیں۔ دلاور اسی طرح بے خبر پڑا سوتا رہا۔

یہ تو خیر ایسی کوئی تشویش ناک بات نہ تھی، وقتی پریشانی تھی۔ مگر اسی دوران میں واقعی میں ایک پریشانی میں مبتلا ہو گیا۔ ہوا یہ کہ میں جس مکان میں رہتا تھا وہ وحید احمد کا تھا۔ وہ میرے ہی دفتر میں اکاؤنٹنٹ تھے۔ کسی زمانہ میں بڑے بھائی کے کلاس فیلو بھی رہ چکے تھے۔ اس تعلق سے میری بھی ان سے اچھی خاصی جان پہچان تھی۔ کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ جیسے ہی میرا تقرر ہوا انھی دنوں وحید احمد دو مہینے کی چھٹی لے کر اپنے والدین کے پاس ہر دوئی جا رہے تھے۔ چنانچہ مجھے رہنے کے لئے آسانی سے جگہ مل گئی۔ مگر اب خط آیا تھا کہ وہ اپنے بال بچوں کے ساتھ واپس آ رہے ہیں۔ یہ مکان اتنا بڑا بھی نہ تھا کہ میرے رہنے کے لئے کوئی گنجائش نکل سکتی۔ مجبوراً مجھے کہیں نہ کہیں جلد ہی اپنی رہائش کے لئے کوئی انتظام کر لینا ضروری ہو گیا۔ ہوٹل میں کمرہ کرایہ پر لینے کی مقدرت نہیں تھی اور بڑے شہروں میں مکان کا ملنا محال ہے۔ آخر میں نے دلاور سے اپنی اس پریشانی کا اظہار کیا۔ وہ حسب معمول بے نیازی سے بولا۔

"اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ تم اپنا سامان اٹھا کر میرے گھر آجاؤ۔ رہنے کا بندوبست ہو جائے گا۔"

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ میں نے اسی روز سامان اٹھایا اور دلاور کے گھر منتقل ہو گیا۔ یہ کشادہ

کمروں، اونچے، اونچے طویل دالانوں، صحنچیوں اور سہ دریوں والی قدیم طرز کی حویلی تھی۔ مجھے جو کمرہ رہائش کیلئے ملا تھا، وہ ڈیوڑھی سے متصل تھا اس کے آگے وسیع احاطہ تھا۔ جس کی چار دیواری ٹوٹ پھوٹ کر ختم ہو چکی تھی۔ احاطہ اب ایک اجاڑ میدان بن چکا تھا۔ جس میں نیم اور برگد کے چند گھنے درخت تھے۔

میرے کمرے سے ملا ہوا ایک ہال نما کشادہ کمرہ تھا جو مردانہ نشست گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس کمرے کے دروازوں پر ہلکے بادامی پردے پڑے تھے، جن کا رنگ اُڑ چکا تھا۔ ایک بوسیدہ صوفہ سٹ تھا۔ لکڑی کا تخت تھا، جس پر غالیچہ بچھا تھا۔ اور دُو گاؤ تکیہ بھی تھے۔ دیواروں کا رنگ کبھی سبز رہا ہوگا، مگر اب ماند پڑ گیا تھا اور کاہی نظر آتا تھا۔ دیواروں پر قرون وسطیٰ کی جنگوں کی تصاویر کے ساتھ ایسے طغرے بھی آویزاں تھے، جو فن خطاطی کے اعلیٰ نمونے کہے جا سکتے تھے۔ یہ کمرہ شام کو عام طور پر دلاور کے والد، مرزا صفدر علی کے تصرف میں رہتا تھا۔ یہاں وہ دوست احباب کے ساتھ محفل آرائی کرتے تھے، جس کا سلسلہ کبھی، کبھی رات گئے تک جاری رہتا۔

اس کشادہ کمرے کی سج دھج سے گئی گزری جاگیر دارانہ آن بان جھلکتی تھی۔ بات بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ دلاور کے والد خاندانی رئیس تھے۔ ان کو ترکے میں دُو گاؤں ملے تھے، جو پہلے رہن ہوئے، پھر رفتہ رفتہ مہاجنوں کے قبضے میں چلے گئے۔ اب زمین داری میں صرف ایک پٹی رہ گئی تھی، جس سے شتم، پشتم گزر بسر ہو رہی تھی۔ اب وہ بوڑھے بھی ہو چکے تھے۔ جوانی کے تمام رئیسانہ شوق ختم ہو چکے تھے۔ البتہ ان کی وضع داری میں وہی دیرینہ ٹھاٹھ باٹ کی جھلک تھی۔ کبھی، کبھی باتیں کرتے ہوئے جب انکی تیوری پر بل پڑ جاتے اور غلافی آنکھیں پھیل جاتیں تو ان کا رعب اور دبدبہ عیاں ہو جاتا۔ وہ دن بھر حویلی کے اندر اپنے کمرے میں پڑے پیچواں کو گڑگڑاتے رہتے اور خاصدان سے پان نکال، نکال کر چباتے رہتے۔ شام کو نہا دھو کر اجلا لباس زیب تن کرتے اور نشست گاہ میں آکر بیٹھ جاتے یا چہل قدمی کرتے ہوئے اپنے ایک پرانے دوست کی کوٹھی پر چلے جاتے۔ وہ ریٹائرڈ کلیکشن جج تھے۔ ان کی کوٹھی زیادہ فاصلے پر نہ تھی۔ وہ جج صاحب کے ساتھ بیٹھ کر شطرنج کھیلتے۔ یہی ایک ایسا شوق تھا جسے وہ ختم نہ کر سکے تھے۔ کبھی کبھار ٹہلتے ہوئے میرے کمرے میں بھی آجاتے۔ یہ عام طور پر اتوار کا دن ہوتا تھا یا اس روز دفتر میں چھٹی ہوتی۔ ان کی باتیں ہمیشہ اپنی جاگیر کے بارے میں ہوتی تھیں، جس کے تباہ ہو جانے کا ان کو

بہت دُکھ تھا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ وہ دلاور کی بے راہ روی پر کڑھتے تھے۔ انھوں نے دلاور کو اعلیٰ تعلیم دلانے کی ہر طرح کوشش کی، مگر پڑھائی میں اس کا دل ہی نہ لگا۔ دلاور کے بارے میں باتیں کرتے، کرتے اکثر ان کو اپنی بیگم یاد آجاتیں، جن کے انتقال کو کئی برس ہو گئے تھے۔ وہ آہ سرد بھر کر بجھے ہوئے لہجے میں کہتے۔

"اللہ بخشے مرنے والی کو بڑی اطاعت گزار رفیق حیات تھی۔ فرشتہ تھی، فرشتہ۔ مگر بھئی اس لڑکے کو تو انھیں کے لاڈ پیار نے تباہ کیا ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ پہلوٹی کا ہے اور اکلوتا بیٹا ہے اور یہ تو میاں آپ جانتے ہی ہیں کہ پہلوٹی کی اولاد ماں باپ کی کمزوری ہوتی ہے۔ اسی لئے تو میں بھی درگزر سے کام لیتا ہوں۔"

گھر کی دیکھ بھال اور کام کاج کے لئے ایک بوڑھی خادمہ تھی۔ اس کے علاوہ نادرہ تھی، جو دلاور سے کوئی سال بھر چھوٹی ہو گی۔ کسی کالج میں پڑھتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ پردہ کرتی ہو گی مگر ایک روز جب وہ ناشتہ کا سامان لے کر میرے کمرے میں آگئی تو میں حیرت زدہ رہ گیا۔ اس دن بوڑھی خادمہ بیمار تھی۔ اس کے علاوہ گھر میں اور کوئی ملازم بھی نہ تھا۔ نادرہ کا چہرہ زردی مائل تھا۔ وہ کچھ بیمار، بیمار سی لگتی تھی۔ اپنے سن کے اعتبار سے اب تک نہ صرف اس کی شادی ہو جانا چاہئے تھی بلکہ اُسے ایک آدھ بچے کی ماں ہونا چاہئے تھا۔ دیکھنے میں وہ ایسی ہی معلوم ہوتی تھی۔ وہ میرے سامنے بیٹھی ہوئی خاموشی سے چائے بناتی رہی۔ میں غور کرنے لگا کہ اس کے بیمار چہرے پر ایک دلآویزی ہے اور اس دلآویزی میں کچھ ایسی افسردگی تھی کہ مجھے یکبارگی اس پر ترس آگیا۔ وہ مجھے کلاسکس کی ایسی کتاب معلوم ہوئی جو کسی الماری میں لائبریری کی زینت بڑھانے کے لئے رکھدی جائے اور پھر گرد و غبار کے ساتھ، ساتھ اسے دیمک چاٹنا شروع کر دے۔ اس کے برعکس دلاور ان زندہ دل نوجوانوں میں سے تھا جن کو بڑے بوڑھے عاقبت نا اندیش کہتے ہیں۔ خود اس کے باپ کا بھی یہی خیال تھا۔ وہ اکثر مجھ سے کہا کرتے۔

"میری آنکھیں بند ہو جانے دو پھر صاحبزادے کو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو گا۔ بھئی اپنا کیا ہے۔ اپنی تو جیسے تیسے کٹ ہی گئی۔ تھوڑی سی زندگی جو رہ گئی ہے، وہ بھی گزر ہی جائے گی۔ مگر ان کا کیا حشر ہو گا۔ یہی تو کوفت مجھے کھائے جاتی ہے۔"

وہ اسی کوفت میں گھلتے جا رہے تھے اور دلاور ہر روز شام کو گھر سے بن سنور کر نکلتا اور رات کے پچھلے پہر

آکر آہستہ سے میرے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹاتا۔ جب میں دروازہ کھولتا تو دبے پاؤں صوفہ پر جاکر تھکا ہوا سا دراز ہو جاتا۔ گھر کے اندر اسی وقت، اس کے باپ کے کھانسنے اور کھنکارنے کی آواز رُک رُک کر اُبھرتی۔ آہٹ سے ان کی آنکھ کھل جاتی تھی۔ دلاور انکی خفگی کے ڈر سے اکثر صوفے پر سو جاتا۔ ان دنوں پیر میں چوٹ ہونے کی وجہ سے میں نے ایک ہفتہ کی چھٹی لی تھی اور ہر وقت کمرہ ہی میں پڑا رہتا تھا۔ اس زمانے میں مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ دلاور دکانداروں کا اس قدر مقروض ہو گیا تھا کہ انھوں نے گھر پر آکر تقاضا کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے خود بھی اکثر یہ دیکھا تھا کہ کتنے ہی ایسے راستے تھے، جدھر سے گزرتے ہوئے وہ ستراتا تھا اور کبھی کبھی تو ایسا ہوتا کہ تھوڑے سے فاصلے کے لئے خواہ مخواہ لمبا چکر کاٹنا پڑتا۔ میں نے کبھی پوچھا تو وہ ہنس کر بے نیازی سے کہہ دیتا۔

"آج کل یہ راستہ آؤٹ آف بانڈ ہے۔"

اور پھر اس "آوٹ آف بانڈ" راستہ کو صاف کرنے کے لئے اکثر مجھے قرض چکانا پڑتا۔ مگر اس کے انداز میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔

اس کی ان حرکتوں کا اب میں کسی حد تک عادی ہو چکا تھا۔ لیکن ایک روز ایسا ہوا کہ کسی نے آکر میرے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں اس وقت موجود تھا۔ دروازہ کھول کر دیکھا۔ چھریرے جسم کا ایک خاصا بدصورت نوجوان سامنے کھڑا تھا۔ اس کا رنگ روپ بھی گہرا سانولا تھا۔ میں نے اسے اندر بلا لیا۔

اس نے دریافت کیا۔ "دلاور علی خان اس وقت گھر میں موجود ہیں؟"

وہ صبح ہی سے غائب تھا۔ چنانچہ میں نے کہدیا۔ "وہ تو کہیں باہر گئے ہیں۔"

اس نے مزید کچھ نہ کہا۔ بلا جھجک الماری کے پاس پہنچا اور اس سوٹ کو اٹھانے لگا جسے کل رات دلاور کمرے میں چھوڑ گیا تھا۔

میں نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "یہ آپ اس سوٹ کو کہاں لے جا رہے ہیں؟"

وہ میری طرف توجہ دیئے بغیر بولا۔ "یہ سوٹ میرا ہے اس لئے اسے لے جا رہا ہوں۔ آپ دلاور سے کہہ دیجئے گا۔"

میں نے کہا۔ "انکی غیر موجودگی میں تو میں اسے لے جانے کی اجازت نہیں دوں گا۔"

وہ بگڑ کر بولا "وہ کبھی ملتے بھی ہیں۔ کتنی ہی بار یہاں آ چکا ہوں، مگر ان سے ملاقات ہی نہیں ہوتی۔ ایک روز کے لئے مانگا تھا اور آج کئی مہینے ہو گئے۔ میں نے اس لئے تو نہیں سلوایا تھا کہ وہ اسے پہن کر ٹھاٹھ سے اکڑتے پھریں اور میں احمقوں کی طرح ان کے گھر کا چکر لگاتا رہوں۔"

میں نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا، تب کہیں وہ باز آیا۔ ورنہ کسی طرح مانتا ہی نہ تھا۔ مجھے دلاور کی اس حرکت پر بڑا تاؤ آیا۔ جب وہ واپس گھر آیا تو میں نے ذرا سختی سے اس بات کا ذکر کیا۔ مگر وہ مطلق نہ پسیجا۔ ڈھٹائی سے ہنس کر کہنے لگا۔

"اماں! تم بھی کیا باتیں کرتے ہو۔ اس کی شکل دیکھی ہے۔ بالکل کان میلیا نظر آتا ہے۔ وہ اس قابل بھی ہے کہ اتنا گرینڈ سوٹ پہنے اور میں جو پہنتا ہوں تو اس سوٹ میں جچتا ہوں کہ نہیں۔ تمھیں انصاف سے کہدو۔ گھبراؤ نہیں اب کے ایک سوٹ تمھیں بھی رشوت میں دلوادوں گا۔ کیا یاد کروگے کہ کوئی دلاور علی خان ملا تھا۔" اس نے جیب سے سگرٹ کا ٹین نکالا اور میرے سامنے کرکے بولا "لو بلیک اینڈ وائٹ پیو۔ بھائی اپنے تو یہی ٹھاٹھ ہیں۔"

وہ بے فکری سے ہنستا ہوا کمرے سے چلا گیا۔ اس ڈھٹائی پر میں اور جھنجھلا گیا۔ میں نے غصے سے سگرٹ زمین پر پھینکی اور اسے جوتے سے مسل دیا۔ اسی اثنا میں نادرہ بھی کمرے میں آ گئی۔ پوچھنے لگی۔

"یہ آپ کس چیز کو اس طرح جھنجھلا کر رگڑ رہے ہیں؟"

میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "کچھ نہیں۔ میں یہاں سے جلد ہی کہیں اور جانے والا ہوں۔"

کہنے لگی "خیر تو ہے۔ یہ آپ کو بیٹھے بٹھائے ہو کیا گیا؟"

میں نے جواب دیا "بات یہ ہے کہ دلاور کی حرکتیں اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتیں۔ میں نے طے کر لیا ہے کہ جس قدر جلد ہو سکے یہاں سے چلا ہی جاؤں۔"

میری بات سن کر وہ خاموش ہو گئی۔ میں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ ہمیشہ کی طرح مضمحل اور تھکا ہوا سا نظر آنے لگا۔ وہ مسکراہٹ جو لمحہ بھر کے لئے اس کے چہرے پر ہویدا ہوئی تھی، نہ جانے کہاں ڈوب گئی۔ اس دفعہ مجھے اس پر کوئی ترس نہیں آیا۔ بلکہ میں اچانک رومانٹک ہو گیا اور رومانٹک ہمیشہ ردِ عمل کے طور پر ہی ہوا

جاتا ہے۔ ہر جذبہ ایک لہر ہے جو کسی بوجھ سے دب کر ہمیشہ دوسری جگہ سے سر نکالتی ہے۔ ایسی باتیں میں اکثر سوچا کرتا ہوں، اس لئے کہ بدقسمتی سے میں فلسفہ کا طالب علم رہا ہوں۔ یہ بات دوسری ہے کہ فلسفہ پڑھ کر مجھے کلرکی کرنا پڑتی ہے اور ایسی فائلوں سے اُلجھنا پڑتا ہے جن میں کوئی فلسفہ نہیں ہوتا۔ ایسی تعمیرات ہوتی ہیں جن کے بل پر پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کی مشین چلتی ہے۔ یہ مشین عوام الناس کی فلاح و بہبود کے لئے چلائی جاتی ہے۔ اور عوام الناس صرف ایک ہی فلسفہ سمجھتے ہیں، جس کے لئے وہ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کی سڑکوں پر چیختے پھرتے ہیں۔

"کیا چاہتا ہے مزدور کسان؟"

"روٹی، کپڑا اور مکان۔"

لیکن جس نظام میں مجھے فلسفہ پڑھ کر کلرکی کرنا پڑتی ہے، وہ نظام عوام الناس کا فلسفہ بھلا کس طرح سمجھ سکتا ہے۔ اسے سمجھنے اور سمجھانے کا دارومدار تو وقت اور حالات پر ہے۔ اور اس وقت میری سمجھ میں یہی آیا کہ نادرہ میرے چلے جانے کی خبر سے اداس ہو گئی ہے۔ میں نے ہاتھ بڑھایا اور بڑے پیار سے اس کے بالوں کو اپنی انگلیوں سے بکھیر دیا۔ پھر میں نے چاہا کہ اس کے رخسار کو چوم کر کہوں "نادرہ میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ میں یہیں رہوں گا۔" مگر وہ ایک دم بھڑک اٹھی۔

"ہٹئے، مجھے یہ بدتمیزی اچھی نہیں لگتی۔"

مجھے ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی۔ میں جانتا تھا کہ وہ یہی کہے گی۔ میں نے دھنسے ہوئے صوفہ پر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے کہا، "تم برا مان گئیں، مگر یہ بدتمیزی کی بات میری سمجھ میں آج تک نہیں آئی۔ اب یہی دیکھو کہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ بائیں ہاتھ سے کھانا کھانا بدتمیزی ہے۔ لیکن ماڈرن سوسائٹی میں لوگ کھانا کھاتے وقت بائیں ہاتھ میں کانٹا پکڑتے ہیں۔"

وہ اس طرح خفگی سے بولی، "خدا آپ ہی کو یہ ماڈرن سوسائٹی مبارک کرے۔ ایسی حرکتیں وہیں کیا کیجئے۔ بھلے گھر کی لڑکیوں کے لئے ان کی عزت ہی بہت کچھ ہے۔ وہ اپنی عصمت کے لئے جان دے سکتی ہیں۔ آخر آپ نے مجھے سمجھا کیا ہے؟"

دہت تیری کی۔ یہ بھی راشد الخیری کے ناولوں کی ہیروئن ہی نکلی۔ جی میں آیا کہ اس سے کہہ دوں کہ نادرہ بیگم جس عصمت کے لئے تم جان دے سکتی ہو، اس کا نیلام رات بھر کے لئے کبھی سو روپے تک ہوتا ہے اور کبھی چند ہزار سکہ رائج الوقت کے وعدہ پر زندگی بھر کے لئے۔ ناک چاہے سامنے سے پکڑو چاہے گھما کر بات ایک ہی ہے۔ بلکہ لمبے سودے میں ہمیشہ گھاٹا ہوتا ہے۔ اس سماج میں ہر چیز کا مول تول ہوتا ہے۔ مجھی کو دیکھ لو۔ میں ایک سو بیس روپے میں مہینہ بھر تک پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کے آفس میں جھک مارتا ہوں۔ اپنی محنت بیچتا ہوں، اپنی خودی بیچتا ہوں۔ اپنی صلاحیت اور اپنی ذہانت بیچتا ہوں۔ لیکن ایک طوائف صرف رات بھر کے لئے اپنا جسم بیچ کر مجھ سے زیادہ معاوضہ پا سکتی ہے۔ مگر یہ سب کچھ میں اس سے کہہ نہ سکا۔ اس لئے کہ جو لڑکی اپنے باپ کی جاگیر کی طرح خود بھی کسی کی جائیداد بننے کے لئے تلی ہوئی ہو، اس کی سمجھ میں میری بات آ بھی کیسے سکتی تھی۔ میں نے مسکرا کر اس سے صرف اس قدر کہہ دیا۔

"معلوم ہوتا ہے تم نے فضلی برادرز کی فلمیں بہت دیکھی ہیں۔"

اس دفعہ بھی وہ اسی طرح تیزی سے بولی۔ "جی ہاں دیکھی تو ہیں۔ مگر آپ اپنی کہئے!"

بات ایسی تلخ تو نہ تھی۔ مگر نہ جانے کیوں میں بھی جھلا گیا۔ میں نے کہا "کم از کم مجھے اپنے متعلق کوئی خوش فہمی نہیں۔ لیکن تمہیں اپنے متعلق بڑی غلط فہمی ہے۔ تمہارے پاس تو وہ جوانی بھی نہیں رہی جس پر کوئی عورت اترا سکتی ہے۔ ایک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے!" جھنجھلاہٹ ختم ہو گئی۔ میں مسکرانے لگا۔ "میں سمجھتا ہوں کہ میں نے جو کچھ کیا ٹھیک ہی کیا۔ بلکہ یہ تو تم پر میرا احسان تھا۔ میں نے تو چاہا تھا کہ تمہاری اس جوانی کو سنوار دوں جو سو چکی ہے۔ دم توڑ رہی ہے۔"

میری باتوں سے وہ تلملا کر چلی گئی اور چلتے، چلتے غضب ناک ہو کر مجھے کوسنے لگی۔ "اللہ کرے منہ سڑ جائے۔ ڈھائی گھڑی کا ہیضہ ہو جائے۔"

وہ بے ساختہ رونے لگی۔ اس کی سسکیاں دور تک سنائی دیتی رہیں۔ کہنے کو تو جو منہ میں آیا میں نے کہہ دیا۔ مگر بعد میں دکھ بھی ہوا اور اس سے بھی زیادہ دکھ یہ سن کر ہوا، جب دلاور کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ نادرہ کو بخار آ رہا ہے۔ ڈاکٹر حنیف نے اسے کیلشم اور نولی ایڈ کے انجکشن لگائے ہیں۔ اس لئے کہ اس کے جسم میں خون کی شدید

کمی تھی۔ دلاور کے ذریعہ یہ بھی معلوم ہوا کہ نادرہ کے برابر انجکشن لگائے جا رہے تھے۔ ایک روز میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر حنیف کی کار گھر کے سامنے آکر رکی۔ وہ نادرہ کو دیکھنے کے لئے آیا تھا۔ میں واقعی پریشان ہو گیا، مگر جب دلاور کے والد سے نادرہ کی علالت کے بارے میں گفتگو ہوئی تو ذرا اطمینان ہوا۔ انھوں نے بتایا۔

"اب تو خدا کا شکر ہے اس کی طبیعت بہت سنبھل گئی ہے۔ لیکن ڈاکٹر کا مشورہ ہے کہ علاج پابندی سے جاری رکھا جائے۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب خود انجکشن لگانے آتے ہیں۔ اس طرح تو علاج بہت مہنگا پڑ رہا ہے۔"

وہ بولے "بھئی یہ ڈاکٹر حنیف میرا بہت لحاظ کرتا ہے۔ یہاں آنے کی کوئی فیس نہیں لیتا۔ بلکہ اب تو اس نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ انجکشن اور دوائیوں کی قیمت بھی نہیں لے گا۔ میں نے اصرار کیا تو ہنس کر کہنے لگا جب نادرہ ماشاءاللہ بالکل صحت مند ہو جائے تو دیدیجئے گا۔"

بات آئی گئی ہو گئی۔ مگر کچھ عرصہ بعد میں نے غور کیا کہ جب ڈاکٹر گھر میں آتا تو نادرہ کے قہقہے دالانوں اور سہ دریوں میں گونجتے ہوئے سنائی دیتے۔ انھی دنوں میرا ٹرانسفر اکاؤنٹ سیکشن میں ہو گیا۔ اب مجھے ٹھیکیداروں کے بلوں کو پاس کرنا پڑتا۔ لہٰذا رشوت میں اچھی خاصی رقم مل جاتی۔ اسی زمانہ میں ایک روز سیوائے بار میں پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کے ایک ٹھیکیدار نے مجھے مدعو کیا۔ میں ان کے ساتھ بیٹھا وہسکی کی چسکی لگا رہا تھا۔ اسی اثنا میں دلاور بھی وہاں آگیا۔ میری جانب کوئی توجہ دیئے بغیر، ٹھیکیدار سے بڑی بے تکلفی سے مخاطب ہوا۔

"کہئے احمد صاحب آج کتنی دیر تک جمنے کا ارادہ ہے۔ اس روز تو آپ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے تھے۔ کہئے آج بھی کچھ ہمت ہے؟"

ٹھیکیدار بولا "ہاں کیوں نہیں تم پلاؤ گے تو ضرور پئینگے۔" اس نے نشہ میں جھوم کر دلاور کی طرف دیکھا۔ "بولو کیا کہتے ہو؟"

دلاور کھسیانا ہو کر ہنسنے لگا "بھئی آج تو اپنے بھگوان کچھ روٹھے ہوئے ہیں۔" ٹھیکیدار نے منہ بگاڑا کر کہا "یار! تمھارے بھگوان کبھی راضی بھی رہتے ہیں۔ ہم نے تو ہمیشہ تمھاری جیبیں خالی ہی دیکھی ہیں۔"

دلاور اس کی بات ٹال گیا "ارے بھئی وہ ہیلن پھر نظر آنے لگی ہے معلوم ہوتا ہے اب اس نے انشورنس

کمپنی والے مینجر کو چھوڑ دیا ہے۔ مگر بھئی کیا سدا بہار عورت ہے۔ سالی اس عمر سے آتی ہے کہ کلیجے پر چھریاں چل جاتی ہیں۔"

پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کا ٹھیکیدار مسکرا کر کہنے لگا۔ "چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ اس کی بدولت تم کو بھی پینے کو مل جایا کرے گی۔ تم تو اس کے پرائیویٹ سیکرٹری ہو۔"

لیکن دلاور نے اس کی بات کا ذرا برا نہ مانا۔ ہنس کر بولا۔ "کیوں خواہ مخواہ بدنام کرتے ہو۔"

دونوں باتیں کرتے رہے اور میں برابر غور کرتا رہا کہ دلاور کی نگاہیں بار بار گلاسوں کی طرف للچاتی ہوئی سی پڑ رہی تھیں، مگر اب تک ٹھیکیدار نے اس کے لئے بیرے کو آرڈر نہیں دیا تھا۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے بیرے کو بلا کر اس کے لئے بھی ایک پگ وہسکی کا منگوا دیا۔ میری اس حرکت پر ٹھیکیدار خاموش رہا، مگر جب دلاور اپنا گلاس اٹھا کر کسی اور میز پر چلا گیا تو وہ مجھ سے کہنے لگا۔

"فہیم صاحب آپ ان مفت خوروں کو جانتے نہیں۔ ان سالوں کا کام ہی یہی ہے کہ شام ہوتے ہی بار میں منڈلانا شروع کر دیتے ہیں۔ اگر کوئی نہیں ہوا تو کمپنی کے لئے کبھی کبھار بٹھا لیا۔ مگر اب تو یہ مصیبت بن گئے ہیں۔ اب اس دلاور ہی کو دیکھئے کیسا ڈھیٹ بنا بیٹھا تھا۔"

وہ بولتا رہا اور میں سوچتا رہا کہ دلاور واقعی بڑا ذلیل ہے۔ مجھے اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہئے۔

دلاور سے علیحدگی اختیار کرنے کے بارے سوچ ہی رہا تھا کہ اسی دوران میں اس نے ایک اور ایسی حرکت کی کہ مجھے اس سے نفرت ہو گئی۔ ہوا یہ کہ میرے ایک ہونے والے سالے کی نیو مارکیٹ میں جنرل مرچنٹ کی شاپ تھی۔ اس زمانے میں وحید احمد اکاؤنٹنٹ کے ذریعے ایک ایسا سلسلہ چل رہا تھا۔ ایک روز مجھے اسکی دکان جانے کا اتفاق ہوا تو میرے ہمراہ دلاور بھی تھا۔ میں نے دونوں کا تعارف کرا دیا۔ کئی روز بعد پھر وہاں گیا تو وہ مجھ سے پوچھنے لگا۔

کہئے خیریت تو ہے۔ اب طبیعت کیسی ہے؟"

میں نے حیران ہو کر کہا۔ "میری طبیعت تو ادھر بالکل ٹھیک رہی۔"

اس نے دبی ہوئی زبان سے کہا۔ "کیا معلوم! وہ آپ کے دوست دلاور صاحب ابھی پرسوں آئے تھے۔

بہت پریشان اور گھبرائے ہوئے تھے۔ کہنے لگے کہ کسی ٹھیکیدار دیکیدار نے آپ کو بہت پلا دی۔" اس نے تامل کیا، پھر جھجکتے ہوئے بولا۔" ایسی ہی کوئی بات بتائی تھی۔ بہر حال سن نے میں یہ آیا کہ آپ سے سرخوشی کے عالم میں کسی دکان کا شیشہ ٹوٹ گیا، جس سے آپ کو چوٹ چپیٹ بھی آئی۔ خاصا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اس ٹوٹے ہوئے شیشے کا پیمنٹ وغیرہ کرنا تھا جو ادا نہ کیا گیا تھا۔ اور دکاندار نے آپ کو روک لیا تھا۔ اسی کے لئے وہ یہاں سخت پریشانی میں آئے تھے اور اسی روپے لے گئے تھے۔ مجھے تو صرف اتنا ہی معلوم ہوا۔ بات کیا ہے، وہ آپ ہی بہتر جانتے ہوں گے۔"

وہ بتا تا رہا اور میرا حال یہ تھا کہ شرم سے زمین میں گڑے جا رہا تھا۔

مجھے معاً یاد آیا۔ پرسوں ہی رات کو دلاور مجھے ایک بار میں ملا تھا۔ مجھے پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کا ٹھیکیدار احمد ہی وہاں لے گیا تھا۔ جب ہم دونوں دیر تک بیٹھنے کے بعد اٹھنے لگے تو بیرا دو پیگ وہسکی کے اور لے آیا۔ اس کا بل اس نے پیش کرنا چاہا تو ایک طرف سے آواز آئی۔" ویٹر! یہ بل ادھر لے آؤ۔" میں نے اور احمد نے مڑ کر اس طرف دیکھا تو ہلکی، ہلکی روشنی میں دلاور ایک میز پر نظر آیا۔ اس کے ساتھ کوئی اور بھی بیٹھا تھا، جسے میں جانتا نہ تھا۔ ہم کو اپنی جانب متوجہ پایا تو دلاور نے بے تکلفی سے قہقہہ بلند کرتے ہوئے احمد سے کہا۔" یہ میری طرف سے ہے۔ ضرورت ہو تو کچھ اور بھی منگوا لیجئے۔" احمد نے مسکرا کر اس کا شکریہ ادا کیا اور میں سوچنے لگا کہ خلاف معمول دلاور آج اس شاہ خرچی پر کیسے اتر آیا۔ ان دنوں وہ بالکل قلاش تھا۔ اب حقیقت حال معلوم ہوئی تو مجھے دلاور کی اس گھٹیا حرکت پر بے حد غصہ آیا۔ ظاہر ہے وہ نسبت تو ٹوٹ گئی اور مجھے اسی روپے کا ڈنڈ بھی بھرنا پڑا۔ مگر مجھے اس کا مطلق افسوس نہ تھا۔ البتہ مجھے ان لوگوں کی نظروں میں خوار ہونے کا بڑا دکھ پہنچا۔ حالانکہ اس سے پہلے اکثر ایسا ہو چکا تھا کہ دلاور میرے ملنے والوں کے پاس پہنچا اور میرا نام لے کر قرض ادھار لے آیا، مگر وہ اتنا گر جائے گا مجھے کبھی وہم و گمان بھی نہ تھا۔

میں اس افسوسناک واقعہ سے اس قدر دل برداشتہ ہوا کہ فوراً دلاور کا گھر چھوڑ دیا۔ اتفاق سے وائی ایم سی اے میں ایک کمرہ خالی مل گیا۔ میں اس میں منتقل ہو گیا۔

دلاور کی جانب سے میں ایسا بے نیاز ہو گیا کہ ایک مدت تک اس سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ان دنوں کچھ دفتری مصروفیات بھی زیادہ رہیں اور کسی بار میں بھی جانے کا اتفاق نہ ہوا، ورنہ عین ممکن تھا کہ دلاور سے مڈبھیڑ

ہو جاتی۔ البتہ اس کے ملنے جلنے والوں کی زبانی یہ سن نے میں آیا کہ وہ ہیلن کے ساتھ اکثر نظر آتا تھا۔ ہیلن سے میں مل چکا تھا۔ دلاور ہی نے ایک بار ملایا تھا۔ وہ پینتیس چھتیس برس کی طرح دار عورت تھی۔ رنگ تو اس کا سانولا تھا۔ مگر نقش و نگار بک اور دل آویز تھے۔ شادی شدہ تھی، مگر شوہر سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ اَل اولاد بھی نہ تھی۔ ایک فلیٹ میں تنہا رہتی تھی۔ کسی زمانے میں ایک بینک میں ٹائپسٹ تھی۔ مگر ملازمت چھوڑ دی تھی۔ اب کیا کرتی تھی، اس کا مجھے کوئی علم نہ تھا۔ مگر وہ نیک نام نہ تھی۔ پی ڈبلیو۔ ڈی کا ٹھیکیدار احمد تو اسے ہمیشہ ٹیکسی ہی کہتا تھا۔ اور دلاور کو اس کا ٹاؤٹ۔ صرف وہی نہیں اور بھی نہ جانے کتنے تھے جو دونوں کو اسی حیثیت سے یاد کرتے تھے، خصوصیت کے ساتھ اس وقت جب نشے سے سرشار ہوتے۔

اس روز اتوار تھا اور سہ پہر کا وقت تھا۔ میں کمرے میں تنہا تھا۔ اچانک دروازہ کھول کر دلاور اندر آ گیا اور ایک کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا۔ میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ بھی گردن جھکائے چپ بیٹھا رہا۔ خلاف معمول اس قدر خاموشی دیکھا تو میں نے اسے چھیڑا۔

"کہئے نواب زادہ دلاور علی خان! آج کیسے زحمت فرمائی۔ خیریت تو ہے؟"

وہ مجھے لحظہ بھر تک نظریں اٹھائے دیکھتا رہا، پھر جھجکتے ہوئے بولا۔ "فہیم! تم مجھے دو سو روپے دے سکتے ہو؟" اس کے لہجے میں عاجزی پیدا ہو گئی۔ "لیکن یہ روپے میں تم کو ادا نہ کر سکوں گا۔ پہلے بھی تم سے جو قرض لیا، وہ کب ادا کیا؟" اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور آنکھوں میں افسردگی تھی۔

اس نے شاید پہلی بار میرے سامنے صاف گوئی سے کام لیا تھا اور اس کی صاف گوئی سے اس قدر متاثر ہوا کہ مزید غور کئے بغیر میں نے ایک دم طے کر لیا کہ یہ رقم اسے دیدوں گا۔ ایک ہی روز قبل مجھے ایک ٹھیکیدار سے ہزار روپے رشوت میں ملے تھے اور ابھی تک میرے پاس محفوظ تھے۔ میں خاموشی سے اٹھا۔ روپے نکالے اور سو، سو کے دو نوٹ اسے دیدیئے۔ نوٹ لے کر وہ کچھ دیر گم صم بیٹھا رہا، پھر اٹھ کر اس نے میرے پیروں پر سر رکھ دیا۔ اس حرکت پر میں گھبرا گیا۔ پریشان ہو کر کہا۔ "دلاور! یہ تم کیا کر رہے ہو؟" میں نے جھک کر اسے اٹھایا اور سہارا دیکر کرسی پر بٹھا دیا۔ وہ آبدیدہ ہو کر بولا۔

"فہیم! تم نہیں جانتے کہ آج تم نے مجھ پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔ میں ہر طرف سے نا اُمید ہو کر تمہارے

پاس آیا تھا۔ اس میں بخدا میری کسی ضرورت کو دخل نہیں، یہ میری عزت اور ناموس کا سوال ہے۔ تم میرے لئے کبھی غیر نہیں رہے۔ لہٰذا اب تم سے کیا چھپانا۔ بات یہ ہے فہیم کہ یہ ڈاکٹر حنیف جو نادرہ کا علاج کر رہا ہے۔ مجھے کچھ اچھا آدمی معلوم نہیں ہوتا۔ آپا جان تو سیدھے آدمی ہیں۔ وہ کیا سمجھ سکتے ہیں کہ کوئی ڈاکٹر اس طرح مفت علاج نہیں کر سکتا۔ گھوڑا گھاس سے آشنائی کرلے تو کھائے گا کیا۔ میں چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر کے علاج معالجہ کا جو بل بنتا ہے، اس میں سے دو سو روپے دے کر اس کا گھر پر آنا جانا بند کر دوں۔ اب تو بات گھر سے نکل کر باہر پہنچ چکی ہے۔ ڈاکٹر کے روزانہ گھر پر آنے سے محلے میں طرح طرح باتیں کہی جا رہی ہیں۔"

میں خاموش بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہا۔ بولتے، بولتے اس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھیں بھر آئیں اور آنسو پلکوں سے ڈھلک، ڈھلک کر رخساروں پر گرنے لگے۔ وہ چپ چاپ اٹھا اور آنسو پونچھتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

میں اس سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا، مگر کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ دم بخود بیٹھا رہا۔ اس کے جانے کے بعد میں سوچنے لگا کہ دلاور مجھ پر کس قدر اعتماد کرتا ہے اور خود میں کتنا ذلیل ہوں کہ اس کے اعتماد کو فریب دے کر وہی کچھ کرنا چاہا جس کے لئے وہ ڈاکٹر حنیف سے نفرت کرتا ہے۔ ٹھیک ہے کہ دلاور میں بہت سی کمزوریاں ہیں۔ خامیاں ہیں۔ مگر اس میں اس کا اتنا قصور نہیں جتنا اس ماحول کو دخل ہے، جس میں اس نے آنکھیں کھولیں اور ہوش سنبھالا۔ وہ ناکارہ اور پریشاں حال اس لئے ہے کہ اتنا پڑھا لکھا بھی نہیں کہ میری طرح کم از کم کہیں کلرک ہی کی حیثیت سے لگ جائے۔ وہ جھوٹی وضع داری کا سمبل ہے۔ ایک نمونہ ہے۔ چلتا پھرتا اشتہار ہے۔

میں دیر تک دلاور کے بارے میں سوچتا رہا۔ اسی ذہنی خلفشار کے عالم میں رات ہو گئی۔ کھانا کھایا اور بستر پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگا، مگر نیند نہ آئی۔ میں ہنوز دلاور ہی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ سوچتے، سوچتے، معاً خیال آیا کہ دو سو روپے سے اس کا کام بن نہ سکے گا۔ ڈاکٹر حنیف کے چنگل سے نجات حاصل کرنے کیلئے اسے ابھی اور رقم کی ضرورت ہے اور اس وقت میرے پاس خاصی رقم موجود تھی۔ آخر میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بستر سے نیچے اترا۔ لباس تبدیل کیا، جیب میں پانچ سو روپے رکھے اور دلاور کے گھر جانے کے لئے تیار ہو گیا۔

گلابی جاڑوں کی رات تھی اور دس بجے کا عمل تھا۔ میں دلاور کے گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔ مجھے یقین

تھا کہ وہ گھر پر ضرور موجود ہوگا۔ میں اس کے گھر پہنچا۔ احاطہ کا ویران میدان عبور کر کے ڈیوڑھی کے قریب گیا اور یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ ڈیوڑھی کے دروازے کا ایک پٹ ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ میں جھجکتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ ڈیوڑھی میں ہمیشہ کی طرح دھندلا، دھندلا بلب روشن تھا۔ اس کی روشنی میں دیکھا کہ اس دروازے کے قریب، جو اندر صحن میں کھلتا تھا، نادرہ کھڑی تھی۔ اس کے چہرے کا رُخ دوسری طرف تھا۔ اسے اس طرح تنہا دیکھ کر میں گھبرا گیا۔ آہستہ سے پوچھا۔

"نادرہ! تم اس وقت یہاں کیوں کھڑی ہو؟"

مگر اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

"تم بولتی کیوں نہیں۔ آخر تم یہاں کیوں کھڑی ہو؟" میں نے اصرار کر کے دریافت کرنا چاہا۔

اس دفعہ بھی وہ خاموش رہی۔ میں بھی خاموش رہا۔ چند لمحے بعد میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "ڈاکٹر صاحب کا انتظار کر رہی ہو؟" اس نے زبان سے تو کچھ نہ کہا۔ پلٹ کر میری جانب دیکھا۔ میں سہم کر رہ گیا۔ اس کے ماتھے سے خون کی ایک دھار بہتی ہوئی ایک رخسار اور کنپٹی، تک چلی گئی تھی۔ اس نے قہر آلود نظروں سے مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔ اس نے سسکی بھر کر کہا۔

"ابا جان شطرنج کھیلنے جج صاحب کے پاس گئے ہیں۔ ابھی تک واپس نہیں آئے۔ میں انھی کا انتظار کر رہی تھی۔"

میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "تمھارے ماتھے پر یہ چوٹ کیسے آئی؟"

"یہ دلاور بھائی سے پوچھئے۔" اس نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "انھوں نے گلاس کھینچ کر مارا تھا جو پیشانی پر لگا۔ بھاگ کر یہاں نہ آ جاتی تو نہ جانے آج وہ میرا کیا حشر کرتے۔ بالکل دیوانے ہو رہے ہیں۔"

"مگر وہ ہے کہاں؟"

"کچھ ہی دیر پہلے لوٹے ہیں اور اب اپنے کمرے میں ہیں۔" وہ سسکیاں بھر کر رونے لگی۔

بات یہاں تک پہنچ جائے گی۔ اس کا مجھے قطعی اندازہ نہ تھا۔ نادرہ سر جھکائے کھڑی رہی۔ اس کی سسکیاں سنسان ڈیوڑھی میں رک رک کر ابھرتی رہیں۔ میں نے نادرہ سے مزید بات چیت نہ کی۔ چپ چاپ آگے بڑھا۔

صحن میں پہنچا۔ طویل دالانوں اور شکستہ محرابوں والی حویلی پر گہرا سکوت طاری تھا۔ میں ایک سہ دری سے گزر کر آہستہ، آہستہ دلاور کے کمرے کی جانب بڑھا۔ اچانک رات کے سناٹے میں زور کا چھناکا ہوا۔ یہ شیشے کے ٹوٹنے کی آواز تھی۔ میں گھبرا کر دلاور کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ دیکھا کہ وہ سامنے کھڑا تھا۔ ہانپنے کے سے انداز میں گہری گہری سانسیں بھر رہا تھا۔ فرش پر ہر طرف شیشے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے حیران و پریشان ہو کر دریافت کیا۔

"دلاور! تم نے یہ کیا اودھم مچا رکھا ہے؟"

اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھیں سُرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ وہ تیوری پر بل ڈال کر بولا۔ "بہتر ہو گا کہ فہیم صاحب اس وقت آپ یہاں سے چلے جائیں۔"

میں نے خود کو بے قابو نہ ہونے دیا۔ نرمی سے کہا۔ "آخر ہوا کیا؟ کچھ مجھے بھی تو معلوم ہو۔"

"آپ میرے سرپرست ہیں یا آقائے ولی نعمت۔" اس نے جھنجھلا کر کہا۔ "آپ کو میرے ذاتی معاملات میں دخل دینے کا کیا حق ہے؟"

میں بھنّا کر آگے بڑھا اور اس کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ اس کے منہ سے شراب کے بھبکے نکل رہے تھے۔ یہ جان کر مجھے اور بھی طیش آیا، لیکن میں نے ضبط سے کام لیا اور ذرا طنزیہ انداز میں کہا۔ "تم نے مجھ سے دو سو روپے اسی لئے مانگے تھے۔ ڈاکٹر حنیف تو تم کو زیادہ روپے دے سکتا تھا۔ میرے پاس آنے کے بجائے اس کے پاس کیوں نہ چلے گئے؟"

وہ ایک دم بپھر گیا۔ چیخ کر بولا۔ "میرے سامنے ڈاکٹر حنیف کا نام نہ لو۔ میں اس حرام زادے کو شوٹ کر دوں گا۔ زندہ نہ چھوڑوں گا۔" آواز کے ساتھ ساتھ اس کے پیر بھی نشہ سے ڈگمگانے لگے۔ "میں نے تم سے جو روپے قرض لئے ہیں، جلد ہی واپس کر دوں گا۔ مگر تم مجھے اس طرح گالیاں نہیں دے سکتے۔ ذرا زبان سنبھال کر بات کرو۔"

اب میں بھی بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ میں نے جھنجھلا کر کہا۔ "ابے کمینے! مس ہیلن کی بھڑوا گیری کرتے، کرتے اب تو اپنی بہن کا بھی سودا کرنے لگا ہے۔" میں نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ "کہتا ہے مجھے گالیاں نہ دو۔ ابھی سپہر

ہی کو میرے پیروں پر سر رکھ کر اپنی عزت و ناموس کی دہائی دے رہا تھا۔"

وہ تیزی سے جھپٹا اور میرے مقابل آکر کھڑا ہو گیا۔ تلملا کر بولا "تم یہاں سے فوراً چلے جاؤ۔" مگر میں اپنی جگہ پر بالکل خاموش کھڑا رہا اور اسے گھورتا رہا۔ وہ زور، زور سے چیخ رہا تھا۔ "میں کہتا ہوں تم میرے کمرے سے نکل جاؤ۔" اس نے ایک ہاتھ دروازے کی جانب اٹھا دیا۔ "جاؤ۔" اس کے اس انداز سے اس کا پورا جاگیردارانہ طنطنہ جھلک رہا تھا۔

صبر کا دامن اب میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ قوت برداشت جواب دے گئی۔ میں نے جھپٹ کر اس کا گریبان دبوچ لیا اور زور سے جھٹکا دیا۔ وہ نشہ سے پہلے ہی لڑکھڑا رہا تھا۔ ڈگمگایا اور دھڑام سے فرش پر گرا۔ میں نے اسے گھونسوں اور لاتوں سے مارنا شروع کر دیا۔ لیکن اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ منہ اوندھائے فرش پر بے حال پڑا رہا۔ ذرا دیر بعد اس نے گردن اٹھا کر مجھے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ میں نے غضب ناک ہو کر اس کی کمر پر ٹھوکر مار دی۔ اس نے تڑپ کر ہائے کی اور آہستہ، آہستہ کراہنے لگا۔

کمرے میں گہری خاموشی چھائی تھی۔ میں آہستہ، آہستہ ہانپ رہا تھا۔ دلاور ابھی تک فرش پر پڑا تھا۔ پھر خاموشی میں اسکی آواز ابھری۔ وہ دل گرفتہ ہو کر کہہ رہا تھا۔ "تم نے مجھے اس لئے گالیاں دی ہیں اس لئے اتنا مارا ہے۔ کہ میں نے تم سے دو سو روپے لئے تھے اور یہ دو سو روپے مجھ سے زبردستی چھین کر ان لوگوں نے خوب شراب پی۔ مجھے بھی پلائی۔ اب وہ بقیہ روپوں سے مہ جبیں کے بالا خانے پر مجرا دیکھ رہے ہیں۔ عیش کر رہے ہیں اور میں یہاں مار کھا رہا ہوں۔ گالیاں سن رہا ہوں۔"

مجھے اس کی باتوں پر یقین آ گیا۔ اس لئے کہ میں جانتا ہوں کہ اس کے ہر انداز میں کوئی نہ کوئی تھرل ضرور ہوتا ہے۔ اسی تھرل کے بل بوتے پر وہ نواب زادہ دلاور علی خان بنا پھرتا ہے۔ خود کو خاندانی رئیس کہلواتا ہے اور یہ بھی اس کا تھرل ہی ہوگا کہ شام کو وہ بار میں گیا ہوگا اور اپنے احباب کو مرعوب کرنے کے لئے دو سو کے نوٹ نکال کر دکھائے ہوں گے۔ انھوں نے نوٹ اس سے چھین کر خرچ کر ڈالے ہوں گے۔ اس لئے کہ وہ ان سے روز مفت شراب پیتا ہے۔ سگریٹ پیتا ہے۔ فلم دیکھتا ہے۔ وہ ان کو ہرگز یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ یہ روپے وہ اپنے ناموس کو واسطہ دے کر لایا تھا۔ اپنی اس بہن کے لئے جس کی زندگی ڈاکٹر حنیف تباہ کر رہا ہے۔ یہ بات وہ بتا بھی کیسے سکتا

تھا۔ اس کی زندگی پر جو ملمع چڑھا تھا، اس طرح اتر جاتا۔

میں خاموش کھڑا سوچتا رہا۔ دلاور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دفعتاً اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپایا اور بلک، بلک کر رونے لگا۔ میں نے جیب سے پانچ سو روپے نکالے اور اس کے سامنے ڈال کر بولا۔ "جی چاہے تو اس رقم سے اپنی عزت اور اپنے ناموس کا تحفظ کر لو یا شراب پی کر اڑا دو۔ مگر آئندہ میرے پاس نہ آنا۔" وہ خاموش بیٹھا آنسو بہاتا رہا اور میں چپ چاپ باہر چلا گیا۔

وہ میرے پاس پھر کبھی نہیں آیا۔

پتھّر میں آگ

یہ اس کا قدِ آدم عکس تھا۔

آنکھوں میں ہلکا، ہلکا خمار، چہرے پر نکھری، نکھری شگفتگی۔ ذرا بے ترتیبی سے بکھرے، بکھرے بال نفاست سے سلے ہوئے اس نئے ایوننگ سوٹ میں وہ سچ مچ بڑا گریٹ نظر آ رہا تھا۔ اپنا عکس آئینہ میں دیکھتے، دیکھتے وہ یکایک بے ڈھنگے پن سے مسکرا دیا۔ منہ بگاڑ، بگاڑ کر دیدہ و دانستہ اپنا کارٹون بنانے کی کوشش کی اور آہستہ آہستہ سرخوشی کے عالم میں بڑبڑانے لگا۔ پاٹنز، کیا ٹھاٹھ ہیں تمھارے۔ آئینہ اور تنہائی، اس حمام میں سب ننگے نظر آتے ہیں۔

وہ دروازہ کھول کر باہر نکلا تو یاٹ کلب کا ہنگامہ کچھ اجنبی، اجنبی سا معلوم ہو رہا تھا۔ ہال میں قہقہے گونج رہے تھے۔ ملی جلی باتوں کی اُبھرتی اور ڈوبتی آوازیں تھیں اور یہ تمام شور مجموعی طور پر ایک طویل کراہ کی مانند لرز رہا تھا۔ یہ کس کا سوگ ہے؟ یہ کون مر گیا ہے؟ ہر طرف دھندلی، دھندلی پرچھائیاں ہیں اور مسلسل سسکیاں، کتنی ویرانی ہے۔ کتنی وحشت ہے۔ کہتے ہیں سنسان راتوں میں جب کتے روتے ہیں تو ان کو موت کے فرشتے نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ تو یاٹ کلب ہے۔ نینی تال کا خوبصورت شبستان۔ اچھا ہوا کہ تم کو عین وقت پر یاد آ گیا۔ دیکھو یہ تمھاری میز ہے، یہ تمھارا گلاس ہے۔ اس میں ابھی تھوڑی سی وہسکی موجود ہے اور دیکھو یہ تاجور سلطانہ ہے، جو تمھارا انتظار کرتے، کرتے اُکتا گئی ہے۔ اس کا چہرہ مضمحل نظر آ رہا ہے۔ آنکھوں میں ڈوبتے ستاروں کی جھلملاہٹ ہے۔ اس نے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے میز کے قریب جا کر اپنی کرسی کھسکائی

اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔ تاجور نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ آہستہ سے بولی۔

"بہت دیر لگادی آپ نے۔ کیا کوئی شعر موزوں کرنے لگے تھے؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بے ساختہ ہنسنے لگا۔ پھر اس نے گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا اور ساری وہسکی غٹا غٹ چڑھا گیا۔ تاجور گردن گھما کر خاموشی سے جھیل پر جھلملاتی ہوئی روشنیوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی گردن کا یہ خم اور چہرے کا یہ زاویہ بے حد دلآویز نظر آرہا تھا۔ نیازی بھرپور نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اسی طرح بیٹھی رہے۔ جھیل پر یہ دیپ مالا یونہی جگمگاتی رہے اور کوہستانی ہواؤں کی سنسناہٹیں اتنی تیز ہو جائیں کہ ہال میں دھڑکتا ہوا سارا شور اس میں ڈوب جائے۔

تاجور اسی طرح خاموش بیٹھی رہی۔ اس کے چہرے کے تمام خطوط یونانی مجسموں کی طرح ہر خم کو نمایاں کرتے رہے۔ اس کے بال نم آلود ہواؤں سے لہراتے رہے۔ نیازی ذرا اور آگے کی جانب جھک گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا کہ لہراتی ہوئی زلفوں کو چھو لے۔ مگر اس کا ہاتھ تھرتھرانے لگا۔ اس نے گہری سانس بھری۔ تاجور تم ناراض تو نہ ہو جاؤ گی، تم روٹھ تو نہ جاؤ گی۔ اسی کا جی چاہا کہ پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دے۔

دیکھو تاجور میں کتنا تنہا ہوں۔ کتنا اداس ہوں۔ تم مجھے اپنی پناہ میں لے لو۔ مجھے اپنے دامن میں چھپا لو۔ ان مہکتی ہوئی زلفوں سے مدہوش کر دو۔ سچ مچ میں بڑا غمگین ہوں۔ میں ہمیشہ مسرت کے گیت گاتا رہا۔ زندگی کے نغمے الاپتا رہا۔ لیکن زندگی مجھ سے دامن چھڑاتی رہی۔ مسرت نے مجھے قدم قدم پر فریب دیا ہے۔ میں کب تک خوابوں کا سہارا لیتا رہوں گا۔ کب تک سایوں کے پیچھے بھاگتا رہوں گا۔

تاجور نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے زیر لب مسکرا کر کہا۔

"ارے، یہ آپ اتنے خاموش کیوں بیٹھے ہیں؟"

نیازی آہستہ، آہستہ کہنے لگا۔ "آج کی رات بڑی سہانی ہے، بے حد سہانی ہے اور یہ راتیں انسان کو کہیں کا نہیں رکھتیں۔"

اس دفعہ وہ اور بھی کھل کر مسکرا دی۔ "آپ بہت رومینٹک ہوتے جا رہے ہیں۔" نیازی نے آہ بھرنے کے سے انداز میں لمبی سانس لی۔ "تم بلا کی ذہین بھی ہو اور یہی سب سے بڑی ٹریجڈی ہے۔"

تاجور نے بات کا رُخ بدل دیا۔ "یہاں نینی تال میں کب تک آپ کا قیام رہے گا؟"

"اگر تم سے ملاقات نہ ہوتی تو اب تک میں کبھی کا یہاں سے جا چکا ہوتا۔"

تاجور سنجیدہ ہو گئی۔ "یہ جون کا مہینہ ہے۔ لکھنؤ میں تو غضب کی گرمی پڑ رہی ہو گی۔"

نیازی نے اسے بھرپور نظروں سے دیکھا اور پھر مسلسل اسی انداز سے دیکھتا رہا۔ "تم کچھ پریشان معلوم ہو رہی ہو۔ اتنا باشعور ہونا بھی اچھا نہیں ہوتا۔ تاجور! زندگی بہت بڑی نعمت ہے اور راتیں ہمیشہ اتنی سہانی نہیں ہوتیں۔"

"آپ بڑی اچھی نظمیں کہتے ہیں۔ میرے پاس آپ کی کتنی ہی نظمیں موجود ہیں۔"

نیازی کچھ اور رومینٹک ہو گیا۔ "میں اگر تم کو تاجو کہوں تو بُرا تو نہ مانو گی؟"

"....."

نیازی نے بڑے پیار سے کہا۔ "تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"

اس دفعہ بھی وہ خاموش رہی۔

"بولو نا تاجور، تم جواب کیوں نہیں دیتیں۔ تم بولتی کیوں نہیں؟"

تاجور نے بڑے تیکھے انداز میں جواب دیا۔ "یہ کسنڈ ڈیڈی نے ایک فلائٹ لیفٹیننٹ کو دی تھی، جو برما کے محاذ پر شعلوں سے کھیلتے، کھیلتے شعلوں کی نذر ہو گئے۔ سردست میرا پروگرام شانتی نکیتن جانے کا ہے۔ فلم انڈسٹری سے وابستہ ہونے کے متعلق میں نے کبھی سوچا تک نہیں۔ اس لئے فلمی مکالموں کے بجائے اگر میں آپ کی کوئی تازہ نظم سنوں تو میرا خیال ہے کہ یاٹ کلب ایسی بُری جگہ نہیں ہے۔"

نیازی تلملا کر رہ گیا۔ اس نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "بہت نیک خیال ہے آپ کا۔ لیکن مس (اس نے پورا زور دیا) تاجور سلطانہ میں گراموفون کا ریکارڈ نہیں ہوں کہ جب جی چاہا بجا لیا۔ میں گوشت پوست کا بنا ہوا انسان بھی ہوں۔ میں ہر موضوع پر باتیں بھی کر سکتا ہوں۔ شراب بھی پی سکتا ہوں اور میں سوچتا ہوں کہ کلب کی اس حسین فضا سے مجھے متاثر ہونے کا بھی حق حاصل ہے۔ آپ نے میرے ساتھ اتنی دیر بیٹھنے کی جو زحمت گوارا کی ہے، اس عزت افزائی کا شکریہ۔ البتہ اتنا اور بتا دیجئے کہ آپ کے سر میں کہیں درد تو نہیں ہو رہا تاکہ

اسپرو کی ٹکیہ لاکر حاضر کر دوں۔ آسمان سے چاند اور ستارے توڑ کر لانے کی تو مقدرت نہیں۔ اس لئے کہ یہ تو اس زمانے کی باتیں ہیں۔ جب حاتم طائی کوہ ندا کی خبر لاتا تھا۔"

نیازی اسی طرح تیزی سے بولتا رہا۔ تاجور خاموش بیٹھی سب کچھ سنتی رہی۔

اچانک گہری خاموشی چھا گئی۔ دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔ نیازی نے وہسکی کا ایک اور پگ منگایا۔ آہستہ آہستہ اسے پیتا رہا اور سگریٹ کا دھواں اڑاتا رہا۔ ہال میں بدستور قہقہے گونجتے رہے۔ ملی جلی باتوں کا شور دھڑکتا رہا۔ ہوا کی سرسراہٹیں تیز تر ہو گئیں۔ جھیل کے شفاف پانی پر روشنیاں جھلملاتی رہیں۔ نیازی طبعاً بہت حساس تھا اور اس وقت تو شدتِ احساس کا یہ عالم تھا کہ ذہن میں گویا لاوا اُبل رہا تھا۔ اس نے پگ پر پگ منگانا شروع کر دیئے اور ان کو چڑھاتا چلا گیا۔ تاجور سلطانہ خاموش بیٹھی رہی۔ آخر اس مضمحل خاموشی سے اکتا کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

"میرا خیال ہے کہ اب چلنا چاہئے۔ کہئے تو میں آپ کو کوٹھی تک چھوڑ آؤں۔"

تاجور نے آہستہ سے کہا۔ "طاہر بھائی اب فلم دیکھ کر واپس آتے ہی ہوں گے۔ کیوں نہ تھوڑی دیر ان کا انتظار کر لیا جائے۔ میں ان سے وعدہ کر چکی ہوں۔"

نیازی نے بڑی بے نیازی سے جواب دیا۔ "بہت بہتر۔ میں تو اب چلوں گا۔" اور جواب کا انتظار کئے بغیر وہاں سے چل دیا۔

کلب سے باہر نکل کر جب وہ الوڑہ روڈ کی بلندی پر چڑھ رہا تھا تو ایکا ایکی اسے متلی معلوم ہوئی۔ مگر وہ تیز، تیز قدموں سے چلتا رہا۔ لیکن اس عالم میں زیادہ دور تک نہ جا سکا۔ زور کی اُبکائی ہوئی۔ وہ ٹھٹکا اور قے کر دی۔ لحظہ بھر کے لئے وہ بالکل بے حال ہو گیا اور وہیں فرش پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ ہر طرف گہرا سناٹا چھایا تھا۔ ہوا درختوں میں چیخ رہی تھی۔ وہ اسی طرح بے سُدھ پڑا رہا۔ پھر اس نے آہٹ سنی اوپر پہاڑی سے کوئی اسی طرف آ رہا تھا۔ قدموں کی آواز قریب ہوتی جا رہی تھی۔ وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے اوپر چڑھنے لگا۔

اسی طرح ڈگمگاتے قدموں سے چلتا ہوا وہ کوٹھی پر پہنچ گیا۔ لیکن جب وہ سیڑھیاں طے کر رہا تھا تو اس کے قدم ایک بار پھر لڑکھڑائے اور وہیں گر گیا۔ چوکیدار نے [redacted] اٹھایا اور بازوؤں میں سنبھال کر اسے

کمرے میں چھوڑ آیا۔ نیازی نے نہ کوئی بات کی، نہ کپڑے تبدیل کئے۔ اسی حالت میں بستر پر گر پڑا۔ نیند تو نہ آسکی۔ البتہ نیم بے ہوشی کی حالت میں لیٹا رہا۔ اس کا ذہن ابھی تک بیدار تھا۔ کتنی ہی بے تکی باتیں دماغ میں گردش کر رہی تھیں، پھر اس نے خان بہادر صاحب کی بھاری بھرکم آواز سُنی۔ وہ بھی واپس آگئے تھے۔ اس نے ان کے قدموں کی آواز اپنے کمرے میں محسوس کی۔ وہ خاموش کھڑے رہے۔ لیکن نیازی آنکھیں بند کئے لیٹا رہا۔ وہ زیادہ دیر وہاں نہ ٹھہرے اور خاموشی سے باہر چلے گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ نوکروں کو ڈانٹ پھٹکار رہے تھے۔ ان کی آواز اونچی اور اونچی ہوتی جارہی تھی۔ پھر ان کے منہ چڑھے ملازم افضل کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"سرکار اس میں میرا کیا قصور۔ انہوں نے خود ڈریسنگ روم میں جاکر وارڈ روب سے سوٹ نکالا اور پہن لیا اب بتائیے میں کیا کہتا؟"

خان بہادر گرج کر بولے "کیوں تمہارے منہ میں زبان نہیں تھی۔ اب یہ پورا سوٹ جو ستیاناس ہو گیا، یہ چپت کون تمہارا باپ آکر برداشت کرے گا۔"

چوکیدار نے سہمی ہوئی آواز میں مداخلت کی "سرکار آج تو انھوں نے بہت پی رکھی ہے۔ سیڑھیوں پر گر پڑے تھے۔ میں نے اٹھا کر کمرے میں پہنچایا ہے۔"

خان بہادر زور سے کھنکار کر بولے "ان سے کہہ دینا کہ کل ہی اپنا بستر بوریا اٹھائیں اور یہاں سے چلتے پھرتے نظر آئیں۔ خواہ مخواہ کے لئے ڈیرہ ڈالے پڑے ہیں۔ سالے بیہودہ کہیں کے بڑے شاعر بنے پھرتے ہیں۔" اسی طرح غصے سے بڑبڑاتے ہوئے وہ اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔

نیازی نے ساری باتیں سُنیں، مگر خاموش لیٹا رہا۔ اس میں اُٹھنے کی ہمت نہیں تھی۔ ورنہ وہ اسی وقت سوٹ اتار کر خان بہادر کے منہ پر مار دیتا۔ آخر خود کو سمجھتا کیا ہے، سالا بچوڑہ۔

صبح نیازی نے اپنا سامان درست کیا اور قبل اس کے کہ خان بہادر غسل خانے سے فارغ ہو کر ڈرائنگ روم میں پہنچیں، اس نے پہاڑی قلی بلوایا۔ اپنا تمام سامان لدوایا اور بس اسٹینڈ کی طرف چل دیا۔

نینی تال سے اتر کر وہ لال کنواں پہنچا اور برانچ لائن کی ایک ٹرین سے مراد آباد چلا گیا۔ آگے سفر کرنے کیلئے ریل کے کرایہ تک کا بندوبست نہیں تھا۔ پلیٹ فارم پر اتر کر اس نے سوچا کہ اب کہاں جائے؟ سوچتے سوچتے اسے

عبداللہ میکش کا خیال آگیا۔ بریلی کے ایک مشاعرے میں نیازی سے اسکی ملاقات ہوئی تھی۔ رخصت ہوتے وقت اس نے نیازی کو مرادآباد آنے کی دعوت بھی دی تھی۔ بہت اصرار بھی کیا تھا۔

بڑی مشکل سے میکش کا پتہ چلا۔ زندگی میں ڈگڈگی بجا کر تو پیٹ پالا جاسکتا ہے، مگر شاعری سے تو قرض ملنے کا بھی بھرم نہیں رہتا۔ لہٰذا میکش نے ایک چائے خانہ کھول لیا تھا اور اس کا بڑا شاعرانہ سا نام رکھا تھا۔ "شبستان"۔ اس چائے خانہ میں تمام وقت فلمی ریکارڈ بجتے تھے اور دن بھر اُبلنے والی چائے کا دور چلتا تھا۔ چائے خانے کے پچھلے حصے میں ایک نیم تاریک کمرہ تھا، جس میں میکش رہتا تھا۔ اسی کمرے میں نیازی کا بستر بھی لگا دیا گیا۔ دس بجے تک میکش کاؤنٹر پر بیٹھتا۔ اس کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلا جاتا۔ پھر تھری ایکس رم کی بوتل آتی اور رات گئے تک شراب کا دور چلتا۔ البتہ جس روز نیازی پہنچا تھا، اس روز میکش اسے تفریح کرانے بھی لے گیا۔ ایک بالاخانے پر جاکر انھوں نے گانا بھی سُنا تھا۔ طوائف نوجوان تھی۔ ناچنا تو کچھ یونہی سا جانتی تھی۔ مگر آواز میں بڑا رس تھا اور بھاؤ بتانے میں ہر بول کے ایک ایک لفظ کو اس طرح ادا کرتی کہ سماں بندھ جاتا۔ اس کے ناز و انداز میں کہیں، کہیں گھریلو حیا کی بھی جھلک تھی۔ نیازی کو یہ سانولی سلونی لڑکی بڑی اچھی معلوم ہوئی۔ اس میں دلکشی بھی تھی۔ اور فطری ادائیں بھی تھیں۔ اس کا نام نہ زہرا بجبیں تھا، نہ بدر منیر۔ صرف زیبا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ اس محفل کو زیب بھی دے رہی تھی۔ زیبا کو جب میکش نے بتایا کہ نیازی بہت مشہور شاعر ہے۔ اس کے گیت فلموں میں بھی آچکے ہیں اور اسکی غزلیں ریڈیو پر گائی جاتی ہیں تو وہ بہت متاثر ہوئی۔ اس کا التفات کچھ اور بڑھ گیا۔ یہی وہ بات تھی جو بعد میں نیازی کے ذہن میں کلبلاتی رہی۔ لیکن نہ تو میکش نے پھر ایسا کوئی پروگرام بنایا اور نہ نیازی کو اتنی جرأت ہوئی۔ البتہ روزانہ رات کو دونوں رم پیتے۔ شعر و سخن کی محفل گرم ہوتی اور پھر اپنے اپنے بستروں پر جاکر سو جاتے۔

راتیں اسی طرح آتی رہیں اور گزرتی رہیں۔ "شبستان" کے ہنگامے بدستور جاری رہے۔ لیکن نیازی اس زندگی سے کچھ عرصے بعد اُکتا گیا۔ انھی دنوں ایک سپہر کو اسٹیشن پر یونہی ٹہلتا ہوا چلا گیا۔ اتفاق سے وہاں اس کی ملاقات ماتھر سے ہوگئی۔ وہ اپنے طائفے کے ساتھ ہردوار کے میلے سے واپس آرہا تھا۔ اس دورے میں اس نے لوک گیت گانے والوں کی ریکارڈنگ کی تھی۔ مرادآباد میں وہ چند روز قیام کرنا چاہتا تھا۔ نیازی سے اس کو بڑی عقیدت

تھی۔ نیازی کی پریشان حالی کا اسے علم ہوا تو اس نے کچھ غزلیں ریکارڈ کرنے کا منصوبہ بنایا اور ایک روز نیازی کی کئی غزلیں ریکارڈ بھی کرلیں۔ اس طرح ہز ماسٹرز وائس گراموفون کمپنی کی طرف سے نیازی کو پیشگی رائلٹی کی صورت میں کوئی دو سو روپے مل گئے۔ لیکن میکش سے اس نے اس رقم کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ حسب معمول رات کو اس نے میکش کے ساتھ رم پی اور ماتھر سے ملنے کا بہانہ کرکے سیدھا زیبا کے بالاخانے پہنچا۔

لیکن آج زیبا کی بزم ناز میں تماش بینوں کا ہجوم تھا۔ وہ دہلیز پر خاموش کھڑا ہوا اس جمگھٹے کو دیکھتا رہا، پھر جھنجھلا کر واپس جانا ہی چاہتا تھا کہ زیبا نے بڑے انداز سے مسکرا کر اسے دیکھا۔ قریب آئی اور ہاتھ پکڑ کر گاؤ تکیہ کے سہارے بٹھا دیا۔ وہ برابر مسکراتی رہی۔

"کہئے کیا خدمت کی جائے؟"

"خدمت!" وہ جھوم کر ہنسنے لگا اور بڑے ڈرامائی انداز میں بولا۔ "غزل چھیڑو غزل۔ اس طرح گاؤ کہ ہر نقش ماسوا کو مٹا دو۔"

لیکن ایک بھاری بھرکم جسم والے آدمی نے تقریباً چیخ کر کہا۔ "نہیں! پہلے تم کو وہ گانا ہوگا۔ پی پی نہ بول بیری! اور کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔"

نائیکہ نے جلدی سے اگالدان میں پیک تھوکی اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگی۔ "خان صاحب! ہم تو سب کے تابعدار ہیں۔ آپ کا حکم بھی سر آنکھوں پر۔"

وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔ "نہیں پہلے وہی ثریا والا گانا ہوگا۔ تم سب کی تابعدار نہیں ہو صرف ہماری۔ ہاں صرف ہماری بات تم کو ماننا پڑے گی۔ اپنے برابر کا ہے کوئی شوقین۔"

حقیقت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ احمد ولی خان بوڑھا آسامی ہونے کے علاوہ روز کا آنے والا تھا۔ نائیکہ کو اسکی بات ماننا پڑی۔ اس نے زیبا کو چمکا کر کہا۔ "بیٹی! خان صاحب کا دل رکھ لو۔ چلو ان کی ہی بات مان لو۔"

سازندوں نے فوراً ساز چھیڑ دیئے۔ نیازی نے خاموشی سے یہ تمام ڈراما دیکھا۔ لیکن جب زیبا نے احمد ولی خان کی فرمائش پر فلمی گیت چھیڑا تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ زیبا نے اس کی طرف سہمی نظروں سے اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔ نیازی صاحب آخر میں ایک طوائف ہی تو ہوں۔ میرا کام تو سب کی خوشنودی ہے۔ سب کو خوش کرنا

ہے۔ لیکن احمد ولی خان نے نیازی کو جانے نہ دیا۔ اپنی جگہ سے اٹھا اور نیازی کا ہاتھ پکڑ کر پھر بٹھا دیا۔ خود اس کے برابر بیٹھ کر کہنے لگا "میاں صاحبزادے یہ رنڈی کا کوٹھا ہے۔ یہاں آدمی نے مونچھ اونچی کی اور گیا کام سے۔ یہاں تو دس سال ہو گئے یہی دیکھتے ہوئے۔" اس نے زیبا سے کہا "نہیں غزل ہی ہو گی۔" اور پھر غزل شروع ہو گئی۔

نیازی نے ایک ایک شعر پر روپے کی بوچھاڑ کر دی۔ زیبا ساری محفل سے بے نیاز ہوتی گئی، مسکراتی رہی، گاتی رہی پھر نیازی نے شراب منگوائی اور دور چلنے لگا۔ نیازی کی انا کو تسکین مل رہی تھی۔ وہ جذبہ جو ننھی تال میں بری طرح کچلا گیا تھا، اب شوریدہ سری اختیار کر چکا تھا۔ رات اسی طرح گزرتی رہی۔ جام گردش میں آتا رہا۔ زیبا کی آواز جادو جگاتی رہی۔ اس کے ہاتھوں کے خم ایک ایک تاثر کو اجاگر کرتے رہے۔ بانکی چتونوں کے بان کتنی ہی داستانیں دھراتے رہے۔ رات گزرتی رہی رات ڈھلنے لگی اور پھر وہ لمحہ آ گیا کہ محفل ختم ہو گئی۔

جب وہ سیڑھیوں پر سے اتر رہا تھا۔ تو زیبا نے کہا "کل پھر آئیے گا؟"

نیازی نے بڑی بے نیازی سے کہا "کل! کوئی ضروری نہیں کہ آ جاؤں۔ خان صاحب کی طرح میرا برتنوں کا کارخانہ تو ہے نہیں۔" لحظہ بھر رک کر وہ بولا "لیکن واقعی تم بہت اچھا گاتی ہو، بہت اچھا گاتی ہو۔"

زیبا نے جھک کر آداب کیا۔ "حوصلہ افزائی کا شکریہ۔ مگر کل آپ آئیے گا ضرور۔"

نیازی وہاں سے جھومتا ہوا "شبستان" کی طرف چل دیا۔ میکش اب سو چکا تھا۔ لہٰذا کوئی بات چیت نہ ہو سکی۔ وہ چپ چاپ بستر پر لیٹ گیا۔ دوسرے روز دن چڑھے اس کی آنکھ کھلی۔ سب سے پہلے اسے روپے کا خیال آیا۔ اس نے اٹھ کر اپنی جیب دیکھی۔ ابھی تک پتیس روپے موجود تھے۔ اس نے سوچا کہ اب لکھنؤ روانہ ہو جانا چاہیئے ورنہ کرایہ بھی نہ بچے گا۔ مگر میکش نے ایک روز کے لئے اسے اور روک لیا۔ حسب معمول رات کو دونوں نے بیٹھ کر رم پی، شعر و سخن کی محفل گرم ہوئی۔ مگر نیازی جلد ہی اس صحبت سے اکتا گیا۔ اس نے پھر ماتھر کا بہانہ بنایا اور زیبا کے بالاخانہ پر پہنچ گیا۔ آج بھی اسی طرح تماش بینوں کا ہجوم تھا۔ زیبا نے اسی طرح مسکرا کر اسے مسند پر گاؤ تکیے کے سہارے بٹھا دیا۔ وہ خاموش بیٹھا گاتا سنتا رہا۔ اس نے ایک بوتل شراب منگوائی اور پینا شروع کر دیا۔ زیبا گاتی رہی، مسکراتی رہی، جھوم جھوم کے اس کے پاس آتی رہی اور نیازی اسے روپے دیتا رہا۔ لیکن جب اسکی جیبیں خالی ہو گئیں تو زیبا کو

اپنی توجہ دوسرے تماش بینوں پر بھی مرکوز کرنا پڑی۔ نیازی کی انا کو ٹھیس پہنچنے لگی۔ اس نے سوچا کہ اب خیریت اسی میں ہے کہ یہاں سے چلا جائے۔ لیکن زیبا نے اسے جانے نہ دیا۔ وہ اصرار کرنے لگی اور جلدی سے ایک غزل شروع کر دی۔ نیازی کی جھنجھلاہٹ اور بڑھ گئی۔ سوچنے لگا۔ آخر یہ لڑکی مجھے اس طرح بٹھا کر کیوں ذلیل کرنا چاہتی ہے۔ وہ کیوں میری خودداری سے کھیلنا چاہتی ہے۔ کیوں میری انا سے کھیل رہی ہے۔ آخر یہ کیا ستم ہے۔ اس کا التفات میری مفلسی کا مذاق اڑا رہا ہے۔ چرکے پر چرکے لگا رہا ہے۔ لیکن زیبا گاتی رہی۔

شمع کو دیکھ میرے دل کے جلانے والے!

کسی نے نشے کی جھونک میں لہرا کر کہا "اس محفل کی شمع تو تم ہو۔ صرف تم ہو۔"

زیبا نے مسکراتے ہوئے کہا "اچھا یہ بات ہے تو لیجئے!" اس نے بڑھ کر بجلی کا سوئچ آف کر دیا۔ کمرے میں گہری تاریکی پھیل گئی۔ نیازی بھی گھبرا سا گیا۔ اسی وقت اس نے زیبا کو اپنے قریب پایا۔ اس نے کوئی چیز اس کے ہاتھوں میں دی اور دور ہٹ کر قہقہہ لگانے لگی۔ نیازی نے محسوس کیا۔ اس کی ہتھیلی پر کچھ مڑے ہوئے نوٹ موجود ہیں۔ اس نے جلدی سے ان کو جیب میں ڈال لیا۔ اندھیرے سے پریشان ہو کر کوئی بولا "یہ کیا مصیبت ہے۔ روشنی کرو۔" زیبا کی آواز سنائی دی "بس! شمع محفل دیکھ چکے" اور اس نے روشنی کر دی۔

نیازی کو اس پر ترس آ گیا۔ اس نے خمار آلود نظروں سے زیبا کو دیکھا اور سوچنے لگا۔ زیبا! تم اس بازار کی رونق ہو۔ اس محفل کی جان ہو اور یہ بازار، یہ محفل بہت بڑا قمار خانہ ہے۔ اس قمار خانے میں تم حکم کی ایک ایسی بیگم ہو، جس کو جیتنے کی ہر جواری کوشش کرتا ہے۔ داؤں پہ داؤں لگاتا ہے اور جی کھول کر ہارتا ہے۔ دولت کے اس کھیل میں ایک شاعر کی بھلا کیا بساط! ہر روز اس طرح نہ بجلی بجھائی جا سکتی ہے اور نہ ہر روز اس طرح تم میری ناز برداری کر سکتی ہو۔ زیبا صرف حکم کی بیگم ہے بے چاری زیبا!

نیازی کی الجھن بڑھنے لگی۔ اس ہنگامہ میں اس کا دم گھٹنے لگا۔ اب تو وہ یہاں سے فوراً جا بھی نہیں سکتا تھا۔ اس ذہنی انتشار سے نجات حاصل کرنے کے لئے اس نے اور شراب منگوائی اور اس کے نشہ میں پناہ حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر وہ زیادہ دیر وہاں ٹھہر نہ سکا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ تمام نوٹ نکالے اور زیبا پر نچھاور کر دیئے۔ اٹھا اور تیزی سے کمرے کے باہر چلا گیا۔

بازاروں میں اب سناٹا چھا گیا تھا۔ سڑکیں بالکل ویران تھیں۔ نیازی ڈگمگاتا ہوا چلتا رہا۔ ایکبارگی اس کو متلی محسوس ہوئی۔ اس نے قے کی۔ کچھ دیر سڑک پر پڑا رہا۔ پھر لڑکھڑاتا ہوا ایک دکان کے تھڑے پر جا کر بے سدھ ہو کر دراز ہو گیا۔ نہ معلوم وہ کتنی دیر اسی حالت میں پڑا رہا۔

رات کے پچھلے پہر کسی نے جھنجوڑ کر اس سے کہا "اٹھو یہ سونے کی جگہ نہیں ہے۔"

نیازی نے بغیر آنکھ کھولے ہوئے کہا "تم کون ہو؟ خدائی فوجدار؟"

"خدائی فوجدار کے بچے اٹھ کر بیٹھ۔" اس نے نیازی کو اٹھا کر بٹھا دیا۔

نیازی نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور بگڑ کر بولا "عجیب نامعقول آدمی ہو تم۔"

گشت کرنے والے دونوں کانسٹیبلوں کو ایک دم سے طیش آ گیا۔ انھوں نے پکڑ کر اسے نیچے اتارا اور تھانے کی طرف چل دیئے۔ نیازی راستہ بھر ان پر جھنجلاتا رہا۔ تھانے جا کر اس نے بڑے طنطنے سے بتایا کہ وہ مشہور شاعر نیازی ہے۔ مگر تھانیدار نے کسی نیازمندی کا ثبوت نہیں دیا بلکہ حوالات میں بند کر دیا۔ سویرے جب میکش کو اطلاع ملی تو اس نے آ کر بری کرایا۔ اس حادثہ سے نیازی کو اتنی کوفت ہوئی کہ وہ اسی روز میکش سے کچھ روپے قرض لے کر لکھنؤ روانہ ہو گیا۔

گھر پر جب وہ پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔ کسی نے نہ تو کھانے کو پوچھا، نہ یہ دریافت کیا کہ وہ اتنے عرصہ کہاں رہا۔ گھر میں ہر طرف خاموشی چھائی تھی۔ کبھی کبھی اس سکوت میں اس کے باپ کی کھانسی کی آواز گونجنے لگتی۔ پھر سناٹا چھا جاتا۔ وہ اپنے بستر پر چپ چاپ پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ اس نے سوچا اس کی بہن تو اس کے پاس ضرور آئے گی۔ مگر اس کا بھی خون سفید ہو گیا تھا۔ پھر اسی طرح بے چینی سے کروٹیں بدلتے، بدلتے وہ گھر والوں کی بے التفاتی پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ کیا اس کو کہیں پناہ نہ ملے گی۔ ہر جگہ سے وہ دھتکارا جائے گا۔ ذلیل و خوار ہوتا رہے گا۔ لیکن جس طرح بند ٹوٹ جانے کے بعد پانی کا تیز بہاؤ اپنا رخ بدل دیتا ہے، بالکل اسی انداز سے اس کے ذہن میں ایک نئی رو ابھری۔ وہ سوچنے لگا کہ اس معاشرے میں جہاں ادب اور فن کا مطلب ہے، ناداری، فاقہ کشی، ذلت و خواری تو پھر محبت کے گیت گانا گناہ ہے۔ زندگی کے نغمے الاپنا جرم ہے۔ زندگی صرف کاروبار ہے۔ لین دین کا بیوپار ہے۔ یہاں ہر چیز کا مول تول ہوتا ہے۔ کیوں نہ میں بھی لگے ہاتھ فن کا سودا کر ڈالوں اور یہ شہرت،

یہ عقیدت، یہ مقبولیت، سب فراڈ ہے۔ خود فریبی ہے۔ پیٹ پوجا کا سوال سب سے زیادہ اہم ہے۔ اسی طرح سوچتے سوچتے وہ سو گیا۔

پھر کچھ عرصہ بعد سننے میں آیا کہ نیازی سرکار کی طرف سے پبلسٹی افسر مقرر ہو گیا۔ اس کے فن پر اس ملازمت سے کوئی اثر نہیں پڑا۔ اب بھی وہ گیت کہتا۔ نظمیں تخلیق کرتا۔ غزلیں گنگناتا۔ آزادی کے گیت، ترقی کے گیت، فارغ البالی کے گیت۔ آزادی جس کی بدولت لاکھوں انسان فسادات میں جاں بحق ہوئے۔ ترقی جو قحط کے روپ میں بنگال سے جنوبی ہند تک پھیلتی جا رہی تھی اور فارغ البالی جس نے ہر گلی ہر کوچہ میں قحبہ خانے بنا دیئے۔ ننگے بھوکے مریل انسان گلا پھاڑ، پھاڑ کر چیخ رہے تھے "ہم کو روٹی دو۔ کپڑا دو، مکان دو" اور سرکار ان کے لئے ٹینک خریدتی رہی، بمبار طیارے خریدتی رہی، مشین گنیں خریدتی رہی۔ اس لئے کہ دنیا کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اور اس کا واحد حل ہے، جنگ! اور جنگ کا مطلب ہے کھربوں کے وارے نیارے۔ اس کاروباری دنیا کا ایک ہی نعرہ ہے "جنگ آ رہی ہے۔ جنگ آ رہی ہے"۔ وال اسٹریٹ کی چہل پہل بڑھتی جا رہی ہے۔ پنٹاگان کی رونق دوبالا ہوتی جا رہی ہے اور ننگے بھوکے انسانوں کے چہروں پر مردنی چھا رہی ہے۔ ہر طرف گویا ہوائی حملہ کے سائرن بج رہے ہیں۔ ویران کھنڈر میں چنڈول بول رہے ہیں۔ لاشوں کے گرد گیدڑ چیخ رہے ہیں۔ موت کے ان ہنگاموں سے آواز ملا کر نیازی گیت گاتا رہا۔ نغمے الاپتا رہا۔

ان دنوں اس پر ایک انمحالی کیفیت طاری ہوتی جا رہی تھی۔ ایسی اکتاہٹ جس نے اسے چڑچڑا بنا دیا تھا۔ ایسی پژمردگی جس نے اسے تنہائی پسند بنا دیا تھا۔ اب اسے اپنے ماضی سے بے حد محبت ہو گئی تھی۔ وہ بیتے دنوں کی یادوں میں تلطف محسوس کرتا۔

اُنھی ایام میں ایک روز اس نے پرانے خطوط کا پلندہ نکالا۔ اس میں ایک پیکٹ کیپٹن آغا کے خطوط کا بھی تھا۔ یہ خطوط جو اس نے دوسری جنگ عظیم کے دوران میں سنگاپور سے لکھے تھے۔ آغا کے خطوط بڑی پابندی کے ساتھ آتے رہے۔ نیازی اسے اپنی نئی نظمیں بھیجتا رہا۔ اپنی ناکام محبتوں کی داستانیں سناتا رہا۔ پھر اچانک آغا کے خطوط آنا بند ہو گئے۔ بہت عرصہ بعد جب نیازی کئی مہینہ تک بمبئی میں رہنے کے بعد لکھنؤ واپس آیا تو یہ سن کر اسے بے حد صدمہ پہنچا کہ آغا اس دنیا میں نہیں رہا۔ آغا، وہ ہنس مکھ نوجوان، بزمِ محفل تھا، جو اپنی بیوہ ماں کا چہیتا

بیٹا تھا۔ اور اپنی نئی نویلی دلہن کا آشفتہ مزاج شوہر۔ آغا جس نے بڑے دلچسپ خطوط لکھے تھے۔ اور آج عرصہ دراز بعد نیازی ان خطوں کو ایک بار پھر پڑھ رہا تھا۔

اس نے اسی جنگ کے خلاف ایک نظم کہی۔ لیکن جب اس نے یہ نظم ایک مشاعرے میں پڑھی تو چند ہی روز بعد اس نظم کے متعلق سرکاری طور پر جواب طلب کیا گیا۔ اس دن دفتر میں وہ کچھ ہو بھی چڑچڑا رہا تھا۔ جواب طلبی پر اور برافروختہ ہو گیا یہ کیا بیہودگی ہے کہ میں اپنے دوست کی یاد میں مرثیہ بھی نہ کہوں۔ کیا وہ جنگ میں نہیں مارا گیا؟ کیا جنگ آغا کے ایسے لاکھوں نوجوانوں کے لئے موت کا پیغام نہیں لاتی؟ اس نے غصہ میں آکر جواب طلبی کا سرکاری مراسلہ پھاڑ ڈالا اور دفتر سے اُٹھ کر گھر چلا آیا۔ بڑے بھائی نے بتایا کہ خفیہ پولیس کے آدمی اس کے خلاف تحقیقات کرنے آئے تھے۔ یہ سُن کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس نے اسی وقت اپنا استعفیٰ لکھا اور دفتر کو روانہ کر دیا۔ یہ سب کچھ اس نے نیم دیوانگی کی عالم میں کیا تھا۔ مگر اب سوال یہ تھا کہ وہ کیا کرے۔

نیازی نے اسی روز سامان درست کیا اور چپ چاپ نینی تال چلا گیا۔ ابھی سیزن شروع نہیں ہوا تھا۔ نینی تال میں زیادہ چہل پہل نہ تھی۔ ہر طرف ایک سکون سا چھایا ہوا تھا۔ اس سکون کی اسے ضرورت بھی تھی۔ کچھ عرصے تک وہ گرینڈ ہوٹل میں ٹھہرا رہا، مگر جب روپیہ کم ہو گیا تو اس نے "وزیٹرز ہوم" میں ایک سستا سا کمرہ لے لیا۔ اس زمانے میں اس نے بڑی لاجواب نظمیں کہیں۔ جو ہر حلقے میں مقبول ہوئیں۔ مگر اس کی جیب خالی ہوتی جا رہی تھی۔ اور قرض کا بار بڑھتا جا رہا تھا۔

قرضخواہ آئے دن پریشان کرتے۔ درزی نے ملی تال سے گزرنا دوبھر کر دیا تھا۔ دیا رام کلاتھ مرچنٹ کا ملازم روز آکر تقاضا کرتا۔ دھوبی الگ جان کھا رہا تھا۔ اخبار والا سویرے ہی سویرے آکر اپنا شکوہ سُنا جاتا۔ اسی اثنا میں جب وہ بے حد پریشان تھا۔ "وزیٹرز ہوم" کے مینجر نے بھی اسے ۲۷ تاریخ تک حساب بے باق کرنے کا نوٹس دے دیا۔ نیازی اور بھی حواس باختہ ہو گیا۔ اس نے مینجر کو دل ہی دل میں ہزاروں گالیاں دیں۔ پھر گھڑی بیچ کر اس نے دن بھر شراب پی اور رات گئے تک برابر پیتا رہا۔ اسی عالم میں کرسی پر لیٹا، لیٹا سو گیا۔ جب آنکھ کھلی تو رات کا اندھیرا بدستور چھایا ہوا تھا۔ اس نے اٹھ کر سگریٹ سلگائی اور لڑکھڑاتا ہوا سا جا کر کھڑکی کی چوکھٹ کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ ہر طرف گہرا سکوت طاری تھا۔ کوہستانی ہوائیں دیوانہ وار چیخ رہی تھیں۔ پچھلی

رات کا خزاں دیدہ چاند درختوں کے پیچھے بیمار اور افسردہ نظر آ رہا تھا۔ فضا میں اداسی تھی۔ ویرانی تھی اور تھکی تھکی سی خاموشی۔

نیازی اسی طرح دریچے کے پاس کھڑا رہا۔ خیالات کی ایک رو اس کے ذہن میں بے تحاشا گردش کر رہی تھی۔ وہ برابر سگریٹیں سلگاتا رہا، دھوئیں کے بادل بکھیرتا رہا اور لگاتار سوچتا رہا۔ پھر اس نے انگڑائی لی۔ ٹیبل لیمپ روشن کیا اور ایک نظم لکھنے بیٹھ گیا۔ یہ فن کی موت تھی۔ زندگی کی پسپائی تھی۔ وہ برابر سوچتا رہا۔ ادب و ثقافت کی ترقی کا مطلب ہے، امن! اور امن کا مفہوم ہے۔ جنگ کی مخالفت اور یہ احتجاج کبھی کبھی بہت مہنگا پڑتا ہے۔

نیازی دن چڑھے تک بیٹھا نظم لکھتا رہا۔ جتنے قرضخواہ اس کے پاس آتے گئے۔ سب سے وہ ۲۷ تاریخ کا وعدہ کرتا گیا۔

۲۶ تاریخ تک اس نے تمام قیمتی چیزیں فروخت کر ڈالیں۔ بقیہ سامان بیروں میں تقسیم کر دیا۔ سہ پہر کو اس نے چیک بک میں سے دوسرے دن کی تاریخ کا بوگس چیک کاٹا۔ ایک گورنمنٹ کنٹریکٹر کی معرفت اسے کیش کرایا۔ اس رقم سے اس نے وہسکی کی دو بوتلیں خریدیں۔ ہیرا سنگھ بیرے کو بلایا۔ اسے دس روپے پیشگی ٹپ کے دئے اور گرین ہاؤس سے رات کو لڑکی لانے کا بندوبست کر لیا۔

رات کا اندھیرا پھیلتے ہی ہیرا سنگھ آ گیا اور نیازی کو اپنے ہمراہ گرین ہاؤس لے گیا۔ ویسے تو یہ ریڈ لائٹ ایریا تھا اور میونسپلٹی کی جانب سے باقاعدہ منظور شدہ تھا۔ مگر یہ خاصی بڑی عمارت تھی اور اس کی دیواریں، کھڑکیاں اور سائبان نما جھکی ہوئی چھتیں، سب ہی سبز رنگ کی تھیں۔ رنگ کی مناسبت ہی سے اسے گرین ہاؤس کہا جاتا تھا۔ اس کی پہچان بھی یہی سبز رنگ تھا۔ گرین ہاؤس چڑھائی پر واقع تھا اور اسے کرسی دے کر تعمیر کیا گیا تھا۔

ہیرا سنگھ آگے، آگے تھا اور نیازی اس کے عقب میں چل رہا تھا۔ دونوں گرین ہاؤس کے قریب پہنچے اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچ گئے۔ بیچ میں کشادہ راہداری تھی اور اس کے دونوں طرف کمرے تھے۔ جن میں طوائفیں رہتی تھیں۔ لیکن گرین ہاؤس پر خاموشی چھائی تھی۔ بیشتر کمروں کے دروازے بند تھے۔ بات یہ تھی کہ برسات شروع

ہوتے ہی میدانی علاقوں سے آنے والے واپس جانا شروع ہو جاتے تھے۔ ان کی واپسی کے ساتھ ہی نینی تال کی چہل پہل بھی ختم ہو جاتی۔ گرین ہاؤس کی رونق بھی ماند پڑ جاتی۔ طوائفوں کا کاروبار ٹھنڈا پڑ جاتا، لہٰذا وہ بھی مراد آباد، بریلی، رام پور اور آس پاس کے دوسرے شہروں میں کھانے کمانے کے لئے چلی جاتیں اور آبی پرندوں کی مانند موسم گرما شروع ہوتے ہی واپس گرین ہاؤس پہنچ جاتیں۔

گرین ہاؤس میں ابھی تک چند طوائفیں موجود تھیں۔ نیازی نے ایک نوجوان لڑکی کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ رنگ روپ اور چہرے مہرے سے وہ سورج بنسی راجپوت معلوم ہوتی تھی۔ بوٹا سا قد۔ گول چہرہ۔ رخساروں پر تازہ کھلتے ہوئے گلاب۔ آنکھوں میں ستاروں کی جھلمل جھلمل کرتی ہوئی کہکشاں۔ نیازی کو وہ اس قدر پسند آئی کہ بے اختیار گنگنانے لگا "زندگی چاندسی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں" ان دنوں بازار مندا تھا۔ لہٰذا بھاؤ بھی گرا ہوا تھا۔ بوڑھی نائیکہ نے تیس روپے مانگے اور نیازی نے فوراً دیدیئے۔ وہ واپس آگیا۔ البتہ ہیرا سنگھ گرین ہاؤس میں ٹھہرا رہا۔

پہر رات گزری تو ہیرا سنگھ نے لڑکی کو نیازی کے کمرے میں پہنچا دیا۔ نیازی نے اسے ایک بار پھر گہری نظروں سے دیکھا۔ اس کی عمر زیادہ نہ تھی۔ آنکھوں میں دبا، دبا خوف تھا اور چہرے سے گھبراہٹ جھلکتی تھی۔ نیازی نے مسکرا کر نرم لہجے میں کہا "ڈرو مت"۔ اس نے ایک کرسی کی جانب اشارہ کیا۔ "آرام سے اس پر بیٹھ جاؤ"۔ اس نے مڑ کر ہیرا سنگھ پر نظر ڈالی۔ "ہیرا سنگھ! تم ٹھیک گیارہ بجے آجانا۔ اب تم جاؤ اور دروازہ بند کر دو"۔ ہیرا سنگھ چلا گیا۔ نیازی نے بوتل کھولی۔ گلاس میں وہسکی ڈالی۔ پانی ملایا اور رک، رک کر گھونٹ بھرنے لگا۔ وہ لڑکی کو مسلسل دیکھتا رہا۔ مگر نہ اس سے بات کی اور نہ ہی اس کے جسم کو ہاتھ لگایا۔

وہ گھبرائی ہوئی سی چپ چاپ کرسی پر بیٹھی رہی۔ نیازی وہسکی کے گھونٹ بھرتا رہا۔ ایک کے بعد دوسرا گلاس خالی کرتا رہا۔ لڑکی نے کئی بار بے چین ہو کر پہلو بدلا، لیکن نیازی نے اس سے کچھ نہ کہا۔ وقت گزرتا رہا۔ دس بجے ساڑھے دس بجے۔ گیارہ بج گئے۔ ہیرا سنگھ نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ نیازی نے اونچی آواز سے کہا "اندر آجاؤ ہیرا سنگھ"۔ وہ دروازہ کھول کر اندر آگیا۔ نیازی اٹھا۔ تمام جیبیں ٹٹولیں اور جو کچھ اس کے پاس تھا۔ لڑکی کے حوالے کر دیا۔ اس کے رخسار کو آہستہ سے تھپتھپا کر کہا "شب بخیر!" وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور نیازی کو حیرت سے مڑ مڑ کر دیکھتی ہوئی چلی گئی۔ نیازی نے

اپنے تمام کپڑے ہیرا سنگھ کو دیدیئے اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

باہر گہری خاموشی چھائی تھی اور نیازی کمرے کے اندر بالکل تنہا تھا۔ اس نے میز کی دراز سے ایک چھوٹی سے شیشی نکالی۔ اسے کھولا اور گلاس میں الٹا کر کے خالی کر دیا پھر اس گلاس میں وہسکی انڈیلی اور لبالب بھر دیا۔ گلاس اٹھایا۔ بھرپور نظروں سے اسے دیکھا۔ ہونٹوں سے لگایا اور آنکھیں بند کر کے غٹاغٹ پورا گلاس چڑھا گیا۔ اٹھا اور آئینے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا قد آدم عکس سامنے تھا اور رفتہ رفتہ دھندلا پڑتا جا رہا تھا۔ اس نے گلاس اٹھایا اور آئینہ پر دے مارا۔ زور کا چھناکا ہوا اور آئینہ چکنا چور ہو گیا۔ اس کا عکس ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گیا۔

وہ لڑکھڑاتا ہوا میز کے قریب گیا۔ بوتل اٹھا کر منہ سے لگائی اور گھونٹ پر گھونٹ بھرنے لگا۔ اس کی نسیں دھندلی پڑتی جا رہی تھیں۔ کمرے میں ہر طرف پرچھائیوں کا جال پھیلتا جا رہا تھا۔ اس نے میز پر رکھی ہوئی اپنی آخری نظم اٹھائی۔ صرف عنوان پڑھ سکا "خودکشی"۔ مگر آگے نہ پڑھ سکا۔ نگاہیں ساتھ نہ دے سکیں۔ وہ بے بسی کے عالم میں رونے لگا۔ آنسو پلکوں سے ڈھلک، ڈھلک کر گالوں پر ٹپ، ٹپ گرنے لگے۔ اس نے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس کیا۔ بدحواس ہو کر اس نے کرسی پر سے اٹھنا چاہا، مگر لڑکھڑا کر وہیں فرش پر گر گیا۔

فرش پر پڑے، پڑے اس نے سنا۔ کہیں نزدیک ہی ستار مدھم سروں میں بج رہا تھا۔ ستار کے سُر اونچے اور اونچے ہوتے گئے، پھر ستار کے سر اس قدر اونچے ہو گئے کہ ستار، ستار نہ رہا، شیو جی کا تانڈو بن گیا اور طوفان کی گھن گرج کی مانند دڑدکنے لگا۔ دھم! دھم!! دھم!!!

شب کا قافلہ دھیرے، دھیرے گزرتا رہا۔ بھیری ہوئی کوہستانی ہوا چیڑ کے اونچے، اونچے درختوں میں سسکیاں بھرتی رہی۔ بیمار چاند، بھوالی سناٹوریم کے پیچھے تپ دق کے مریض کی طرح پیلا، پیلا نظر آ رہا تھا اور نیازی فرش پر پڑا تھا۔

صبح بہت تڑکے دروازے پر دستک ہوئی۔ نیازی کو ایسا محسوس ہوا کہ شیو جی کا تانڈو ابھی تک بج رہا تھا۔ دھم! دھم!! مگر وہ شیو جی کا تانڈو نہیں تھا۔ اخبار کا ہاکر تھا جو دروازے کو زور، زور سے دھڑ، دھڑا رہا تھا۔ نیازی نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ فرش پر نیم برہنہ پڑا تھا۔ اس کا چہرہ قے کی غلاظت میں لتھڑا ہوا تھا۔

نیازی نے بڑے دُکھ کے ساتھ گہری سانس بھری اور دل گرفتہ ہو کر سوچنے لگا۔ اب وہ کیا کرے؟ زندگی نے آج تک قدم، قدم پر اس کو فریب دیا تھا۔ مگر یہ مُوت کو کیا سوجھی کہ وہ بھی جُل دے گئی۔

مصنّف کی دوسری تصانیف

کیمیاگر (افسانے) ۴۰ روپے

خدا کی بستی (ناول) ۶۰ روپے

زیرِ طبع

ناول

جانگلوس ——— حصّہ اوّل

چار دیواری ———

افسانے

اندھیرا اور اندھیرا ——— (نیا ایڈیشن)

راتوں کا شہر ——— (نیا ایڈیشن)

◎

تخریب کار ——— (تاریخ)

اظہارِ خیال ——— (مضامین)

رکتاب

پوسٹ بکس ۳۴۱۳ کراچی

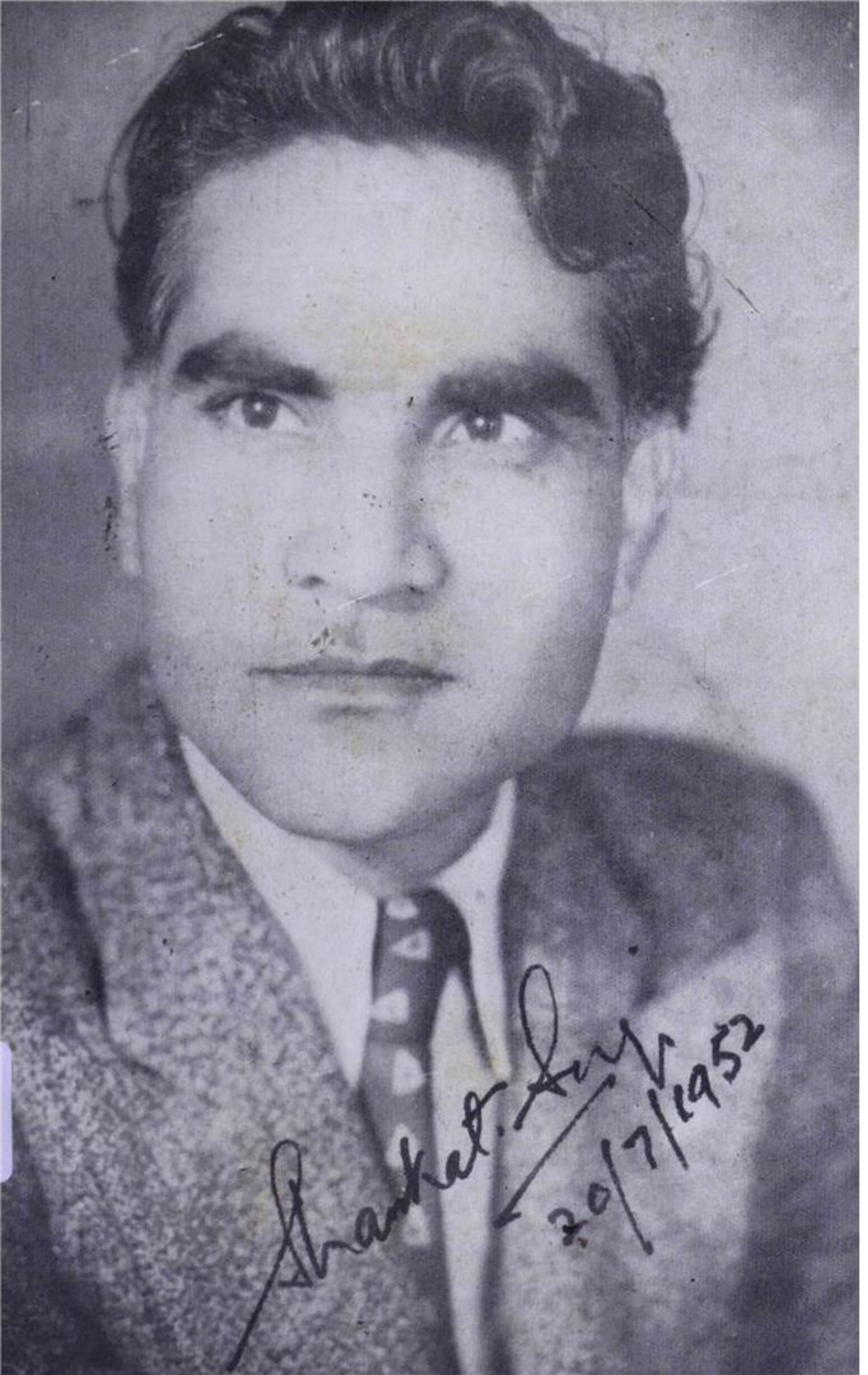

Shaukat.
20/7/1952